نرخنامہ اُجرت اشتہار

	ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۱۰۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۱۰ روپیہ
آدھ صفحہ	۵۰ "	۲۵ "	۱۳ "	۸ روپیہ
چوتھائی صفحہ	۲۵ "	۱۳ "	۷ "	۴ روپیہ

۱- اُجرت بہرحال پیشگی لی جائیگی۔ وی پی کے ذریعہ وصولی منظور نہیں

۲- جتنی مدت کے لئے اشتہار دیا جانا طے ہوا ہے اُس کی رقم پیشگی یکمشت لی جائے گی۔ ماہانہ ادائی کی صورت میں نرخ وہی ماہانہ رہیگا

۳- اشتہار فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کمیشن ذریعہ خط وکتابت طے ہوسکتا ہے

منیجر "نگار" لکھنؤ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر ...... پانچ روپیہ

ششماہی ہندوستان کے اندر ...... تین روپیہ

سالانہ بیرون ہند ...... بارہ شلنگ

ششماہی بیرون ہند ...... ۷ شلنگ

نوٹ:- رسالہ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوجاتا ہے ۲۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہوسکتا ہے ورنہ بعد کو آٹھ آنہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔

حصول جواب کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ خط وکتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے۔

"منیجر"

تصانیف نیاز فتحپوری

مجموعہ استفسار وجواب ۲ جلد

ان دونوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۲۹ء تک کے استفسار وجواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسائل شامل ہیں۔

قیمت:- جلد اول [illegible]

جلد دوم [illegible]

علاوہ محصول۔

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔

جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور ادبیت کے لحاظ سے فن انشا دیہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں [illegible] حضرت نیاز [illegible] کے [illegible] مجلد شایع ہوئی ہے

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے [illegible]

علاوہ محصول۔

جمالستان

اڈیٹر نگار کے [illegible] کا مجموعہ جس میں ۳۲ افسانے ۱۹۳۳ء تک کے درج ہیں

زبان کی قدرت، بیان کی [illegible] اور فکر و خیال کے بہترین شاہکار ہونے کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کو [illegible] اس مجموعہ میں [illegible] افسانہ [illegible] اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت چار روپیہ (للعہ)

علاوہ محصول۔

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فاحشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور اس کی تاریخ و نفسانی اہمیت پر [illegible]

[illegible]

قیمت [illegible]

علاوہ محصول

جلد (۳۰) | فہرست مضامین جولائی سنہ ۳۶ء | شمار (۱)

اڈیٹر :— نیاز فتحپوری

جلد (۳۰) | جولائی ۱۹۳۶ء | شمار (۱)

ملاحظات

وہ خلیج جو کبھی پُر نہیں ہو سکتی

(اردو ہندی نزاع)

آپ کسی قوم کا مطالعہ کیجیے، کسی نہ کسی خاص دور سے گزرتی ہوئی نظر آئے گی۔ میں نے ان ادوار کی چار تقسیمیں کی ہیں۔ ایک وہ دورِ فوز و فلاح جو اقوام مغرب کا حصہ ہو کر رہگیا ہے اور جس میں سوائے ولولہ و نشاط اقدام و ترقی، مسرت و شادمانی کے آپ کو کوئی مغموم پہلو نہیں مل سکتا۔ ایسی قومیں ہمیشہ رجائی و تفاؤلی زندگی بسر کرتی ہیں اور ان کی حیات عبارت ہوتی ہے صرف احساس حُسن سے۔ وہ زندہ ہیں صرف ہنسنے کے لئے خوش رہنے کے لئے، یہاں تک کہ جب کوئی فرد ان کا اُٹھ جاتا ہے تو بجائے رونے اور بسورنے کے خوش ہوتی ہیں کہ اس کی یادگار جمیل قایم کرنے کا موقعہ انھیں ہاتھ آگیا (یہاں جمیل کا تعلق صرف جمال ظاہر سے نہیں، بلکہ اس میں جمال فطرت و دماغ بھی شامل ہے)

اس کے بالکل برعکس انتہائی ذلت و نکبت کا وہ دور ہے جب انسان میں یہ احساس بھی باقی نہیں رہتا

کہ وہ واقعی انسان پیدا ہوا ہے اور حیوانات سے اپنے آپ کو صرف اس لئے ممتاز جانتا ہے کہ وہ چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتے ہیں اور یہ صرف دو پاؤں پر۔

ان دونوں ادوار کے درمیان دو دَور اور ہیں، ایک وہ جب انسان میں احساس پستی و انحطاط تو پیدا ہو جاتا ہے لیکن کوئی کیفیت اقدام و عمل کی نہیں پائی جاتی یعنی وہ ہاتھ سے کھوئی ہوئی چیز پر نوحہ و ماتم تو کرتا ہے لیکن اس کے حصول کی کوئی معقول کوشش نہیں کرتا، دوسرا دَور وہ جب وہ روتا بھی ہے اور ہاتھ پاؤں بھی چلاتا ہے۔ اسوقت میرا مقصود انھیں دونوں سے بحث کرنے کا ہے جن میں سے ایک مسلمانوں سے متعلق ہے اور دوسرا ہندوؤں سے۔

میرے لئے اس سے زیادہ تکلیف دہ امر اور کوئی نہیں کہ میں ہندوستان کے کسی اجتماعی مسئلہ پر گفتگو کروں اور اس سلسلہ میں مجھے ہندو مسلمان کی تفریق کا بھی ذکر کرنا پڑے، لیکن گزشتہ چند سال سے اندر ملک کے مذہبی احساس کی فضا ایسی گندہ ہوگئی ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کا سوال اب باقی ہی نہیں۔ یا اور یہ دونوں جماعتیں اپنی اپنی جگہ مجبور ہیں کہ وہ جو کچھ کریں مسالمت و رواداری سے قطع نظر صرف اپنے ہی نقطۂ نگاہ کو سامنے رکھ کر کریں۔ اور اس میں کلام نہیں کہ مذہب کا یہ وہ ظلم ہے جس کی نظیر چنگیز و ہلاکو کے افسانہائے خونخواری میں بھی نہیں ملسکتی، اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے تاریخ انسانی کا یہ اتنا دردناک سانحہ ہے کہ مذہب کے خوں آشام دیوتا کے علاوہ کوئی اور اسے برداشت بھی نہیں کرسکتا۔

بہرحال اب یہ بالکل کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہماری کوئی اجتماعی کوشش جو ہندو مسلمان دونوں کو کسی ایک مرکز پر لاسکے کامیاب نہیں ہوسکتی ہندو ہندو ہی رہنا چاہتا ہے اور اس احساس کے ساتھ کہ مسلمان سے زیادہ ناپاک و ملکش دنیا میں کوئی چیز نہیں اور مسلمان مسلمان ہی رہیگا اور اس ذہنیت کے ساتھ کہ ہندو سے زیادہ کافر و مردود ہستی کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی ہے دونوں کا اصل مذہب یہی ہے دونوں کا عین ایمان۔

اس میں شک نہیں کہ ایک قوم کا اپنے ذوق و تہذیب کو ترک کر دینا بہت دشوار ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایک ملک کے اندر جب دو قومیں دو مختلف کلچر کی پائی جائیں تو ان میں باہم قتل و خونریزی بھی ضرور ہو۔ لیکن جب مذہب ہی کو عین کلچر سمجھ لیا جائے اور مذہب ہی کو عمرانی تعلقات کی بنیاد قرار دے لیا جائے تو پھر مصالحت کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی اور خدا کی پیدا کی ہوئی اس خلیج کو کوئی انسانی ہاتھ پر نہیں کرسکتا۔

اس حقیقت کے سمجھنے کے بعد اب آئیے میرے ساتھ اس مسئلہ پر غور فرمائیے جو یوں تو مسائل سیاست سے کوئی تعلق رکھتا ہوا معلوم نہیں ہوتا لیکن اہمیت اس نے سیاسیات ہی کی سی اختیار کرلی ہے اور وہ مسئلۂ اردو ہندی کے اختلاف کا ہے۔

ہر تحریک کی طرح اس مسئلہ نے بھی بہت آہستہ آہستہ اہمیت حاصل کی ہے اور جس طرح ہر فتنہ کے آغاز میں اس کے سدّ باب کی طرف سے بے پروائی کی جاتی ہے اسی طرح اول اول اس مسئلہ میں بھی اختیار کی گئی، لیکن اب کہ اس چشمہ نے ایک سیلاب کی صورت اختیار کر لی ہے، سوال اس کے روکنے کا تو خیر کیا ہو سکتا ہے، ہماری سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ اب اس سے جانبر ہونا کیونکر ممکن ہے۔

جب سے ہندی اُردو کی نزاع شروع ہوئی اسی وقت سے باہمی مفاہمت کا خیال بھی لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا لیکن اس سلسلہ میں ہندو مسلمانوں دونوں کے طریق کار میں زمین و آسمان کا فرق رہا ہے غالباً یہ کہنا حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ ہندوؤں نے کبھی اپنے حقیقی مقصود کو ظاہر ہونے ہی نہیں دیا اور مسلمان نے جو تدبیریں اختیار کیں وہ سب جہل و لاعلمی کی حالت میں حریف کی چال کو سمجھے بغیر اختیار کیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو منزل سے قریب ہوتے گئے اور مسلمان بجائے آگے بڑھنے کے اور پیچھے ہٹنے لگے۔

ارباب نظر سے مخفی نہیں کہ اول اول جس وقت اُردو کے ساتھ ہندی رسم الخط کا رواج شروع ہوا تو کم از کم صوبہ متحدہ، پنجاب، بہار اور وسط ہند کے بالائی حصہ میں ہر پڑھا لکھا ہندو اُردو زبان بولتا تھا اور اُردو رسم الخط میں مراسلت کیا کرتا تھا۔ لیکن جونہی قومی تحریکات اور مذہبی عصبیت کے سلسلہ میں ہندی رسم خط کا سوال پیدا ہوا تو ہر چہار طرف سے یہ صدا بلند ہونے لگی کہ اُردو زبان میں چونکہ فارسی عربی کے ایسے ثقیل الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں جن کا سمجھنا ہندوؤں کے لئے دشوار ہے اس لئے ضرورت ہے کہ ہندی کو رائج کیا جائے جو اس ملک کے باشندوں کی صحیح زبان ہے مسلمانوں کی قوم جس نے سیاسی چالوں کے سمجھنے میں کبھی اپنی دانائی و فراست کا ثبوت پیش نہیں کیا، ہندوؤں کے اس بیان پر ایمان لے آئی اور صرف اس خیال سے کہ اُردو سے ہندوؤں کا تعلق باقی رہے، اس نے مصالحت و مفاہمت کی یہ صورت پیدا کرنا چاہی کہ اُردو زبان سے عربی فارسی کے الفاظ نکالکر اس کو زیادہ آسان بنایا جائے گویا ان کے نزدیک اصل نزاع صرف زبان سے متعلق تھی نہ کہ رسم الخط سے اور ہندو چاہتے بھی یہی تھے کہ مسلمان اُن کے حقیقی مقصود سے بیخبر رہکر اپنی تمامتر قوت ایک ضمنی مسئلہ پر صرف کرتے رہیں، چنانچہ مسلمانوں کی مختلف ادبی انجمنوں کی طرف سے یہ صدا بلند ہونے لگی کہ اُردو کو عربی فارسی الفاظ سے پاک کر کے زیادہ آسان و سہل الفہم بنانا چاہئے اور آج بھی جبکہ یہ حقیقت روز روشن کی طرح ظاہر ہو چکی ہے کہ ہندوؤں کا حقیقی مدعا کیا ہے یہ کوشش برابر جاری ہے ـــــ پھر اگر ہندوؤں کا مقصود واقعی یہی ہوتا کہ وہ اُردو زبان کو سہل و آسان دیکھنا چاہتے ہیں تو انھیں اس تحریک کا خیر مقدم کر کے کوئی عملی حصہ اس میں لینا چاہئے تھا، لیکن انھوں نے مطلق کوئی التفات اس طرف نہیں کیا اور آہستہ آہستہ انھوں نے اُردو رسم الخط کو ترک کر کے اس کی زبان و انشاء کو بھی بدلنا شروع کیا اور ٹھیک اسی وقت جبکہ مسلمان اُردو سے عربی فارسی الفاظ نکالنے کی کوشش میں مصروف تھے

ہندوؤں نے سنسکرت کے ثقیل الفاظ استعمال کرنے شروع کر دئے یہاں تک کہ وہی ہندو جو زبان کی سادگی کا دلدادہ تھا۔ لیکن اور، مگر ایسے، بلکے وکثیر الاستعمال الفاظ بھی بھول گیا اور ان کی جگہ اس کو "پرنتو" زیادہ سلیس و عام فہم نظر آنے لگا۔ ہندی کے میگزین جاری ہوئے، کتابیں تصنیف ہونے لگیں، سمیلنیں (انجمنیں) قائم ہوئیں، سبھائیں رچائی گئیں، یہاں تک کہ ہندی کالجوں کی بنیاد پڑی، جن میں سے ہر ایک کا مقصد ہندوستان کی قدیم مذہبی زبان سنسکرت کو رائج کرنا ہے۔ لیکن مسلمان احمق مسلمان ہنوز یہ آس لگائے ہوئے ہے کہ ممکن ہے وہ اُردو سے عربی فارسی کے الفاظ نکالکر ہندوؤں کو پھر اُردو کی طرف مایل کر سکے

میں اس سے قبل بھی بارہا اس باب میں اظہار خیال کر چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ ہندوؤں کو مخالفت اُردو زبان سے نہیں بلکہ اُردو رسم خط سے ہے چنانچہ اس کا سب سے بڑا ثبوت گاندھی جی کا وہ فقرہ ہے جو ناگپور کی بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے جلسہ میں ان کی زبان سے بے اختیارانہ نکل گیا یعنی یہ کہ:-

"اُردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے، قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا، مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں"[1]

یہ ہے وہ اصل ذہنیت جو ابتدا ہی سے ہندوؤں میں کام کر رہی تھی اور جس کا اعلان انھوں نے اسوقت تک صرف اس لئے نہ کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو قصداً دھوکے میں رکھنا چاہتے تھے اور اس کا اظہار کر کے وہ سیاسی مسایل میں پیچیدگی پیدا کرنا پسند نہ کرتے تھے، لیکن اب کہ ان دونوں کی سیاسی راہیں بالکل علحدہ قائم ہو چکی ہیں اور ان کے باہم ملکر کام کرنے کا سوال باقی نہیں رہا، کوئی وجہ نہ تھی کہ گاندھی جی کے دل کا کانٹا زبان پر نہ آتا۔ میں اسے کانٹا اس لئے کہتا ہوں کہ گاندھی جی ایسی شخصیت کے لئے اس سے زیادہ سخت لفظ استعمال کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا، ورنہ ذہنیت کی اس پستی و ذلت کا اظہار اور وہ بھی ایک ایسی ... دار ہستی کی طرف سے ہر ممکن لعنت و ملامت کا مستحق ہے — بہر حال اب یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ اصل نزاع زبان کی نہیں ہے، رسم خط کی ہے یعنی ہندوؤں کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ زبان کو عام فہم بنایا جائے کیونکہ وہ خود اس کے لئے طیار نہیں ہیں اور اسکے بالکل برعکس اُسے اور زیادہ مشکل بناتے جا رہے ہیں بلکہ اصل مدعا یہ ہے کہ وہ رسم خط اُن کی نگاہ کے سامنے نہ آئے جس میں قرآن لکھا جاتا ہے اور جو کسی وقت مسلم بادشاہوں نے رائج کیا تھا — پھر اب میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں نے اُردو سے عربی فارسی کے الفاظ بالکل نکال بھی دئے (جس کا کوئی امکان نہیں ہے) تو کیا وہ ہندوؤں کو اپنی طرف مایل کر سکیں گے اور کیا انکی یہ ذہنیت بدلی جا سکتی ہے کہ قرآنی حروف، کا مطالعہ ان کے دھرم کو بھرشٹ کر دینے والا؟

---

[1] ملاحظہ ہو اس ماہ کے نگار میں مولوی عبدالحق صاحب کا مقالہ صفحہ ۹

یقیناً اب راستہ بالکل صاف ہوگیا ہے اور ہم کو پھر از سر نو اس مسئلہ پر غور کرنا ہے کہ اُردو زبان کی بقا و اصلاح کے لئے ہم کو کیا طریق عمل اختیار کرنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں نگار کے مطالعہ کرنے والوں کو میں میاں بشیر احمد صاحب بی۔اے اور مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے کے ان مقالات کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں جن میں سے ایک جون کے رسالہ میں شایع ہوا ہے اور دوسرا اسی اشاعت میں۔ مجھے جس حد تک اتفاق یا اختلاف ہے اُسے یہاں ظاہر کئے دیتا ہوں۔

۱۔ کچھ دنوں سے میں دیکھ رہا ہوں کہ اُردو کی بجائے ہندوستانی کا لفظ استعمال کیا جارہا ہے اور مہاتما گاندھی اس میں ایک اور لفظ کا اضافہ کرکے ہندی ہندوستانی کہنا پسند کرتے ہیں۔ میں اسکے بالکل خلاف ہوں۔ مانا کہ کسی وقت اس زبان کا نام ہندوستانی تھا، لیکن اب کہ ہر شخص اُردو کے نام سے واقف ہوچکا ہے اور یہ لفظ سنکر ایک خاص زبان و انشاء کی طرف ذہن بہ آسانی منتقل ہوجاتا ہے کوئی وجہ نہیں کہ اس کو بدلا جائے ایک طرف تو یہ آسانی پیدا کرنے کا خیال ہے کہ جو الفاظ دوسری زبانوں کے بکثرت استعمال ہونے لگے ہیں انھیں کو جیوں کا تیوں لے لیا جائے اور دوسری طرف اصلاح کی یہ دقت پسندی کہ لفظ اُردو ہی کو اُڑا دیا جائے جسکے مسمّٰی کو ہندوستان کا ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے اور ایک زمانہ سے سمجھتا چلا آرہا ہے۔

یہ تحریک نتیجہ تھی صرف اس خیال کا کہ اُردو سے ہندوؤں کو جو تنفر پیدا ہوچلا ہے ممکن ہے وہ اس طرح دور ہوجائے اور ایک عام مشترک زبان پیدا کرنیکی جو آواز ہندوؤں کی طرف سے بلند ہوئی تھی اُسے وہ بے اثر سمجھکر اُردو سے بالکل اپنی بے تعلقی کا اظہار نہ کر بیٹھیں۔ حالانکہ (جیسا میں پہلے عرض کرچکا ہوں) ہندوؤں کا مقصد صرف اُردو رسم خط کے خلاف جہاد کرنا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ پہلے اس لفظ کو مٹایا جائے جو ایک مخصوص زبان کے مخصوص رسم خط پر دلالت کرتا ہے اور اس کے بعد رسم خط کو مٹانے کی کوشش کی جائے۔

پھر اب کہ ہندو عصبیت کی ایک منزل اور طے کرکے لفظ ہندوستانی بھی ہندی میں تبدیل کرنے پر مُصر ہے، اس باب میں مسلمانوں کی رواداری و مسالمت کوئی معنی نہیں رکھتی اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ اُردو کو ہندوستانی یا کسی اور نام سے موسوم کریں۔ کیونکہ اگر اب ہم اُردو کا نام سنسکرت رکھ لیں تو بھی ہندو اس کا دیکھنا یا پڑھنا گوارا نہ کریں گے اگر اس کا رسم خط وہی ہو جو "قرآنی حروف" کا ہے۔

۲۔ دوسری تحریک، یہ کی گئی کہ اُردو کو زیادہ سلیس و آسان بنایا جائے تاکہ ہر شخص اسے سمجھ سکے

اس تجویز کی پسندیدگی سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا لیکن اس سلسلہ میں جو سب سے زیادہ مضرت رساں اور انتہا پسندانہ قدم اٹھایا گیا وہ یہ تھا کہ اُردو سے عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کے ترک کرنے پر زور دیا گیا۔ یہ سمجھنا کہ عربی و فارسی الفاظ کے نکال دینے سے اُردو آسان و سلیس ہوجائے گی، خیال خام ہے۔ کیونکہ اُردو

زبان میں سوائے مصادر اور حروف صلہ و روابط کے جتنا حصہ الفاظ کا موجود ہے ان میں سے اکثر عربی و فارسی ہیں اور اگر آج ہم انکو علحدہ کردیں تو کسی طرح اپنے مفہوم کے اظہار پر قادر نہیں ہوسکتے سوائے اس صورت کے کہ ہم سنسکرت، انگریزی یا کسی اور زبان سے الفاظ کا استعارہ کریں۔ میں اس حد تک بالکل متفق ہوں کہ ادائے مفہوم کے لئے جب تک ہمیں سادہ و آسان الفاظ عام بول چال کے ملسکتے ہیں، عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں لیکن اسکی پابندی ہم روز کی گفتگو اور قصے کہانیوں میں تو کرسکتے ہیں، مگر جسوقت سوال علمی مضامین یا دقیق مطالب کا آئیگا اسوقت ہمارے لئے چارہ کار سوائے اس کے کچھ نہ ہوگا کہ غیر زبانوں سے مدد لیں، اور جب ہم کو غیر زبانوں ہی سے مدد لینا ہے تو کیوں نہ عربی فارسی سے مدد لیں جس سے مسلمانوں کو بہت دیرینہ تعلق حاصل ہے۔ ایک "زبان" ہمیشہ اسی وقت مکمل کہی جاسکتی ہے جب وہ دقیق سے دقیق خیالات کو جامعیت کے ساتھ ادا کرنے پر قادر ہو۔ زبان نام صرف "ہوا گرم ہے اور روٹی نرم ہے" کا نہیں ہے بلکہ وہ ذریعہ ہے ان جذبات و کیفیات کے اظہار کا جو ارتقاء ذہن کے انتہائی نازک و لطیف احساس سے پیدا ہوتے ہیں اور ان نتائج کے پیش کرنے کا جو علوم و فنون کے تمام مدارج تکمیل سے تعلق رکھتے ہیں اور اسکے لئے عربی فارسی الفاظ و ترکیب کا استعمال ناگزیر ہے۔ دوسری خصوصیت ایک مکمل زبان کی یہ بھی ہے کہ وہ طویل سے طویل مطالب کو بہت مختصر الفاظ میں ادا کرسکے ۔۔ میاں بشیر احمد بی۔ اے اپنے مضمون میں (صفحہ ۱۸ - نگار ماہ جون ۱۹۳۶ء) میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:-

"عربی اور فارسی کی غیر ضروری ترکیبیں ترک کردینی چاہییں اور اگر ادائے مفہوم کیلئے فقرہ ذرا لمبا ہوجائے تو کیا ہرج ہے"

حرج تو کوئی نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آیا اُس لمبے فقرے سے وہ مفہوم بھی ادا ہوسکتا ہے یا نہیں جو عربی فارسی کے ایک مختصر لفظ سے پورا ہوجاتا ہے۔ یقیناً بعض جگہ معمولی خیالات کے اظہار میں ہم ایک سادہ لمبے فقرے سے کام لے سکتے ہیں، لیکن بلند خیالات کے اظہار میں اکثر جگہ عربی فارسی ترکیبوں کا استعمال ناگزیر ہوجاتا ہے۔ پھر جبکہ عربی و فارسی سے بیگانہ ہوکر ہم نہ اپنی زبان میں انشاء عالیہ پیدا کرسکتے ہیں اور نہ علوم و فنون اس میں منتقل کرسکتے ہیں تو پھر گھریلو اور بازاری زبان کی حمایت میں ایسا درس دینا جو لوگوں کو عربی و فارسی سے بیگانہ بنا دینے والا ہے ایک نادان کی دوستی سے کم خطرناک نہیں۔

زبان نام نہ بیوی سے باتیں کرنے کا ہے اور نہ ہوٹلوں میں جاکر بیرا خانساماں سے توس مکھن مانگنے کا۔ اسی طرح نہ اسکا مقصود صرف چڑے چڑیا کی کہانی بیان کرنا ہے نہ چار درویش کا قصہ لکھنا۔ زبان ہمیشہ خیالات و جذبات کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ انسان سوچے آسمان کی اور کہے زمین کی۔ خیال جتنا نازک و بلند ہوگا زبان میں بھی اتنی ہی نزاکت و بلندی کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ پھر اسی کے ساتھ موقعہ و محل کو بھی دیکھئے کہ وہی ایک لفظ ہے جو کسی جگہ خوشنما معلوم ہوتا ہے اور کسی جگہ بدنما اس لئے یہ فیصلہ کردینا کہ دو مترادف الفاظ میں سے (جن میں سے ایک آسان ہے اور دوسرا دقیق) ہمیشہ سہل لفظ کا استعمال موزوں ہوگا درست نہیں ہوسکتا۔۔ بہرحال عربی و فارسی الفاظ کے ترک کردینے کی تجویز سے مجھے سخت اختلاف ہے کیونکہ اول تو اس کا امکان ہی نہیں ہے اور وہ لوگ بھی جو اس تحریک کے محرک ہیں خود سیکڑوں الفاظ عربی و فارسی کے

اپنی تحریر و تقریر میں استعمال کرنے پر مجبور نہیں[1] اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیں کہ انتہائی جد و جہد کے بعد یہ ممکن ہو تو زبان کو اس سے سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے کیونکہ ہزاروں الفاظ اردو میں عربی فارسی کے ایسے رائج ہیں جن کا بدل کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اردو زبان اور زبان کے ساتھ ہی مسلمانوں کے تعلقات عربی و فارسی الفاظ سے اتنے دیرینہ ایسے گہرے ہیں کہ ان کو نظرانداز کر دینا گویا "اسلامی کلچر" کی خصوصیات کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا ہے۔ انسانی تمدن و تہذیب میں سب سے زیادہ اہم چیز صرف زبان ہے جو ایک قوم کے کلچر سے بنتی ہے اور اس کے کلچر کو بناتی ہے یعنی تمدن و زبان دونوں باہم گر اس طرح وابستہ ہیں کہ آپ ایک کو دوسرے سے علحدہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے اس کوشش کا نتیجہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا اور نہ یہ معلوم کر سکا کہ بصورت کامیابی جو اثر اس کا مسلمانوں کی مخصوص تہذیب پر پڑے گا وہ کیونکر گوارا ہوگا۔

میں اس حد تک بالکل موافق ہوں کہ اگر حسنِ انشار کو تباہ کئے بغیر کوئی مفہوم خالص دیسی الفاظ سے ادا ہو سکتا ہے تو ضرور اس کا لحاظ رکھا جائے لیکن عربی و فارسی کا علم میں ہر مسلمان کے لئے ضروری جانتا ہوں کیونکہ اس کے بغیر ادب عالیہ و علوم و فنون کی پیداوار ممکن نہیں — رہی مولانا سلیم مرحوم اور ہمارے عزیز دوست پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی یہ تجویز کہ زبان کو وسیع بنانے کے لئے جدید الفاظ کا وضع کرنا اور دوسری زبانوں کے رائج الفاظ کو بجنسہ لے لینا ضروری ہے سو میں کیا ہر شخص خواہ اردو زبان کا اس کی موافقت کریگا، لیکن میں یہ ماننے کے لئے طیار نہیں کہ علوم و فنون کی اصطلاحیں بغیر عربی و فارسی کی مدد کے طیار ہو سکتی ہیں — میاں بشیر احمد صاحب اور مولوی عبدالحق صاحب نے اصلاح و ترقی زبان کے متعلق بعض ان تدابیر بھی بتائی ہیں جو قارئین نگار پڑھ چکے ہوں گے۔ ان کے متعلق کوئی بسیط گفتگو کرنا تحصیلِ حاصل سمجھتا ہوں کیونکہ اول تو ان تدابیر کی صحت سے کسی کو انکار ہو ہی نہیں سکتا دوسرے اسلئے کہ میں جانتا ہوں مسلمان کبھی اس طرف متوجہ نہ ہوں گے اور قیامت تک وہ مرکزیت کے اصول پر کام کرنے کے لئے طیار نہ ہوں گے۔ جیسا کہ میں تمہید میں عرض کر چکا ہوں، مسلمان اس دور سے گزر رہے ہیں جب ایک قوم اپنے ماضی کو یاد کر کر کے صرف روتے رہنا ہی پسند کرتی ہے اور مستقبل کی طرف قدم بڑھانے کی ہمت اپنے میں نہیں پاتی۔ اور اسکا سب سے بڑا ثبوت اسی زبان کے مسئلہ میں یہ ہے کہ مسلمانوں کی زبان سے جب کوئی بات اس سلسلہ میں نکلتی ہے تو اس کی ابتدا ہندوؤں کی شکایت سے ہوتی ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اسوقت تک اردو نے جو ترقی کی وہ ہندوؤں کی بدولت تھی اور آیندہ بھی انھیں کی مدد سے [illegible] ہو سکتا ہے۔

جس قوم کی ذہنیت اس حد تک پست ہو جائے اور تنگ دلی کا یہ عالم ہو کہ گاندھی جی کے بیٹے کے مسلمان ہو جانے پر پھولی نہ سمائے، اسکی طرف سے کم از کم میں تو کوئی توقع قائم نہیں کر سکتا ممکن ہے میاں بشیر احمد صاحب یا دوسرے حضرات کے سامنے کوئی صورت کامیابی کی ہو۔ اس سے قبل بہتیری قومیں دنیا میں آئیں اور تباہ ہوئیں، پس اگر مسلمانوں کا بھی یہی حشر ہونے والا ہے تو اس میں حیرت کی کونسی بات ہے بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ وہ دنیا کو خود ہی قید خانہ قرار دیتا ہے اور آخرت میں اپنی ہر دنیاوی ناکامی پر سو سو حوریں حاصل کرنے کا دعویدار بنا بیٹھا ہے

[1] چنانچہ خود میاں بشیر احمد صاحب نے اپنے مقالہ میں سیکڑوں الفاظ عربی و فارسی کے ایسے لکھے ہیں جن کو وہ اگر چاہتے تو ہر فقرہ کو "لمبا" کر کے نکال سکتے تھے، لیکن ان کا ذوقِ سلیم اسے ہرگز گوارا نہ کر سکا۔

بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی اصل حقیقت

بہت سے اصحاب اس جملے کے معنے نہیں سمجھیں گے اور اس عنوان کو پڑھ کر انھیں اُلجھن ہوگی۔ اسلئے سب سے اول یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس کے معنے ہیں "ہندوستان بھر کی ادبیات کی انجمن"۔ اس کا پہلا اجلاس ۲۴ اور ۲۵ اپریل کو ناگپور میں ہوا۔ مہاتما گاندھی اس کے صدر تھے۔ انھیں تاریخوں میں "ہندو ساہتیہ سمیلن" کے اجلاس بھی مختلف اوقات میں وہیں ہوئے۔ اس کے صدر بابو راجندر پرشاد تھے اس سے قبل کہ میں پرشد کے اس اجلاس کے حالات بیان کروں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس کی "شان نزول" سے مختصر طور پر بحث کروں یعنے یہ کہ یہ انجمن کن وجوہ سے وجود میں آئی اس کا اصل مقصد کیا ہے۔ جب تک یہ نہ کیا جائے گا اس کی پوری حقیقت سمجھ میں نہ آئے گی۔

مسٹر کاکا کالیلکر اس اجلاس کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ انھوں نے اپنے ایڈریس میں بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی پیدائش کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، میں اسی کا خلاصہ یہاں لکھتا ہوں کیونکہ ان کا بیان زیادہ مستند سمجھا جائے گا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ۱۹۱۹ء میں مہاراشٹ ساہتیا سمیلن منعقدہ بڑودہ میں سب سے پہلے یہ خیال پیدا ہوا۔ اس کے بعد کولھاپور کے اجلاس میں مہاراجہ بڑودہ نے بھارت ساہتیا پرشد کا خاکہ بہت پرزور طریقے پر پیش کیا۔ پھر کراچی میں کانگرس کے موقع پر مسٹر کنہیا لال منشی سے پہلے جو میری بات چیت ہوئی تو اس میں بھی ہم نے ایک ایسی سوسائٹی کی ضرورت کو محسوس کیا۔ پچھلے سال جب اندور میں ہندی ساہتیا سمیلن کا اجلاس مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہوا اور ہم ایک جا جمع ہوئے تو ایک مفصل تجویز اس کے متعلق منظور کی گئی، جسے عمل میں لانے کیلئے مسٹر کنہیا لال منشی، سری ہرتر شرما اور گرودھا شرما کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ ہندی ساہتیا سمیلن کے چند مہینے کے بعد مہاراشٹ ساہتیا سمیلن کا اجلاس بھی اندور میں ہوا۔ اس نے بھی کولھاپور کے تخیل کو عمل میں لانے کے لئے ہندی ساہتیا سمیلن سے تبادلۂ خیالات کیا۔ ہندی ساہتیا سمیلن نے کاکا کالیلکر سری کبھاڈ اپادھیا۔ دادریا پا اگھودا کو اندور بھیجا۔ اندور مہاراشٹ ساہتیا سمیلن نے اپنی ساہتیا پرشد کو اطلاع دی کہ بھارتیہ ساہتیا پرشد کے لئے ایک مہاراشٹ کمیٹی قایم کی جائے جو ہندی ساہتیا سمیلن کو بھارتیہ ساہتیا سمیلن قایم کرنے میں مدد دے۔ اسی طرح

کرناٹک اور گجرات کی ساہتیا سمیلنوں نے بھی اس تحریک کو سراہا۔

یہ تو ہے اس کی پیدائش اور ابتدا کی حقیقت۔ اب رہا اس کا مقصد سو وہ اس قرارداد سے ظاہر ہے جو ناگپور کے اجلاس میں منظور کی گئی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اس پرشد کا اودیش (مقصد) ہوگا کہ (الف) ہندوستان کے سب پرانتوں کی بھاشاؤں کے ساہتیوں (ادبوں) اور ساہتکاروں (ادیبوں) میں آپس میں میل کرنا اور اس نام سے بھارتیہ ساہتیوں کی ترقی اور پھیلاؤ میں مددگار ہونا۔

(ب) اس سبھا کا کام ہندی یعنی ہندستانی میں ہوگا ...."

اس کمیٹی نے جو اس انجمن کے مقاصد کی تکمیل کے لئے مقرر کی گئی تھی پہلا کام یہ کیا کہ ماہنامہ "ہنس" کو جو کئی سال سے ملک کے قابل ادیب منشی پریم چند صاحب کی اڈیٹری میں جاری تھا اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور اب اسے پرشد کا رسالہ بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اور منشی پریم چند صاحب کے ساتھ گجراتی زبان کے ادیب اور مورخ مسٹر کنہیالال منشی بھی اس کی اڈیٹری میں شریک ہوگئے ہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد جو بھارتیہ ساہتیا پرشد کی پیدائش اور مقاصد سے متعلق تھی، میں آپ کو اس کے پہلے اجلاس کی روداد سنانا چاہتا ہوں جو ہم سب کے لئے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

۲۴ اپریل ۱۹۳۶ء کو تقریباً ۱ بجے دن کے اس کا پہلا جلسہ شروع ہوا۔ سب سے اول مسٹر کاکا کالیلکر نے اپنا اڈریس پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد صدر انجمن مہاتما گاندھی کا مطبوعہ اڈریس جو صرف ایک صفحہ کا تھا تقسیم کر دیا گیا اور مہاتما جی نے یہ کہہ کر کہ مطبوعہ اڈریس پڑھ کر سنانا فضول ہے وہ آپ خود پڑھ لیں گے، زبانی تقریر شروع کر دی۔ یہ ایسی آہستہ آواز میں تھی کہ ہم دور والے اس کو اچھی طرح نہ سن سکے۔

پرشد کے اس جلسہ کا سب سے بڑا کارنامہ وہ رزولیوشن تھا جسے میں اوپر نقل کر چکا ہوں۔ زیادہ تر بحث اسی پر رہی۔ اس کے پہلے جزو سے کسی کو اختلاف نہ تھا۔ البتہ دوسرے جزو پر بہت کچھ گفتگو رہی۔ اصل مسودے میں یہ الفاظ تھے "اس (پرشد) (انجمن) کی ساری کارروائی "ہندی، ہندستانی" میں ہوگی۔ یہ لفظ پہلی بار یہاں سننے میں آیا۔ غالباً یہ مہاتما گاندھی کے جدت پسند دماغ کا نتیجہ تھا۔ میں نے مہاتما جی سے کہا کہ انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے ریزولیوشن میں یہ طے کیا تھا کہ اس ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی خواہ وہ ناگری حروف میں ہو یا فارسی حروف میں۔ اس کے بعد آپ نے ہنس کے متعلق جو تحریر شایع کی اس میں آپ لکھتے ہیں کہ اس رسالے کے مضامین کی زبان ہندی اتھوا (یا) ہندوستانی ہوگی جس کا اس کے کیا معنی قرار دئے گئے کہ کانگریس کا رزولیوشن بھی میں نے "ہندی" بنایا تھا۔ میں نے عرض کیا یہ صحیح ہے لیکن اس وقت ہندوستانی کے معنی ہم ہندی نہیں سمجھتے تھے۔ کہنے لگے کہ اب میں نے اس کے معنی بتا دئے ہیں جو ہنس کی تحریر میں آپ نے دیکھے۔ یہ گاندھی جی کی محض زبردستی ہے۔ یہ انھوں نے

ایک نیا لفظ ایجاد کیا ہے یعنی "ہندی ہندوستانی" جو بالکل بے معنی ہے۔ یہی لفظ پریشد کی مجلس استقبالیہ کے صدر کاکا کالیلکر صاحب نے اپنے اڈریس میں استعمال کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان صاحبوں نے پہلے سے یہ طے کرلیا تھا کہ ہندوستانی کا لفظ تنہا استعمال نہ کیا جائے تاکہ اس کی گنجائش ہی باقی نہ رہے کہ ہم میں سے کوئی شخص اس کا مفہوم "اردو" لے سکے۔ جب گاندھی جی سے سوال کیا گیا کہ "ہندی ہندوستانی" سے آپ کا کیا مطلب ہے تو فرمایا وہ ہندی جو آگے چلکر ہندوستانی ہونے والی ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا یہ تو کوئی زبان نہ ہوئی، یہ تو آپ کی خواہش یا منتہا ہے۔ اس سوال کے جواب میں کہ ہندی کونسی زبان ہے اور ہندوستانی کونسی، مہاتما جی نے فرمایا کہ ہندی ادبی زبان ہے اور عام لوگ کم سمجھتے ہیں اور ہندوستانی وہ زبان ہے جو عام لوگ بول چال میں استعمال کرتے ہیں لیکن ابھی اس کا ادب نہیں بنا۔ اپنے مطبوعہ اڈریس میں انھوں نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ ہندی کو ہندوستانی کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس سے بتانا ہے کہ ان فارسی الفاظ کو جو زبان میں رائج ہوگئے ہیں ترک نہ کیا جائے۔ غرض صبح کا جلسہ اسی پر ختم ہوگیا اور کوئی بات طے نہ ہوئی۔

سہ پہر کے جلسے میں پھر یہی بحث چھڑ گئی۔ جب مہاتما جی سے یہ کہا گیا کہ رزولیوشن میں یا تو آپ ہندی کا لفظ رکھئے یا ہندوستانی کا۔ ہندی ہندوستانی کے کوئی معنے نہیں۔ تو فرمایا کہ ہم تو فیصلہ کرچکے ہیں اور میں ہندی کو نہیں چھوڑ سکتا، مجھے ہندی سمیلن کے ساتھ ساتھ چلنا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نیشنل کانگریس کے فیصلے کے ساتھ ساتھ کیوں نہیں چلتے جس نے قطعی فیصلہ کردیا ہے کہ ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ میں نے دانستہ دوبارہ یہ بات اسلئے کہی تھی کہ صبح کی گفتگو کے وقت پنڈت جواہر لال نہرو موجود نہ تھے، اس وقت وہ میرے قریب تشریف رکھتے تھے اور خیال تھا کہ وہ بحیثیت صدر کانگریس کے ضرور میری تائید کریں گے لیکن مجھے افسوس اور کسی قدر مایوسی ہوئی کہ انھوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور خاموش بیٹھے رہے۔ اور ایک نہیں وہاں کوئی تین کانگریس کے صدر موجود تھے (دو سابق اور ایک حال) مگر کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ گاندھی جی نے میرے سوال کے جواب میں وہی کہا جو صبح فرما چکے تھے۔ اس کے بعد جب یہ گفتگو بڑھی تو گاندھی جی نے "ہندی ہندوستانی" کو بدل کر "ہندی یعنی ہندوستانی" کے الفاظ رکھدئے۔ اس پر اختر حسین صاحب رائے پوری نے یہ ترمیم پیش کی کہ رزولیوشن میں یا تو لفظ ہندی رکھا جائے یا ہندوستانی۔ کیونکہ مہاتما جی خود ہندی اور ہندوستانی کے دو الگ الگ مفہوم بتا چکے ہیں، اس بنا پر ہندی اور ہندوستانی ایک زبان نہیں ہوسکتیں اور اس لئے ہندی یعنی ہندوستانی بے معنی ہوگا اور دونوں میں سے کوئی ایک لفظ رکھنا مناسب ہوگا۔ میں نے یہاں تک کہا کہ آپ صرف ہندی رکھئے اور میں اس کی تائید کردوں گا۔ اس پر وہ ہنسنے لگے اور کہا یہ نہیں ہوسکتا۔ آخر مہاتما جی نے ووٹ پر آمادگی ظاہر کی۔ مسٹر کنہیا لال منشی نے کہا کہ یہ معاملہ ادبی اور لسانی ہے ووٹ سے طے نہیں ہونا چاہئے۔ مہاتما جی نے کہا کہ ووٹ کے سوا

کوئی چارہ نہیں، فیصلے کی یہی ایک تدبیر ہے۔ ووٹ کا حکم صادر ہوا۔ لیکن ووٹ لینے سے پہلے بڑی ہوشیاری یہ کی گئی کہ ہندی سمیلن کے ان نمایندوں کو بھی ووٹ کا حق دیدیا گیا جو اسوقت اس جلسے میں حاضر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کثرت رائے اس ترمیم کے خلاف نکلی۔ اگر ہندی سمیلن کے نمایندوں کو ووٹ کی اجازت نہ دیجاتی جس کا انھیں حق حاصل نہ تھا تو ترمیم غالباً منظور کرنی پڑتی۔ مگر مہاتما گاندھی بھارتیہ ساہتیہ پرشد کو ہندی سمیلن کا بچہ سمجھتے ہیں اور ان کے تصور میں یہ دو مجلسیں کبھی الگ نہیں ہونے پاتیں، حالانکہ بقول منشی پریم چند کے یہ خیال صحیح نہیں ہے پہلے دن کی کارروائی یہیں ختم ہوگئی۔

اصل معاملہ تو پہلے ہی دن طے ہو چکا تھا دوسرے دن ۲۵ر اپریل کو ایک معمولی جلسہ ہوا۔ پہلے دن سہپر کو ایک گفتگو یہ بھی چھڑ گئی تھی کہ ہمیں اپنی زبانوں کے ادب کا رُخ بدلنا چاہئے۔ بار بار پرانے فرسودہ خیالی مضامین کو دہرانا موجودہ حالات کے بالکل منافی ہے۔ ہمیں اپنے ادب کو زندہ اور زندگی کے حالات کے مطابق بنانا چاہئے۔ اس بحث میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی حصہ لیا اور یہ ارادہ ہوا کہ دوسرے روز ایک رزولیوشن اس مضمون کا پیش کیا جائے۔ کنہیا لال منشی اور دو ایک اور صاحب اس خیال کی مخالفت کرتے رہے۔ پرشد کے مہا پرشوں نے اس خوف سے کہ کہیں جدید خیال والے کوئی سخت رزولیوشن پیش نہ کردیں، رات ہی کو اس مضمون کا ایک ہلکا سا رزولیوشن تیار کیا اور دوسرے روز اجلاس شروع ہوتے ہی پہلے اسے پڑھ کر سنایا جو بلا اختلاف منظور کرلیا گیا۔ لیکن یہ ریزولیوشن بہت کچھ تصریح کا محتاج تھا اس لئے ان صاحبوں نے جو دلیسی ادبیات کی اصلاح پر مصر تھے، ایک الگ بیان شایع کیا۔ اس کے بعد انتظامی کمیٹی کے ارکان کا انتخاب ہوا۔ اس میں سے چند تو ہندی ساہتیہ سمیلن نے اپنے حق کی بنا پر اپنے نمایندے انتخاب کئے اور کچھ مہاراشٹ ساہتیہ سمیلن نے اور چند متفرق اشخاص منتخب ہوئے۔ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے پہلے اجلاس کی کارروائی ختم ہوئی۔

اب اس کارروائی پر میں مختصر سا تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے یہ دیکھ لیا کہ ہندوستانی کو ہندی میں اور ہندی کے معنے ہندوستانی بنانے میں، پھر "ہندی ہندوستانی" کی جدید لفظ کے اختراع میں اور آخر میں ہندی یعنی ہندوستانی کے الفاظ میں کیسے کیسے پہلو بدلے ہیں۔ پہلے اُردو کا لفظ ترک کرکے ہندوستانی اختیار کیا گیا تھا یہاں تک کچھ مضایقہ نہ تھا اور اس پر ہم بھی رضامند تھے اور ہمارے بعض مستند ادیبوں اور اہل الرائے اصحاب نے یہ لفظ لکھنا شروع کردیا تھا بلکہ ان کا اصرار تھا کہ اُردو کی بجائے اب ہندوستانی لکھا جائے اور اس پر ایک حد تک عمل بھی ہونے لگا تھا۔ فریقین نے یہ سمجھوتا تسلیم کرلیا تھا۔ اب ہندوستانی کا لفظ بھی متروکات میں داخل ہوگیا اور صرف ہندی رہ گیا۔ معترض کے لئے ان کے پاس جواب موجود ہے، وہی جو گاندھی جی نے فرمایا "ہندی یعنی ہندوستانی"۔ گاندھی جی نے رسالہ ہنس کی زبان کو بھی ہندی اتھوا ہندوستانی فرمایا ہے۔ جب ان سے کہا گیا

کہ ہنس کی زبان بہت کٹھن ہے وہ ہندوستانی نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی زبان کلکتہ کے مشہور رسالہ وشال بھارت سے بھی زیادہ مشکل ہے تو انھیں حیرت ہوئی۔ ہنس کے اڈیٹروں نے تو صاف صاف لکھ دیا ہے کہ "اب ہندی ملکی زبان کی صورت اختیار کرکے خاص وعام کی زبان ہو چکی ہے۔ مہاتما گاندھی جیسے ملک کے سدھارنے والے اسے زندہ ملکی زبان بنانے کا عہد کر چکے ہیں۔ اس کی تائید بابو راجندر پرشاد کے اس خطبۂ صدارت سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے ہندی ساہتیا سمیلن میں پڑھا تھا۔ اس میں انھوں نے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "خوشی کی بات ہے کہ اس کمیٹی کی کوشش سے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی بنیاد ڈالی جا رہی اور اس کا پہلا اجلاس اس ناگپور میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہو رہا ہے۔ اس کے ذریعہ سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ ہندی کے پرچار کے متعلق لوگوں میں جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے وہ بھی دور ہو جائے گی اور ہمیں امید ہے کہ اس سے ہندی پرچار میں مدد ملے گی"۔ کاکا کالیلکر صاحب نے بھی اپنے اڈریس میں صاف طور پر اس کا اعلان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے اس تحریک (بھارتیہ ساہتیہ پرشد) کی ابتدا کی ہے انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہمارا سارا کاروبار راشٹر بھاشا (قومی زبان) ہندی ہندوستانی میں چلے گا۔ ہماری کوشش ہے کہ تمام ہندوستان کی بھاشاؤں کی ابجد ایک ہی ہو اور سب میں ناگری لپی (رسم خط) جاری ہو جائے تاکہ وہ اپنے اپنے صوبے کی زبان کا کام ناگری میں کریں"

یہ الفاظ ایسے صاف اور صریح ہیں کہ ان کے لئے کسی دلیل وحجت کی ضرورت نہیں۔ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا یہ مقصد بے شک قابل تعریف ہے کہ وہ دیسی زبانوں کے ادبیات کی اصلاح وترقی چاہتی ہے، لیکن اس کا دوسرا مقصد بلاشبہ ہندی زبان کا پرچار ہے جس میں وہ اور ہندی سمیلن دونوں متفق ہیں۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ پرشد کے اجلاس کی تاریخیں اور مقام بدل کر انھیں ایام اور اسی مقام میں رکھا گیا جن تاریخوں میں اور جہاں ہندی سمیلن کا اجلاس تجویز ہوا تھا تاکہ ہندی سمیلن کے اثر اور امداد سے مستفید ہو سکے۔ غرض یہ کہ پرشد ادبیات کے مسئلے سے گزر کر زبان کی اشاعت پر آگئی ہے اور مختلف زبانوں کے ادب اور ادیبوں کے اتحادِ عمل سے ہندی کے پرچار کا مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔

اس ضمن میں میں اس امر کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں کہ منشی پریم چند صاحب شروع سے آخر تک ہمارے ساتھ رہے اور وہ اس تمام گفتگو اور بحث سے بد دل ہی نہیں تھے بلکہ برہم بھی ہوئے۔ اُن کی دلی تمنا تھی کہ ہندی اُردو کے جھگڑے کو مٹا کر کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے جو دونوں فریقوں میں مقبول ہو سکے۔ لیکن جو کارروائی وہاں ہوئی اس سے وہ بھی ایسے ہی مایوس ہوئے جیسے ہم میں سے بعض لوگ۔

اسی گفتگو میں بنگال، مہاراشٹر اور جنوبی ہند کے بعض علاقوں کے نمایندوں نے یہ کہا اور غالباً اُن کا یہ کہنا ایک حد تک درست ہے) کہ ہندی میں سنسکرت الفاظ کا قائم رکھنا یا داخل کرنا ضروری ہے کیونکہ ان سنسکرت لفظوں کا

سمجھنا ہمارے لئے زیادہ آسان ہے بہ نسبت اُن ہندی اور فارسی لفظوں کے جو آپ کی سہل ہندی میں استعمال ہوتے ہیں اس لئے کہ ہماری زبانوں میں پہلے ہی سے سنسکرت الفاظ بکثرت موجود ہیں۔ ان زبانوں کی بنیاد زیادہ تر سنسکرت پر ہے۔ اس خیال کی تائید کاکا کالیلکر کے ایڈریس سے بھی ہوتی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ "میں اہل دکن کی طرف سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ ہم کو آپ کی (یعنے شمالی ہند کی) ہندی سمجھنے میں مشکل پڑتی ہے۔ پنڈت جواہر لال کی ہندی آپ کے لئے عام فہم ہوگی مگر ہمارے لئے کٹھن ہے..... وہ ہندی بھی جو دلی لکھنؤ کے بازاروں میں گنوار لوگ سمجھ سکتے ہیں وہ نیچرل ہندی ہے لیکن اُسے بھی ہم بہت ہی کم سمجھتے ہیں..... کانگریس میں جو ہندی بولی جاتی ہے اس میں فارسی شبدوں کی اس قدر بھرمار ہوتی ہے کہ دیہات سے آنے والے نمایندوں کے لئے انگریزی اور ہندی دونوں بھاشائیں یکساں مشکل ہو جاتی ہیں"۔

اسی دوران میں لغت کی بحث نکلی یعنے ایک ایسی ڈکشنری تیار کی جائے جس میں عام فہم الفاظ کے علاوہ وہ تمام الفاظ جمع کئے جائیں جو ہندی بنگالی گجراتی مرہٹی وغیرہ میں مشترک ہیں اور ان تمام الفاظ کی تعداد دو ڈھائی ہزار سے زیادہ نہ ہو۔ اس میں دو مشکلیں ہیں ایک تو یہ کہ ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کی صورتیں مختلف زبانوں میں بگڑ بگڑا کر ایسی ہو گئی ہیں کہ ایک لفظ سننے پر بھی اُن کا پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ دوسرے لفظ تو ایک ہی ہے لیکن مرہٹی میں اس کے معنے کچھ ہیں اور ہندی یا بنگالی میں کچھ اور۔ علاوہ اس کے ایسی ڈکشنری اُن ہندیوں کے لئے تو کسی قدر کارآمد ہو سکتی ہے جو زبان سیکھنا چاہتے ہیں لیکن ادب کی ضروریات کے لئے بالکل کارآمد نہیں ہو سکتی۔ میں نے ۱۹۳۳ء میں آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس میں جس کا اجلاس بڑودہ میں ہوا تھا، یہ تجویز پیش کی تھی اور اسپر عمل بھی شروع کر دیا تھا کہ تمام ہندی ادب اور زبان کو پڑھ کر اردو فارسی عربی الفاظ اور محاورے چن لئے جائیں اور اسی طرح اردو ادب اور زبان کا مطالعہ کر کے تمام ہندی الفاظ اور محاورے نکال لئے جائیں اور اُن سب کو ایک جگہ جمع کر کے کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے تاکہ معلوم ہو کہ ہماری زبان کا مشترک سرمایہ کیا ہے۔ اس کے بعد جن الفاظ کے اضافے کی ضرورت ہو یا جو اصطلاحات بنانی مقصود ہوں تو وہ ایک ایسی کمیٹی کے مشورے سے ہو جس میں دونوں زبانوں کے نمایندے ہوں۔ لیکن موجودہ حالات دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی تمام کوششیں بے سود ہیں۔

میں ایک بات کہنی بھول گیا وہ یہ کہ پہلے دن کے اجلاس میں پروفیسر محمد مجیب (جامعہ ملیہ دہلی) کا ایک خط انگریزی زبان میں مہاتما جی کے نام وصول ہوا۔ یہ خط نہایت معقول اور مدلل ہے اور بہت ادب اور خلوص سے مہاتما جی سے یہ اپیل کی گئی ہے کہ وہ نیشنل کانگریس کے فیصلے پر قائم رہیں جس نے ملک کی زبان "ہندوستانی" قرار دی ہے انھوں نے مہاتما جی کی اندور والی تقریر نیز "ہرجن" والی تحریر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جن میں ہندی یا ہندوستانی

کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور ہندی کے معنے ہندوستانی قرار دیے ہیں جو درست نہیں۔ اُردو یا ہندوستانی سے بالکل قطع نظر کی گئی ہے۔ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے قایم ہونے اور ہنس کے جاری ہونے سے ان کو بہت خوشی ہوئی تھی کہ یہ مشترکہ اور عام زبان کے بنانے میں مضبوط بنیاد کا کام دیں گے لیکن ہنس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اس میں زیادہ تر سنسکرت آمیز ہندی کا استعمال کیا گیا ہے اور اس کی زبان دوسرے ہندی رسالوں کی زبان سے مشکل ہو۔ مجیب صاحب ساہتیہ پرشد کے ساتھ "بھارت" کے لفظ کو بھی پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ اس لفظ کا مفہوم آریائی ہندوستان ہوتا ہے اور اس لئے اس سے نہ صرف مسلمان، اور اُن کی تمام کوششیں جو ہندی زندگی بنانے میں صرف ہوئیں بلکہ صدہا سال کے تغیرات اور ارتقائی منازل جو ہم نے طے کئے ہیں وہ بھی خارج ہو جاتے ہیں۔ اُن کی رائے میں بھارت کی بجائے ہندوستانی کا لفظ زیادہ مناسب ہوتا۔ مجیب صاحب نے ایک بات اور بھی لکھی ہے جو صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ عربی اور سنسکرت میں اصطلاحی الفاظ کا بہت بڑا خزانہ ہے لیکن ہماری عام اور مشترکہ زبان کو ان میں سے کسی پر بھی منحصر نہیں کرنا چاہئے۔ عربی اگر غیر زبان ہے تو سنسکرت بھی اس ملک میں کبھی عام طور پر نہیں بولی جاتی تھی۔ جو لوگ ہندی زبان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندی میں سنسکرت کے الفاظ اصلی حالت میں نہیں پائے جاتے۔ تلفظ کی سہولت نے اُن کی صورتوں کو کچھ کا کچھ کر دیا ہے مثلاً گرام کا گانو ہو گیا، ورش کا برس بن گیا۔ اب پھر اصل سنسکرت الفاظ کی طرف رجوع کرنا اور مروجہ الفاظ کو ترک کرنا یا تو اظہار مشیخت ہے یا جہل یا تعصب پر مبنی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حضرات اُس زندہ زبان کی اشاعت سے کچھ سروکار نہیں رکھتے جو عام طور پر بولی جاتی ہے بلکہ انھیں ہندی زندگی کو آریائی بنانے کی فکر ہے۔ مجیب صاحب نے اُس خط کا بھی ذکر کیا ہے جو مسٹر کنہیا لال منشی نے عاقل صاحب (جامعہ ملیہ) کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔ اس میں مسٹر منشی لکھتے ہیں کہ گجراتیوں، مرہٹوں، بنگالیوں اور کرنائیوں نے جن روایات پر اپنی ادبی زبان کو بنایا ہے اُن میں اُردو کا عنصر تقریباً معدوم ہے۔ مجیب صاحب اسے تسلیم نہیں کرتے وہ لکھتے ہیں کہ اس میں مطلق شبہ نہیں کہ گجراتی، مرہٹی اور بنگالی زبانوں میں فارسی الفاظ کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ اور "میں ہرگز اس امر کے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ انھیں آپس میں ایک دوسرے سے نیز مسلمانوں سے قریب آنے کے لئے اپنی زبانوں کو سنسکرت آمیز بنانے کی ضرورت ہے۔ علاوہ اس کے صرف خالص اُردو عنصر سے ہمیں بحث نہیں بلکہ ہماری بحث شمالی ہند کی زندہ زبان اور محاورات سے ہے۔ اگر یہ زندہ زبان مشترکہ زبان کی بنیاد قرار دی جائے تو مسلمان پوری طرح اس کا ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہیں۔ لیکن سنسکرت کی طرف رجعت کرنے کے یہ معنے ہیں کہ وہ (مسلمان) اور انکی تمام خدمات جو انھوں نے ہندی، بنگالی اور گجراتی کے حق میں کی ہیں، ناقابل لحاظ ہیں۔ ان حالات میں ہم سے شرکت کی درخواست کرنا گویا ہماری ہلاکت میں خود ہماری شرکت کی استدعا کرنا ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن کی اس تقریر کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے الہ آباد میں ہندی میوزیم کے افتتاح کے وقت فرمائی تھی اور جس میں انھوں نے یہ کہا تھا کہ چینی زبان کے بعد ہندی زبان ایشیا میں سب سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ اسکے معنے یہ ہوئے کہ عام اور مشترکہ زبان کا سوال طے ہو گیا۔ یعنے وہ زبان ہندی ہوگی۔ کیونکہ ہندوستان میں اسی زبان کے بولنے والے سب سے زیادہ تعداد میں ہیں۔ لہذا ہندوستانی کے حامی کسی گنتی میں نہیں۔ یہ "فرقہ وارانہ تصفیہ" کی طرح ایک نئے فساد کی بنیاد ڈالی جارہی ہے۔

خط کے آخر میں پروفیسر مجیب نے چند امور خاص طور پر مہاتما جی کے غور کے لئے پیش کئے ہیں اور اُن سے التجا کی ہے کہ اگر وہ مناسب خیال فرمائیں تو وہ عام اعلان کی بنیاد کا کام دے سکتے ہیں وہ اُمور یہ ہیں:۔

۱۔ ہماری مشترکہ زبان ہندوستانی کے نام سے موسوم ہوگی نہ کہ ہندی کے نام سے۔

۲۔ ہندوستانی کو کسی فرقے کے مذہبی روایات سے متعلق کوئی تعلق نہ ہوگا۔

۳۔ لفظ کا معیار اُس کا رواج ہوگا نہ کہ اس کا دیسی یا بدیسی ہونا۔

۴۔ تمام وہ الفاظ جو اُردو کے ہندو اہل قلم نے اور ہندی کے مسلمان مصنفوں نے استعمال کئے ہیں مروجہ الفاظ تسلیم کئے جائیں۔

۵۔ اصطلاحی الفاظ خاصکر سیاسی اصطلاحات کے انتخاب میں سنسکرت کی اصطلاحات کو ترجیح نہ دیجائے بلکہ اُردو، ہندی اور سنسکرت کی مصطلحات کے فطری انتخاب کی بھی گنجایش رکھی جائے۔

۶۔ دیوناگری اور عربی رسم خط دونوں مسلم خیال کئے جائیں اور ان تمام اداروں میں جن کی پالیسی ہندوستانی کے حامیوں کے ہاتھ میں ہو، دونوں خطوں کے سکھانے کی سہولت بہم پہونچائی جائے۔

میں نے خط کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔ پورا خط پنڈت جواہر لال نہرو صاحب نے پڑھ کر سُنایا۔ اس پر کوئی توجہ نہیں کی گئی اور خط داخل دفتر ہو گیا۔ البتہ پنڈت جواہر لال صاحب نے یہ فرمایا کہ تعجب ہے کہ مجیب صاحب جیسے تعلیم یافتہ شخص کو ٹنڈن صاحب کے بیان پر اعتراض ہے، ان کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا۔ ان کا کیا مطلب تھا یہ سمجھ میں نہ آیا۔ جس خلوص اور اُمید اور لجاجت کے ساتھ یہ خط مہاتما جی کی خدمت میں لکھا گیا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ مہاتما جی اس بارے میں اپنا کوئی خیال ظاہر فرماتے اور جو بدگمانی اُن کے اور ان کے رفقا کے رویہ سے پیدا ہو گئی ہے اسے رفع کرتے۔ لیکن افسوس انھوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے ہندی کے پرچار اور اسے قومی زبان بنانے کا تہیہ کر لیا ہے۔

اجلاس کے دوران میں جبکہ زبان کی بحث چھڑی ہوئی تھی مہاتما گاندھی نے ایک ایسی بات کہی جسے سنکر مجھے بے حد تعجب اور افسوس ہوا۔ انھوں نے فرمایا کہ اُردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے، قرآن کے حروف

میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔ حیرت ہے کہ جس شخص کی صحبت میں مدتوں مولانا محمد علی مرحوم، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سید محمود جیسے لوگ رہے ہوں وہ اپنی زبان سے ایسی بات نکالے جو سرتاسر غلط، بے بنیاد اور بے اصل ہے۔ میں ہرچند یہ توجیہ کرکے اپنی تسلی کرنا چاہتا ہوں کہ مہاتما جی نے یہ بات ناواقفیت کی بنا پر کہی ہے لیکن دل نہیں مانتا۔

مہاتما جی اپنی تقریر میں ہندی اُردو یا ہندوستانی کی بحث میں بار بار ہندو اور مسلمان کے لفظ استعمال کرتے تھے۔ میں نے ایک آدھ بار ٹوکا کہ یہ ہندو مسلم سوال نہیں ہے بلکہ بحث ہندی اُردو یا ہندوستانی کی ہے۔ ہزارہا ہندو ایسے ہیں جن کی زبان اُردو ہے وہ اُردو کے ادیب ہیں، اسی طرح ہزاروں مسلمان ہیں جو ہندی بولتے اور لکھتے ہیں۔ اس لئے اس بحث کو فرقہ واری رنگ نہیں دینا چاہئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی کا دماغ اور خیال اغلاط پذیر ہو رہا ہے۔ اسی ضمن میں میں نے گاندھی جی سے یہ بھی عرض کیا کہ مہاتما جی سے یہ بھی عرض کیا کہ مہاتما جی آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اُردو زبان میں ہندی کے الفاظ اور محاورے جس کثرت سے ہیں خود ہندی زبان میں اس قدر نہیں۔ یہ سن کر گاندھی جی اور دوسرے صاحبوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں نے اس پر خوب غور کیا ہے اور میں اپنے اس دعوے کو ثابت کر سکتا ہوں۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ یہ کیونکر ہوا۔ میں نے کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو زبان کی بنیاد عوام کی زبان پر ہے جو اُس وقت بولی جاتی تھی اور اس لئے اس میں وہ تمام ہندی لفظ اور محاورے آگئے جو عام لوگوں کی زبان پر تھے۔ ہندی زبان کتابی ہے۔ عوام کی بولی سے اسے بہت کم سابقہ رہا ہے، اسے جب کسی لفظ کی ضرورت ہوتی ہے تو سنسکرت کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے اُردو ہندی کی نسبت زیادہ ہندی ہے۔

ایک دن وہ تھا کہ مہاتما گاندھی نے ہندوستانی یعنے اُردو زبان اور فارسی حروف میں اپنے دست خاص سے حکیم اجمل خاں کو خط لکھا تھا اور آج یہ وقت آگیا ہے کہ اُردو تو اُردو وہ تنہا ہندوستانی کا لفظ بھی سننا اور لکھنا پسند نہیں کرتے۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں جو برسر اجلاس تھی، ایک بار نہیں کئی بار فرمایا کہ اگر رزولیوشن میں تنہا ہندوستانی کا لفظ رکھا گیا تو اس کا مطلب اُردو سمجھا جائے گا۔ لیکن اُن کو نیشنل کانگریس کے رزولیوشن میں تنہا ہندوستانی کا لفظ رکھتے ہوئے یہ خیال نہ آیا۔

آخر اس قلب ماہیت Change of heart کی کیا وجہ ہے؟ کون سے ایسے نئے اسباب رونما ہوئے ہیں جو اس حیرت انگیز انقلاب کا باعث ہوئے؟ غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس تمام تغیر، جدل، توڑ جوڑ اور داؤں پیچ کا باعث ہمارے ملک کا بدنصیب پالیٹکس ہے۔ جب تک مہاتما گاندھی اور ان کے رفقا کو یہ توقع تھی کہ مسلمانوں سے کوئی سیاسی سمجھوتا ہو جائے گا اُس وقت تک وہ ہندوستانی ہندوستانی پکارتے رہے جو ٹھیک کر

سلا ... نے لئے اچھی خاصی دوری تھی۔ لیکن جب انھیں اس کی توقع نہ رہی یا انھوں نے ایسے سمجھوتے کی ضرورت نہ سمجھی تو ریاکاری کا چادر اتار پھینکی اور اصلی رنگ میں نظر آنے لگے۔ وہ شوق سے ہندی کا پرچار کریں۔ وہ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم بھی اُردو نہیں چھوڑ سکتے ان کو اگر اپنے وسیع ذرائع اور وسایل پر گھمنڈ ہے تو ہم بھی کچھ ایسے ہیٹے نہیں۔

ایسی صورت میں ہمارے لئے اس کے سوا اب کوئی چارہ باقی نہیں کہ ہم اپنی زبان کے بچانے اور اس کی اشاعت و ترقی کے لئے کمر بستہ ہو جائیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ اس کے متعلق ہم ایک مفصل تجویز عنقریب پیش کرنے والے ہیں۔

عبدالحق
آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو

تاریخ مذہب کا ایک خونیں ورق

شارلکان یا کارلوس پنجم، ہسپانیہ کا بادشاہ اپنی مملکت کی غیر معمولی وسعت پر بہت نازاں تھا اور اس کا یہ کہنا غلط نہ تھا کہ "میری سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا" لیکن اسے اپنی زندگی میں، جو غیر معمولی کارناموں سے پُر نظر آتی تھی، بہت زیادہ مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ اپنی ساری عمر میں ایک رات بھی آرام سے نہ سو سکا، اس کی زندگی کروٹ ہی بدلتے بدلتے ختم ہوگئی، وہ اپنے وسیع ملک کی حفاظت کرتے کرتے اُکتا گیا۔ یہاں تک کہ آخر کار فرمانروائی اس کے لئے وبال جان ہوگئی اور وہ نہایت خوشی کے ساتھ حکومت سے دست بردار ہوگیا۔ وہ اب سکون اور اطمینان کا طالب تھا اور یہ جنس بازار سلطنت میں بالکل عنقا ہے، چنانچہ جس وقت اُس نے حکومت سے دستبرداری اختیار کی تو گرجاؤں میں اس کے لئے دعائیں مانگی گئیں کہ خدا اس کے گناہوں کو معاف کرے ـــ یہ ۱۵۵۵ء کا واقعہ ہے۔

شارلکان نے بڑے بڑے معرکوں میں شرکت کی تھی، بارہا خود دست بدست دشمنوں سے لڑا تھا۔ وہ فرنسس اول شاہ فرانس، سلطان سلیمان قانونی فرمانروائے حکومت عثمانی اور ان کے علاوہ دوسرے بادشاہوں سے بھی نبرد آزما ہوا تھا اور اس نے ان تمام جنگوں میں اپنے کو نہایت شجاع اور غیر معمولی بردبار، مدبر اور جری ثابت کر دکھایا تھا، اسے کنیسۂ کیتھولک کے مخالفین سے بھی سخت جنگ کرنی پڑی تھی یہاں تک اسنے ان تمام لوگوں کو، جنھوں نے پاپائے روم اور اس کی تعلیمات کی مخالفت کی تھی شہر بدر کر دیا۔

محکمۂ تفتیش جسے شارلکان نے قائم کیا تھا تاریخ کنیسہ میں نہایت بدنما داغ شمار کیا جاتا ہے اور داغ اس بادشاہ کے نام اور اس کے ملک سے کسی طرح نہیں مٹایا جا سکتا۔

شارلکان کا حکومت سے علحدہ ہونے کے تین سال بعد ۱۸۵۸ء میں انتقال ہوگیا اور اس کے تخت و تاج کا مالک اس کا لڑکا فلپ دوم قرار پایا، فلپ، انصرام حکومت میں اپنے باپ سے کسی طرح کم نہ تھا اور اس نے بھی اپنے باپ کے اتباع میں مخالفین کنیسہ کے اخراج و قتل کو برابر جاری رکھا۔

ان دونوں متعصب اور ظالم بادشاہوں کے دور حکومت میں ہسپانیہ سخت دردناک حوادث کا م

تھا اور اس زمانہ میں ایسے ایسے واقعات رونما ہوئے، جنھیں سننے کے بعد شقی سے شقی انسان بھی بغیر آنسو بہائے نہیں رہ سکتا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب "لوتھر" جرمنی میں اصلاح مذہب عیسوی کی طرف متوجہ تھا اور قدیم عقاید سے پھیر کر لوگوں کو اپنے جدید مذہب کی طرف دعوت دے رہا تھا۔ اول اول تو حکومت نے کوئی خاص توجہ اس طرف نہیں کی، لیکن جب لوگ جوق در جوق اس مسلک میں شامل ہونے لگے تو قدامت پرست اہل ردما اس خطرناک تحریک سے چیخ اُٹھے اور انھوں نے یکزبان ہوکر "لوتھر" اور اس کے تبعین کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرکے یورپ کے مسیحی بادشاہوں سے امداد کی درخواست کی۔

شارلکان نے فوراً اس دعوت کو قبول کرلیا اور ہر ممکن طریقہ سے اس کے استیصال پر آمادہ ہوگیا چنانچہ شارلکان کے محکمۂ تفتیش نے ہر طرف جاسوس پھیلا دئے اور متہمین کو جلاوطنی اور آگ میں ڈالنے کی سزا دی جانے لگی، یہاں تک کہ ہسپانیہ کے ہر گلی کوچہ سے دردناک صدائیں بلند ہونے لگیں۔

ڈاکٹر "کازالا" جو ہسپانیہ کے دارالسلطنت مڈرید میں قصر شاہی کے بالکل قریب رہتا تھا اور وہاں کے کنیسہ کا کاہن تھا، "لوتھر" کا مسلک اختیار کرنے کے لئے روانہ ہوا اور جب وہاں سے واپس آیا تو پوشیدہ طور پر اس جدید مذہب کی تبلیغ شروع کی، ڈاکٹر کازالا کا خیال تھا کہ "لوتھر" جو کچھ کہہ رہا ہے بالکل حق ہے، اور اس کے مخالفین صریح غلطی پر ہیں۔

ڈاکٹر مذکور نے واپسی کے بعد "بلد الولید" میں اقامت اختیار کی، کیونکہ وہاں اس کی ایک اچھی خاصی جماعت قائم ہوچکی تھی، اس نے اس کا نام "لوتھریا" رکھا۔

اسی اثنا میں شارلکان کا انتقال ہوگیا، تخت پر اس کا لڑکا فلپ ثانی بیٹھا، اس نے مخالفین کنیسہ کی نگرانی کی طرف اور زیادہ توجہ کی اور آخرکار اس کے جاسوس اس جگہ کے معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئے جہاں ڈاکٹر کازالا اپنے تبعین کے ساتھ مجتمع ہوا کرتا تھا۔ ایک رات کو فوج نے اس مکان کا اچانک محاصرہ کرلیا اور جتنے آدمی گرفتار کرکے محکمۂ تفتیش کے حوالے کر دئے گئے۔

ڈاکٹر کازالا مع اپنی بہن اور بھائی کے بھاگا، مگر فوج برابر پیچھا کرتی رہی۔ اور جامعۂ قرطبہ تک پہونچی جہاں ڈاکٹر کازالا نے اس خیال سے پناہ لی تھی کہ شاید یہاں تک حکومت کے افراد نہیں پہونچ سکتے ڈاکٹر کے بھائی بہن قصر حمرا میں جان بچانے کی غرض سے چھپے ہوئے تھے، لیکن فوج ان کی تلاش میں بالآخر کامیاب ہوئی اور انھیں بھی گرفتار کرکے محکمۂ تفتیش کے سپرد کر دیا، محکمۂ تفتیش نے ان کے متعلق دو دن تک غور و خوض کے بعد

اپنا فیصلہ صادر کردیا۔۔۔۔۔

اگر اسوقت بھی کوئی سیاح ہسپانیہ کے دارالسلطنت میڈریڈ میں جائے اور وہاں کے کتب خانہ میں اس زمانہ کی مطبوعہ اور قلمی تاریخ کا مطالعہ کرے تو اس کے اندر ایک مجلد قلمی وثیقہ اس کو نظر آئے گا، جس پر لکھا ہوگا کہ "۱۲ مئی ۱۵۵۹ء کو کفار کی ایک جماعت "بلد الولید" میں جلائی گئی"

اس کی تفصیل یوں ہے:-

صبح کے وقت تقریباً ۸ بجے ولی عہد "دون کارلوس" جس کی عمر اسوقت ۱۴ سال سے زیادہ نہ تھی مع اپنی بہن "جونا" کے وہاں گیا، عظمائے سلطنت، کینساؤں کے پوپ اور محکمۂ تفتیش کے صدر جسے سرا غرسانی میں بہت زیادہ شہرت حاصل تھی ولی عہد کے ساتھ تھا، "جونا" کے جلو میں نہایت خوبصورت لباس زیب تن کئے ہوئے بہت سی سہیلیاں بھی وہاں موجود تھیں، ولی عہد اور جونا دونوں وہاں جاکر ایک جگہ بیٹھ گئے اور گرفتار شدہ لوگ لائے گئے پوپ "ملکیور کانا" نے اپنا خطبہ شروع کیا، لیکن ہنگامہ کچھ اس قدر تھا، کہ ایک لفظ بھی سننے میں نہ آسکا، اس کے بعد دوسرا پوپ آگے بڑھا، ہنگامہ بالکل فرو ہوگیا، ہر چہار جانب سکوت چھا گیا۔ اس نے ہاتھ میں چاندی کی صلیب لیکر اپنی گرجتی ہوئی آواز سے کہا کہ:- امیر اور امیرۃ کو خدا کے سامنے قسم کھانی ہوگی کہ وہ محکمۂ تفتیش کی طرف سے ہمیشہ مدافعت کریں گے" اس پر امیر اور امیرۃ نے بیک زبان آمین کہی اور وعدہ کیا کہ وہ پوپ کے مطالبہ کو ہمیشہ منظور کریں گے۔ اس کے بعد جج "فرجارا" آیا اور اس نے ملزمین کے متعلق اپنا فیصلہ صادر کیا، سب سے پہلے ڈاکٹر "کازالا" کا خادم لایا گیا۔ اس کے بعد کازللا کا بھائی پھر اس کی بہن اور دوسرے تیس آدمی۔ ان میں سے سولہ کو حبس دوام کی سزا دی گئی اور چودہ کو آگ میں ڈالے جانے کی لیکن قبل اس کے کہ ان کو آگ میں ڈالا جاتا، فوج کو حکم دیا گیا کہ ان سب کا گلا گھونٹ دیں جن کے قتل کا حکم دیا گیا تھا ان میں ایک چودہ برس کی معصوم لڑکی بھی تھی جس کا نام "کاتیانادی" تھا اس نے جلاد سے نہایت عاجزی کے ساتھ کہا کہ اسے دیر تک تکلیف میں مبتلا نہ رکھا جائے، مگر افسوس کہ اس نے یہ تمنا ایسے شقی کے سامنے پیش کی تھی جو کبھی اسے پورا نہ کرسکتا تھا۔ کیونکہ تمام مجرمین میں اسی کو سب سے زیادہ تکلیف دیکر قتل کیا گیا، آخر میں اسی فرقہ کے سردار ڈاکٹر کازالا کو لایا گیا۔ چونکہ شہنشاہ شارلکان، اس سے بہت محبت رکھتا تھا اور اس کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا اسلئے ڈاکٹر کو زندگی کے آخری لمحہ تک قوی امید تھی کہ فیلیپ ثانی اسے معاف کردیگا، مگر اسکی یہ تمنا پوری نہ ہوسکی۔ اسے بھی دیگر رفقاء کی طرح گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا، اس کے بعد مشتعل آگ کے حوالے کردیا گیا۔ جنھیں زندہ جلانے کا حکم دیا گیا تھا وہ جب آگ میں پہونچنے کے بعد چیختے تھے تو سپاہی انھیں نیزوں سے مارکر خاموش کردیتے تھے۔ محکمۂ تفتیش کی اس درندگی کی آتش شہوت جب ڈاکٹر کازالا کے جلانے کے بعد بھی کم نہ ہوئی تو اس کی ماں کی قبر کھدوا کر اس کی سڑی گلی ہڈیاں نکلوائیں اور ڈاکٹر کی نعش کے ساتھ ان کو بھی آگ میں ڈالدیا۔

ملک محمد جائسی کی پدماوت

محمد تخلص - ملک محمد نام - سولہویں صدی عیسوی میں بھاشا کے مشہور شاعر تھے - کم سنی میں والدین کا سایہ سر سے اُٹھا - فقیروں کی صحبت میں عبادت و ریاضت، سیر و سیاحت کا شوق ہوا پنڈتوں سے درس لیا - جوگیوں سے فیض پایا - مخدوم سید اشرف جہانگیر کچھوچھوی کے مرید ہوئے اور اودھ کے مردم خیز قصبہ جائس میں سکونت اختیار کی

جائس نگر دھرم استھانوں تہاں جائے کب کینہ بکھانوں

قدرت نے حُسنِ ظاہر سے محروم کیا تھا - سات سال کی عمر میں چیچک سے ایک آنکھ جاتی رہی تھی - لیکن قلب کی صفائی - رموزِ طریقت سے شناسائی - اسرارِ معرفت سے آشنائی کی بدولت مرجعِ خاص و عام تھے - خود لکھتے ہیں کہ :- "سید اشرف کا چراغِ محبت دل میں روشن ہوا اور اس قدر صفائی حاصل ہوئی کہ ظاہر و باطن سوجھنے لگا - میری ایک آنکھ آئینہ کی طرح روشن تھی - تمام دنیا کے حسین دیدار کی خواہش رکھتے تھے اور قدمبوسی کو حاضر ہوتے تھے"

علاوہ عیب یک چشمی کے بدقیافہ بھی تھے - بدنما بدشکل تھے - جب تپ کے شدائد نے صورت بد سے بدتر کر دی تھی اور چیچک سے داغدار چہرہ ایسا بدنما ہو گیا تھا کہ دیکھنے والوں کو بے اختیار ہنسی آتی تھی - خود تسلیم کرتے ہیں کہ :-

محمد کب جو پریم کے نا رتن رکہت نا ماس
جیں مکھ دیکھا سو ہنسا سنی تیہ آئی آنس

یعنی ملک محمد جو عشق و محبت کے شاعر ہیں اُن کے بدن پر نہ گوشت ہے اور نہ جسم میں خون - جو صورت دیکھتا ہے وہ ہنستا ہے مگر جو بات سنتا ہے وہ رو دیتا ہے -

نوعمری سے شاعری کی دھوم تھی اور ہندوستان کے ہر گوشے میں اُن کے دوہے اور بارہ ماسے خلائق کی زبان پر تھے - لیکن جس شاہکار نے اُن کو حیاتِ جاوید عطا کی وہ اُن کی بے مثل تصنیف "پدماوت" ہے جو ہندی لٹریچر میں اپنی نظیر نہیں رکھتی

یہ لاجواب نظم جس میں [illegible] کی طویل مدت میں مکمل ہوئی سلطان ابراہیم لودی کے عہد سلطنت میں ۹۲۷ھ[1] سے

---

[1] سن نو سے ستائیس آہے کتھا ارمبھ بین کب کہے (پدماوت)

اس کا آغاز ہوا۔ اور شیر شاہ سوری کے دور میں تمام ہوئی جو ۹۴۷ھ سے ۹۵۲ھ تک تختِ ہمایوں پر متصرف رہا تھا۔

شیر شاہ دہلی سلطانوں چاروں کھنڈ تپی جس بھانوں

پدماوت کی تکمیل کے وقت بوڑھے ہو چکے تھے۔ مثنوی کے خاتمہ پر لکھتے ہیں "اے ملک محمد تو بوڑھا ہوا اور جوانی تیری مفت خراب ہوئی قوت کے جانے سے تیرا بدن نحیف و لاغر ہوا اور نگاہ آنسو بنکر آنکھوں سے بہ گئی۔ دانتوں کے جانے سے رخسار بے رونق ہوئے۔ آواز درست نہیں نکلتی ہے۔ عقل کے زایل ہونے سے لوگ دیوانہ کہتے ہیں۔ سر نیچے لٹکا رہتا ہے۔ کانوں سے سُنائی نہیں دیتا ہے اور بال مثل روئی کے ہو گئے ہیں" لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کے اختتام کے بعد بھی مدت تک زندہ رہے کیونکہ ان کی ایک تصنیف "راگنی سوراٹ" ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانہ میں محفوظ ہے جو ۹۶۶ھ یعنی عہد اکبر کی تالیف سمجھی جاتی ہے۔

مثنوی کی زبان شیریں اور فصیح بھاشا ہے۔ فارسی الفاظ کی آمیزش بہت کم ہے۔ جذبات محبت و اردات عشق کی متحرک تصویروں سے مزین اور نازک تشبیہوں، لطیف استعاروں سے مرصع ہے۔ مثلاً یہ بیان کرنا ہے کہ مالک بعض دور افتادہ بندوں سے نزدیک ہے اور نزدیکوں سے دور ہے اس کے ثبوت میں لکھتے ہیں۔

"کانٹا ہر وقت پھول کی صحبت میں رہتا ہے لیکن گل کی بو باس اس میں کچھ اثر نہیں کرتی کیونکہ وہ ٹوٹ کر نہیں ملتا البتہ چیونٹی مٹھائی کی خوشبو پاتے ہی دوڑ کر پہنچتی ہے اور سیراب ہو جاتی ہے۔ بھونرا پھول سے دور رہتا ہے مگر کنول کے کھلتے ہی پہونچ جاتا ہے لیکن مینڈک باغ میں موجود ہے اور خوشبو سے محروم ہے"۔

یا کوئل کی فراقِ یار میں خونفشانی اس طرح بیان کرتے ہیں:

"کوئل کوکو کرکے روتی ہے اور اس کے آنسوؤں سے جنگل میں گھونگچی پیدا ہوتی ہے۔ یہ بن باسی جس جس جگہ روتی ہے وہاں گھونگچیوں کا ڈھیر لگ جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خونیں آنسوؤں کا قطرہ قطرہ "پیا پیا" پکار رہا ہے۔ اس درد و مصیبت کو دیکھ کر ٹیسو کے پتے گر جاتے ہیں اور کوئل کے اشکوں سے سیراب ہو کر اس میں لال لال پھول نکلتے ہیں"۔

اُس زمانہ میں توپوں کا نیا نیا رواج ہوا تھا۔ شاعر کا تخیل دیکھئے:

وہ بجائے شراب کے بارود پیے ہوئے اپنے چرخ پر مست پڑی رہتی ہیں لیکن دشمن کے تاراج کیلئے فوراً اُٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ اگر ان کو کوئی ہلانا چاہے تو سارے زمانے کے زور سے نہ ہلیں مگر جس وقت انہیں زبان کھلتی ہیں تو زمین کانپنے لگتی ہے۔ جس مقام پر وہ قدم رکھتی ہیں نشیب و فراز جنگل اور پہاڑ سب برابر ہو جاتے ہیں

وہ معشوق کی طرح بناؤ سنگھار کئے مست رہتی ہیں مگر جس وقت سانس چھوڑتی ہیں تو آگ لگ جاتی ہے اور اُن کا دُھواں آسمان تک پہونچتا ہے - اُن کی پیشانی پر سیندور مثل آگ کے روشن ہے - پہئیے چرخ کے زیر پا چمکتے ہیں - پھریرا مثل آنچل کے جھٹکا ہوا ہے - زنجیریں مثل زلف کے گلے میں پڑی ہیں اور جب ہاتھی پکڑ پکڑ کر کھینچتے ہیں تو کندھے ٹوٹ جاتے ہیں "

سنگلدیپ کے راجہ گندھرپ سین کی لڑکی پدماوت حسن وجمال میں لاجواب تھی ایک بولتا ہوا طوطا اُس کا ہم سبق اور ہم نشیں تھا - راج کماری سیر گلشن کو گئی - طوطے کے پنجرے پر بلی نے حملہ کیا - طوطا جان بچا کر بھاگا اور جنگل میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ رہنے لگا - وہاں ایک صیاد کے دام میں اسیر ہوا - آب و دانہ کی کشش ہندوستان لے گئی اور راجہ رتن سین والی چتور کی سرکار میں فروخت ہوا -

ایک دن راجہ شکار کو گیا تھا - رانی ناگ متی بناؤ سنگھار کرکے آئینہ میں اپنا جمال دیکھ رہی تھی طوطے سے پوچھنے لگی کہ دنیا میں کوئی حسین اُس سے بڑھکر بھی دیکھا ہے - طوطا پہلے خاموش رہا مگر رانی کے مکرر استفسار پر بولا کہ سنگلدیپ کے راجہ کی بیٹی پدماوت ایسی خوبصورت ہے کہ تیرا چہرہ اُسکے کفِ پا کے برابر بھی نہیں ہوسکتا - یہ سخت جواب سنکر رانی کو طیش آیا - فیروزے پر لال ہوئی اور کنیز کو حکم دیا کہ طوطے کو ذبح کرڈالے - لونڈی ہوشمند اور عاقبت اندیش تھی طوطے کو اپنے گھر میں چھپا لیا اور جب راجہ نے جستجو شروع کی تو اُس کو حاضر کر دیا - راجہ نے طوطے سے پدماوت کی تعریف سنی - دامِ عشق میں اسیر ہوا - راج پاٹ چھوڑا ماں بیوی کی محبت کی زنجیر توڑی - جوگی بنکر معشوق کی تلاش میں نکلا - طوطا رہبر دیا دی تھا - جنگلوں پہاڑوں دریاؤں - سمندروں کو طے کرتا ہوا جزیرہ سنگلدیپ تک پہونچا اور بیرونِ شہر ایک بتخانہ میں فروکش ہوا -

طوطے نے پدماوت کو جاکر اطلاع کی کہ چتور کا راجہ تیرے عشق میں دیوانہ ہوکر جوگیانہ بھیس میں آیا ہے - پتھر کا دل موم ہوا - پدماوت نے زبان دی کہ وہ بسنت کے دن پوجا کے لئے بتخانے جائے گی اور اُس جوگی کو دیکھے گی - وعدہ کے موافق وہ آئی مگر راجہ تاب نظارہ دیدار نہ لاسکا - ایک ہی جلوہ میں بیہوش ہوگیا اور سر و پا کی خبر نہ رہی - رانی نے صندل سے اُس کے سینے پر لکھا " تو جوگی بنا لیکن جوگ نہ سیکھا جب ملاقات کا وقت آیا تو سوگیا - تیرا مطلب کیونکر حاصل ہوسکتا ہے " جب راجہ کو ہوش آیا تو معشوق رخصت ہوچکا تھا - ندامت اور افسوس سے خودکشی کا ارادہ کیا - لکڑیاں جمع کرکے بُت خانہ میں آگ لگانے اور جل مرنے کا عزم بالجزم کرچکا تھا کہ ملکوت میں غلغلہ پڑا - مہادیوجی نے درشن دئے اور قلعہ میں داخل ہونیکا ایک پوشیدہ راستہ بتایا جس کے لئے سانس روک کر گرداب میں غوطہ زنی کی ضرورت تھی -

رتن سین ہدایت پر عمل پیرا ہوا - قلعہ کی دیوار پر چڑھتا تھا کہ پاسبان ہوشیار ہوگئے - گرفتار کیا گیا

اور سولی کا حکم ملا۔ اُس نے موت قبول کی مگر اپنا راز ظاہر نہ کیا اور منزل دلدار کے قریب جنگ و جدال کا روادار نہ ہوا۔ تب مہا دیوجی بھاٹ کے بھیس میں گندھرپ سین کے پاس گئے رتن سین کی خاندانی شرافت اور عالی نسبی سے آگاہ کیا۔ طوطے کی گواہی دلوائی اور آخرکار اُن کی سفارش وسعی سے رتن سین کا پدماوت سے عقد ہو گیا۔

ادھر رانی ناگ متی رتن سین کے فراق میں دیوانہ وار جنگل میں گھوم رہی تھی اور اُس کی آہ سوزاں سے وحوش وطیور کو تکلیف تھی۔ ایک طائر بہنگم نام کو اس کے حال زار پر ترس آیا اور رانی کا نامۂ شوق لیکر رتن سین کی تلاش میں نکلا۔ سنگلدیپ میں رتن سین سے ملاقات ہوئی۔ خط دیکھتے ہی ناگمتی کی یاد نے بے چین کیا اور وطن کی واپسی کا اشتیاق پیدا ہوا۔

گندھرپ سین کی اجازت سے سفر کا آغاز کیا مگر اب طوطا رہبری کے لئے ہمراہ نہ تھا۔ سمندر کے قریب پہونچے تو ایک برہمن دان مانگنے آیا۔ راجہ نے اُس کا سوال رد کر دیا۔ دیوتا ناراض ہوئے۔ طوفان آیا۔ جہاز ٹوٹ گیا۔ رتن سین اور پدماوت کا ساتھ چھوٹا۔ عرصہ کے بعد یکجائی ہوئی اور صعوبات برداشت کرکے چتور پہونچا۔ ایک ساحر راگھو نام سنگلدیپ سے ساتھ آیا تھا اس سے راجہ خفا ہوا اور شہر بدر کرنے کا حکم دیا رخصت کے وقت پدماوت نے اپنا ایک کنگن مدد خرچ کے لئے عنایت کیا۔ وہ ساحر دہلی پہونچا اور سلطان علاء الدین خلجی کی سرکار میں ملازم ہوا۔ پدماوت کے حسن کی تعریف کی اور کنگن دکھایا۔ سلطان نادیدہ عاشق ہوا۔ چتور پر فوجکشی کی۔ مدت تک جنگ کا بازار گرم رہا مگر نہ ایں را خطر نہ آں را ظفر۔ آخر صلح ہوئی۔ سلطان قلعۂ چتور میں گیا۔ راگھو کی شرارت سے آئینہ میں پدماوت کا عکس دیکھا اور حکمت عملی سے رتن سین کو گرفتار کرکے دہلی لے گیا۔ پدماوت نے رتن سین کے بھائیوں کو جنگ پر مستعد کیا۔ وہ فوج لیکر دہلی چلے اور مشہور کیا کہ پدماوت بہ نفس نفیس علاء الدین سے ملنے جاتی ہے۔ شہر کے قریب پہونچکر سپاہیوں کو ڈولیوں پر سوار کرایا۔ دھوکے سے رتن سین کو آزاد کراکے چتور بھجوا دیا اور خود لڑتا جھگڑتا پسپا ہوا۔ رتن چتور پہونچا تو معلوم ہوا کہ اُس کی غیبت میں جوار کے ایک راجہ نے پدماوت سے عشق کا اظہار کیا تھا۔ رقیب کے قتل کی قسم کھائی اور دوسرے دن اُس سے لڑنے چلا۔ دشمن کو زیر کیا مگر خود بھی جنگ میں زخمی ہو گیا۔ گھر واپس آکر مر گیا اور اُس کے ساتھ ناگمتی اور پدماوت بھی ستی ہو گئیں۔

اس اثنا میں علاء الدین خلجی بھی لڑتا ہوا چتور تک پہونچ گیا تھا۔ شہر کے دروازہ پر پدماوت کے دردناک انجام کی خبر ملی۔ چتا سے راکھ اُٹھا کر اپنے سر پر ڈالی اور سخت حسرت وافسوس سے دہلی واپس گیا۔

سنی تم نے عزیز و یہ کہانی کرے اللہ باقی کل فانی

مورخانہ نقطۂ نگاہ سے داستان میں صدق کا عنصر بہت تھوڑا ہے۔ ۱۳۰۳ء میں علاء الدین خلجی کا چتوڑ پر حملہ ہندوستان کی کتب تواریخ میں مذکور ہے لیکن ضیاء الدین برنی وغیرہ چودھویں صدی کے وقائع نگار رانی پدماوتی کا تذکرہ نہیں لکھتے البتہ فرشتہ نے مجملاً پدماوت کا دردناک انجام بیان کیا ہے اور کرنل ٹاڈ نے "راجستان" میں اس قصہ کو زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔ اگرچہ زمانۂ حال کے محقق یہ رنگ آمیزی پایۂ اعتبار سے ساقط تصور کرتے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ مغلیہ سلطنت کے ابتدائی دور میں بھاٹوں اور پنڈتوں کی زبان پر رتن سین اور پدماوت کے عشق کی کہانی تھی اور انھیں متفرق افسانوں کو یکجا کرکے ملک محمد نے یہ داستان ترتیب دی تھی جس میں تصوف کے نکات۔ معرفت کے اسرار۔ اور سالکانِ طریقت کے منازل و مقامات کی تشریح کی تھی۔ مثنوی کے خاتمہ پر خود لکھتے ہیں کہ:-

"ہفت طبق آسمان اور ہفت طبق زمین انسان کے جسم میں موجود ہیں میں نے اس نظم میں تن سے چتوڑ روح سے رتن سین۔ دل سے سنگلدیپ۔ پدماوت سے معشوق حقیقی۔ طوطے سے مرشد۔ ناگمتی سے دنیا۔ راگھو سے شیطان۔ علاء الدین سے ہوا و ہوس کی تمثیل بنائی ہے۔ جو محبت کا مذاق رکھتا ہے اس سے لطف اٹھائے گا اور جو سنے گا اس کو درد عشق حاصل ہوگا"

مصنف نے اپنی نظم کے اسرار و غوامض سے اتنا ہی پردہ اٹھایا ہے لیکن مثنوی غور و تعمق سے دیکھی جائے تو اس میں جگہ جگہ نکات تصوف کا بیان ہے۔ امراض روحانی سے خبردار کیا ہے۔ حصول عرفان کے نسخے لکھے ہیں۔ سالک طریقت کے منازل و مراحل کا نشان دیا ہے۔ عالم ناسوت کی سیر۔ جنگلوں پہاڑوں اور دریاؤں کے سفر میں ظاہر کی ہے۔ سنگلدیپ کے بتخانے میں ملکوت کا تماشہ ہے۔ پہلی تجلی کے بعد بیہوشی اور حسرت و ندامت سے خودکشی کا عزم۔ منازل قبض و بسط کے نمونے ہیں۔ مہادیوجی نے قلعہ میں داخل ہونے کا جو راستہ تعلیم کیا وہ حبس دم سے لطیفۂ قلب کے کشود کا طریقہ ہے۔ رتن سین کو کامیابی اسوقت ہوئی جب مہادیوجی نے گندھرپ سین کے دربار میں طوطے سے گواہی دلوائی اور وہ اس صوفیانہ رمز کی طرف اشارہ ہے کہ کشود کار بغیر توجہ مرشد کے ممکن نہیں۔ سنگلدیپ سے چتوڑ کی طرف واپسی فنا فی اللہ کے بعد بقا باللہ کی تمثیل ہے۔ ہوا و ہوس میں گرفتاری بشریت کا تقاضا ہے اور چتا کی راکھ سر پر ڈالنا اشارہ ہے کہ ہوس کی آگ صرف خاک ہی سے بجھ سکتی ہے۔

جائسی لکھتے ہیں کہ رتن سین راگ کا شیدائی تھا مگر جب منزل اعلیٰ پر پہونچا اور پدماوت کے محل میں دعوت ہوئی تو قسم قسم کے کھانے مہیا کئے گئے لیکن سماع کی اجازت نہیں دیگئی۔ اس مضمون کو اردو مترجم یوں نظم کرتا ہے:-

تھے راجہ راگ بن کچھ بھی نہ کھاتے	یہ سب تھا پر نہ تھے واں راگ گاتے
ہوئے انگشت حیرت سب بدنداں	کیا جب تو شتاب اُس نے نہ کچھ واں

براتی اور مصاحب تھے جو بیٹھے　　سبھوں نے اپنے اپنے ہاتھ کھینچے
برہمن دست بستہ روبرو آ　　لگے کہنے کہ موجب اس کا فرما
دقیقہ کوئی ہم سے کم ہوا ہے　　کہ جس باعث سے تو برہم ہوا ہے
جو فرماؤ منگاویں ہم ابھی زود　　وہ کیا ہے جس سے دل تیرا ہو خوشنود
ہوا وہ دُرفشاں اپنی زباں سے　　کہا جلدی گروہِ بید خواں سے
یہ عقدہ مجھ کو ہے درپیش لاحل　　طعام اول ہے یا ہے راگ اول
درِ دل راگ سے ہوتے ہیں مفتوح　　کہ آئی جسم میں ہے راگ سے روح
انھوں نے عرض کی اس سے کہ اے ماہ　　مقرر سالکوں نے کی ہیں دو راہ
جو راہِ علم ظاہر پر ہیں قائم　　نہ دیویں ان کو رخصت راگ کی ہم
جو باطن میں ہیں مستِ جامِ اُلفت　　انھیں کو چاہیئے اس کی سماعت
کہ بس ان کی وہی ہے منزلِ وصل　　بغیر از راگ ہے اُن کے تئیں فصل
کیا جس واسطے تھا ترکِ آرام　　ہوا سو اب تمھارا آخر انجام
چھٹی تن سے تمھارے خاکِ دوری　　ہوئے اب تم نہا دھو شکلِ نوری
مگر جو یہ تمھارے ساتھ ہیں یار　　اگر ان کو ہو اس کا شوق سرشار
کہو ان سے الگ جا اس مکاں سے　　کریں دل شاد اب رقصِ بتاں سے

غرض ملک محمد کی پدماوت اسرارِ تصوف کا گراں بہا گنجینہ ہے اور ایک مدت تک اربابِ محبت کے حلقوں میں اُس کی بڑی قدر و قیمت رہی۔

جب مغلیہ سلطنت کا آفتابِ اقبال لبِ بام آیا اُردوئے معلّٰی نے برج بھاشا کی جگہ لی۔ شہروں کے بسنے والے سنسکرت آمیز ہندی کی جگہ فارسی آمیز اُردو بولنے لگے۔ پدماوت سے لطف اندوز ہونے والے انگلیوں پر شمار کرنے کے قابل رہ گئے اور آج ہندوستان میں چند ہی مسلمان ایسے ملیں گے جو بغیر ترجمہ اور شرح کے ملک محمد کے بلند تخیلات سے مستفید ہو سکیں۔

تیرھویں صدی ہجری کے آغاز میں میر ضیاء الدین دہلوی متخلص بہ عبرت کو شوق پیدا ہوا کہ وہ پدماوت کی داستان ریختہ میں نظم کریں اور جائسی کے خیالات سے اپنے ہمعصروں کو جو بھاشا فراموش کر چکے تھے روشناس بنائیں۔ عبرت حکیم تھے۔ رامپور میں مطب کرتے تھے۔ نواب بخو خاں رئیس کے انیس و جلیس تھے شعر و سخن سے ذوق تھا۔ نواب فیض اللہ خاں والی رامپور کی تعریف میں اُن کا ایک شعر

مدت تک ضرب المثل رہا تھا۔

جو کبری مانگے اُس کو فیل بخشے صدف مانگے تو موتی جھیل بخشے

جرأت و مصحفی کے ہم صحبت نواب محبت خاں کے شاگرد رشید تھے۔

مضامیں کس طرح کرتا میں ایجاد نہوتا گر محبت خاں سا اُستاد

منازل سلوک و مراحل تصوف سے بھی دلچسپی تھی۔ سرخیل مقبولان درگاہ سید حسن شاہ کے مرید تھے۔

جہاں پر نام وہ مذکور ہووے زباں جیوں برگ نخل طور ہووے

مسئلہ وحدت الوجود سے آشنائی تھی۔

ہر اک عالم کو گوناگوں بنایا وہ بیچون و چگوں "چوں" میں در آیا
ہزاروں شان میں ہو کر وہ گزرا کبھی دامن بنا وہ گاہ عذرا
ہے سب شکلوں میں اُس کا ہی یہ مظہر پران سب صورتوں سے ہے وہ باہر
ہے سب کے پاس وہ اور سب سے ہے دور ہے سب رنگوں میں دید اپنی ہی منظور
ہر اک جا میں ہے گو اُس کی جدا آن و لے ہر آن میں ہے وہ کما کان

پدماوت کا قصہ ریختہ میں نظم کرنے کا عزم کیا تو دل میں وسوسہ پیدا ہوا کہ مسلمان ہو کر ہندو راجہ کا قصہ لکھنا نامناسب معلوم ہوتا ہے۔

کہے کوئی کہ عبرت سا مسلماں ہوا ہے عشق کافر سے سخن راں

لہذا دفع دخل کرتے ہیں۔

کہ عشق آزاد ہےگا کفر و دیں سے نہیں کچھ کام اُسے شک و یقیں سے
وہ ان دونوں ہی عالم سے ہے آزاد کرے ہے کفر و دیں دونو کو برباد
نہیں کچھ مانتا عشق ستمگار کہ کیا تسبیح ہے اور کیا ہے زنار
اُسے معشوق و عاشق کا نہیں غم وہ دونوں کو کرے رسوائے عالم
کرے ہے روشن اپنا شعلہ جب دم جلا دے شمع و پروانے کو باہم

ملا غنیمت کی استاد و شاہد کی روداد فارسی لٹریچر کا قابل یادگار کارنامہ ہے۔

بہ مکتب میبرد طفل پریزاد مبارک باد مرگ نو بہ استاد

لیکن عبرت کا مکتب زمانہ بھی اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ پدماوت تحصیل علوم کے لئے ایک برہمن کے سپرد کی گئی
ستم، اس کو برہمن کیا پڑھاتا کہ مثل مرغ بسمل خود پڑا کہتا

لگی پڑھنے وہ بسم اللہ جدم — برہمن ہو گیا مجموعۂ غم
جوگی اُس نے نگاہ عشق انگیز — ہوا ہر لفظ صد معنی سے لبریز
وہ گل جس صفحہ پر ہوتی سبق خواں — نظر آتا وہ اک جزوِ گلستاں
سبق کو بھول کر وہ غارت ہوش — تبسم کرکے ہو جاتی تھی خاموش
برہمن مثل مستانِ خرد گم — شہید جلوۂ تیغ تبسم
یہ کہتا تھا کہ کمتر ہنس شکر لب — کہ مصری تیغ یہ کاٹے ہے بیڈھب

رتن سین سلطنت چھوڑ کر فقیرانہ لباس اختیار کرتا ہے۔ ماں سے رخصت ہونے محل میں جاتا ہے اور سفر کی اجازت طلب کرتا ہے۔

کہ اے اما سفر اب سر پہ آیا — مجھے کرتا ہے اب تجھ سے پرایا
نہیں ہے حق ترا مجھ کو فراموش — ہے تیرے دودھ کا مجھ میں ابھی جوش
کہ تو نے اُلفت و شفقت سے مائی — مجھے بتیس دھاریں ہیں پلائی
شجر جوں گل کا ہو پانی میں آیا — تو بھیگی مجھ کو سوکھے پر سلایا
تو میرے غم میں یہ جاگی کہ اک پل — لگیں تیری نہ پلکیں مثل مخمل
جو کچھ کی تو نے مجھ پر جانفشانی — کہوں کیا سب تری تھی مہربانی
برنگِ لعل تو نے مجھ کو پالا — بسانِ مہر مجھ پر سایہ ڈالا
میں زریں تاج سے جوں شعلہ بیزار — ہوا ہوں عشق کے ہاتھوں سے ناچار
کہ رکھ کر عشق نے اب داغِ سوزاں — بنایا دل مرا سروِ چراغاں
جو انگارے کی صورت دل جلا ہے — بھبوت اب راکھ کا میں نے ملا ہے
یہ کنڈل کان میں جو میں نے پہنا — ہوا حلقہ بگوش اب اک پری کا
نگین و تاج و تخت و ملک و کشور — کیا میں نے فدائے نامِ دلبر
پدم کے واسطے جوگی ہوا ہوں — سفر کی تجھ سے رخصت مانگتا ہوں
جو کچھ میں نے کہا ہو بخش دیجیو — دعا کے ساتھ مجھکو یاد کیجیو

ماں نے بیٹے کو بہت سمجھایا اور سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر عشق کے مجنوں پر کچھ اثر نہ ہوا۔

جو دیکھا ماں نے ہے یہ سخت مجنوں — اثر اس پر نہ ہوگا کوئی افسوں
وہیں زلفوں سے کے اُس نے بال جھٹکے — اُکھڑ پڑے عنبر افشاں بال لٹ کے

وہ بال اُسکی کلائی پر سے لپٹے
بلائیں اُسکی لیکر بولی بیٹے

ہوا جو تو قلندر وضع آزاد
یہ دل سے میری سمرن کیجیو یاد

جو تو دُلہن کے گھر جائے گا جانی
یہ کنگنا اس گھڑی ہو گا نشانی

پھر اپنا سر جو تھا لوہو میں ڈوبا
لپٹ بیچارہ کے پاؤں پہ رگڑا

کہ بیٹا میں یہ ہوں مہندی (لہو) لگاتی
پدم کا تجھکو ہوں نوشہ بناتی

یہ میرے اشک جاری ہیں جو سرشار
گلے میں موتیوں کے ڈال لے ہار

رتن سین کی بیوی ناگمتی نے اس سے بھی بڑھکر ستم کیا۔

پھر اُس نے چیر کر بانہیں چھنگلیا
جبیں پر قشقہ اس جوگی کے کھینچا

کہے جاتا نہیں گر مجھکو پیارے
مرا لوہو لئے جا ساتھ بارے

میں گو نظروں میں او گل تیرے ہوں خار
نہ چھوڑوں (لہو) گی پر ان قدموں کو زنہار

تو اسبابِ سفر اب تن سے کر دور
نہیں یہ سر مرا گردن سے کر دور

نہیں معلوم مجھ کو سوتیا ڈاہ
ملے تو جبکہ اُس معشوق سے آہ

مرا مرنا سنا کر شاد کیجو
یہی اول مبارکباد دیجو

جب ان باتوں سے کام نہ نکلا تو ناگمتی بھی جوگن بنی۔

وہیں جیوں شمع فانوسِ خیالی
گلے میں اوڑھنی کی کفنی ڈالی

بھبوت اپنے ملا چہرے کے اوپر
دبایا راکھ میں انگارا لیکر

کیا نتھ کو رخِ دلخواہ سے دور
کیا ہالہ کو اپنے ماہ سے دور

وہ زیور موتیوں کا سب اُتارا
نہ چھوڑا مہ نے کوئی ستارا

وہیں رو رو کے رستہ جا کے گھیرا
کہ اے جوگی کرے گا کب تو پھیرا

تو کیونکر جائے گا میرے سنگاتی
میں ہوں الماس اشک اس جا بہاتی

تو مجھ جوگن کو ساتھ اپنے لئے جا
بھروں گی میں لئے تیرا یہ میتا[1]

جو کانٹا پاؤں میں دیکھوں گی تیرے
نکالوں گی میں پلکوں کی سوئی سے

جہاں دیکھوں گی اُڑتی گردِ صحرا
کروں گی اشک سے چھڑکاؤ اُس جا

---

[1] میتا ہندی میں کاسہ گدائی کو کہتے ہیں۔

جہاں پر دھوپ ہوگی واں شتابی ترے مُنھ کی بنوں گی آفتابی
جہاں تو بیٹھ کر باندھیگا آسن سراپا میں کروں گی واں سنگاسن
تری راحت کو بہرِ دفع گرما کروں گی سائباں پلکوں کا برپا
نہ ہرگز کنکروں پر سوئے گا تو میں سر کے بالوں سے دیدوں کی جھاڑو
اندھیری شب ہو جس جنگل میں باسا جلاؤں گی دل اپنا شعلہ آسا
رتن جامِ محبت سے تھا مدہوش کسی کی بات پر اس کو نہ تھا گوش
نہ رانی کو جواب اُس نے دیا کچھ نہ اوروں سے خطاب اُس نے کیا کچھ
گیا در سے جو وہ جوگی نکل کر وہ نرگس کی طرح تکتی رہی در
جو آئی ہوش میں پھر وہ : وانی کہا کرتی تھی جوگی کی کہانی

اگر عبرت کی زندگی وفا کرتی اور ساری داستان اسی دردآمیز لہجہ میں نظم ہو جاتی تو ادب اُردو کی تاریخ میں مثنوی سحرالبیان کے بعد پدماوت کا نام لکھا جاتا لیکن وہ قصہ کا چہارم حصہ لکھ پائے تھے اور اُس مقام تک پہونچے تھے کہ رتن سین سنگلدیپ کے بتخانہ میں فروکش ہوا اور طوطے نے اُس کے حالِ زار سے پدماوت کو آگاہ کیا کہ عبرت کا پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا اور وہ اپنا کام ناتمام چھوڑ کر ملک جاودانی کی طرف راہی ہوئے سات آٹھ برس تک تکمیل داستان کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔ آخرکار سید غلام علی مشہدی ساکن بریلی نے جو بیک واسطہ مرزا رفیع سودا کے سلسلہ میں داخل تھے اس افسانہ کو تمام کیا۔

سبب تالیف مصنف کی زبان سے سنئے کیونکہ ڈیڑھ سو برس پہلے کی نثر اُردو کا نمونہ ہے:۔

" مخفی نہ رہے کہ بندۂ ہیچمداں علم سخن سنجی اور سرگرداں سرائے سرپنجی خاکسار بے مقدار سید غلام علی مشہدی متخلص بہ عشرت ساکن بریلی۔ ابجدخوان دبستان مرزا علی لطف صاحب سلمہ اللہ تعالے کہ ذات بابرکات اُن کی ذوق یاب شعر و شاعری کی کلام کرامت نظام مرزا رفیع السودا مرحوم مغفور سے ہے بلکہ شاگرد رشید اُن کے ہیں چندروز سے ۱۲۱۱ھ میں درمیان شہر رامپور کے کہ نام خاص اُس شہر بلند اور بلدۂ ارجمند کا مصطفےٰ آباد ہے بجہت اُلفت بعضے یاران نکتہ پرواز اور دوستان محرم راز کے وارد تھا بلکہ بیچ سرکار فیض آثار گوہر درج فتوت اختر برج مروت شوکت و شہامت پناہ حشمت و جلالت دستگاہ خانصاحب مشفق فیض رساں مظہر کرم والاحسان محمد عثمان خاں و احمد خانصاحب سلمہا الرحمٰن کہ خاندان عالیشان نواب معلےٰ القاب فیض اللہ خاں مرحوم و مغفور کی سوائے رشتہ خواہرزادگی کے نسبت فرزندی کی بھی رکھتے ہیں سررشتہ روزگار کہ ہر دنیا دار کے تئیں جستجو اُس کی ضرور ہے اور ہر ایک باشندہ اس بازار کا لیل و نہار

بہ فکرِ روزگار تگاپو میں مجبور رہے رکھتا تھا۔ چنانچہ ایک مجلس مشاعرہ میں مولوی صاحب فیض رساں سلمہ الرحمن نے باصد زیورِ تقریرِ فصاحت آمیز دبا سزاراں لباسِ تحریرِ بلاغت انگیز اوپر تختِ مرصع کلام عشق التیام کے اس طور پر جلوہ نمائش کا دیا کہ ایک عزیز پُر تمیز جوانِ رعنا یوسفِ مصر فصاحت و بلاغت ماہ کنعانِ رزانت و متانت بازیورِ علوم دینی آراستہ و بالباسِ قابلیت و فنونِ دنیوی پیراستہ نخلبندِ گلستانِ مضامینِ رنگین چاشنی افزائے شکرستانِ الفاظ معنی شیرین اخترِ برجِ سیادت گوہرِ درجِ سعادت میر ضیاء الدین نام متخلص بہ عبرت متوطن شاہجہان آباد خوش باشِ قصبۂ رامپور ہمارے آشنا تھے...... انھوں نے قصہ راجہ رتن سین اور پدماوت کا کہ زبانِ یو۔پی میں تصنیف مولانا ملک محمد جائسی کا ہے زبانِ ریختہ میں تصنیف کرنا شروع کیا اور بمقدور اپنے کوئی دقیقہ شعر و شاعری کا فوت و فروگزاشت نہ کیا۔ القصہ چہارم حصہ اس قصۂ غریب کا بہ نکاتِ عجیب و لطیف و مضامینِ رنگین دلفریب قلم معنی رقم اپنے سے تحریر و تسطیر کیا کہ میر ضیاء الدین عبرت کو مرض الموت ہوا اور ساتھ حسرت و غم ناتمامی اس داستان ندرت بیان کے دار الفنا سے طرف دار البقا کے قدم رنجہ فرمایا۔ اب عرصہ سات آٹھ برس کا گزرا کہ کوئی موزوں طبع کچھ کچھ اپنے جی میں سمجھ کر واسطے تمام کرنے اس کلام دردالتیام کے دست انداز نہوا۔ مہربان من اب استدعا اور آرزو ہم مشتاقوں کی یہ ہے کہ بہ سبب فکرِ تمھاری کے یہ قصہ عجیب و غریب باقی ماندہ بیچ مسلک نظم آبدار کے آب و تاب انتظام کی پاوے اور ہر ایک مشتاق سیرِ اس گلستان مضامین اور معانی سے حظِ وافر اُٹھاوے...... اے یارانِ محرمِ راز دا سے شفقت نشان بندہ نواز میں نے پاسِ خاطرِ عاطر سے باقی ماندہ یہ قصہ عجیب و غریب بہ کاوشِ بسیار و فکرِ بے شمار عرصہ یک و نیم ماہ میں ساتھ اس جلدی کے کہ انصرام پانا اس کلام کا محال تھا تمام کیا اور منظورِ خاص و عام و جمہورِ انام کا ہوا۔"

غرض ۱۲۱۱ھ میں عشرت نے ڈیڑھ مہینہ میں یہ قصہ تمام کیا اور "تصنیف دو شاعر" مادۂ تاریخ اتمام تجویز کیا۔

یہ کہکر مثنوی میں نے جو کی غور کوئی تاریخ اس کی کہئے خوش طور
کہا دل نے اسے دیکھے جو ماہر بلا شک جانے تصنیف دو شاعر
۱۲۱۱ھ

عشرت کے کلام کا رنگ ملاحظہ ہو:۔

علاء الدین نے ایک دلالہ کو پدماوت کے بہکانے کے لئے چتور بھیجا۔ وہ جوگن کے بھیس میں جاتی ہے

پہن کر سب لباس گیروا بائی سراپا شکل جوگن کی بنائی
وہ مندرے کان میں غارتگرِ ہوش دلِ عالم ہو جس کا حلقہ در گوش

وہ حلقہ سر پہ جیسے مہ پہ ہالا — اور اک کاندھے پہ رکھے مرگ چھالا
بھبوت اپنے وہ تھا منہ پر لگایا — کہ آئینہ کا جس نے ہوش اڑایا
مسافر خانہ میں آکر وہ پرفن — جو بیٹھی جوگیا نہ مار آسن
بچھا کر مرگ چھالا اک جگہ پر — دھیان اور گیان میں کہتی تھی ہر ہر
دھیان اور گیان میں وہ نازنیں ہے — کوئی دم یاد سے غافل نہیں ہے
جو اٹھتی بیٹھتی وہ مہ لقا ہے — سہارے کو عصا یادِ خدا ہے
دم اپنے کی ہے سارنگی بناتی — اسی اک تار کو ہر دم بجاتی
غرض جو چاہئے عشاق کے راز — لگاتی ہے اسی پردے سے آواز

رتن سین نے سنگلدیپ جاکر پدماوت سے شادی کی اور یاران وطن کو بھول گئے۔ اُن کی عاشق زار رانی ناگمتی شوہر کے فراق سے بےچین ہے۔

جگر تھامے ہوئے غمگین و بیتاب — پھرے تھی لوٹتی مانند سیماب
کبھو وحشت میں آ باہر نکلتی — اٹھا کر خاک گاہے منہ پہ ملتی
کبھو زانو پہ سر رکھ کے وہ ناچار — کبھو جا بیٹھ رہتی شکلِ بیمار
کبھو منہ ڈھانپ کر اپنا وہ روتی — تڑپتی اور بلکتی جان کھوتی
کبھو دیوانہ ساں بکتی وہ دلگیر — کبھو خاموش رہتی مثلِ تصویر
کبھو بےتاب ہوکر در پہ آتی — جگر تھامے ہوئے پھر گھر میں جاتی
خیال اکدن یہ اس کے جی میں آیا — کہ دل بہلاؤں اپنا باغ میں جا
تصور دل میں کر قدِ رتن کا — تماشا دیکھئے سروِ چمن کا
نظر آتی نہیں چشمِ رتن سین — تو دیکھوں چشمِ نرگس کو میں بےچین
جو یاد آوے گی وہ زلفِ پریشاں — تو سنبل پر کروں گی جان قرباں
یہ جی میں ٹھان کر وہ غیرتِ باغ — برنگِ لالہ گلشن سے لئے داغ
محل سے آئی گلشن میں خراماں — کئے مانند گل ٹکڑے گریباں
زبس غم سے وہ سرگرمِ فغاں تھی — کہے تو عندلیبِ بوستاں تھی
غرض آئی تھی بہلانے کو وہ دل — ہوئی سو آکے دونی مرغِ بسمل
برنگِ غنچہ ہو گلشن سے دلتنگ — چلی صحرا کی جانب کرکے آہنگ

بگولے کی طرح وہ مضطرب حال پھرے تھی بس غم اُلفت کی پامال
یہ آتش اُس کی آہوں سے تھی پیدا کہ جس سے دشت سارا جل گیا تھا

ناگمتی رتن سین کے نام اشتیاق نامہ لکھتی ہے اور ایک طائر نامہ بری کا وعدہ کرتا ہے۔ خط کا مضمون یہ ہے:۔

رفیق و دستگیر جانِ ناشاد رتن شاداں سلامت دائما باد
گیا ہے جب سے تو اے راحتِ جان نہیں آرام و تسکیں مجھ کو اک آن
برنگِ لالہ ہوں میں داغ بر دل ہے دردِ دل سے دم لینا بھی مشکل
ترے بن اے گلِ باغِ جوانی پھروں ہوں مثلِ بلبل میں دوانی
گیا تو بن کے جب سے شکل جوگی میں جوگن ہوں ترے غم کی بروگی
کوئی کرتا بھی ہے کام اس طرح کا کیا اے بیمروت تو نے جیسا
خیالِ غیر سے واں تو ہم آغوش یہاں میں مرگ سے ہوں دوش بردوش
ہے تو ہمراہ اوروں کے بہ گلزار میں خارِ رشک سے مجروح و افگار
کیا تو نے مجھے دل سے فراموش یہاں میں یاد سے تیری ہم آغوش
خدا جانے تجھے کس نے لبھایا کہ تو نے دل سے مجھ کو یوں بھلایا

عشرت کے بیان میں وہ درد نہیں جو سرکار ازل سے عبرت کے حصہ میں آیا تھا۔

عشرت کی زبان میں وہ لوچ نہیں جو شاہ جہاں آباد کی خاک پاک نے عبرت کی سرشت میں ودیعت رکھا تھا۔

عشرت کو فن تصوف سے وہ ذوق نہیں جو عبرت کو درویشوں کے خوانِ نعمت سے ملا تھا۔

روزمرہ دونوں کا قدیم ہے۔ اِتنے - ٹک - پرتے - لوہو - ووہیں - ہیگا - گہا دتے - تئیں وغیرہ متروک الفاظ دونوں استعمال کرتے ہیں۔ رعایت لفظی پر دونوں جان دیتے ہیں۔ جائسی کی تشبیہات اور نازک خیالیوں سے دونوں مستفید نہیں ہوتے۔ محاورات نظم کرنے میں قواعد نحو کا لحاظ نہیں رکھتے۔ تعقید کو معائب سخن میں شمار نہیں کرتے۔ بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث بھی عام رواج کے خلاف ہے لیکن اُس وقت تک بندش کی صفائی اساتذہ کے کلام میں بھی کالمعدوم تھی۔ نثر آج کی نظم سے زیادہ مغلق اور پیچیدار ہوتی تھی۔ غزل "ریختہ" کی منزل سے آگے نہ بڑھی تھی اور واقعہ نگاری پر کسی شاعر کو الا ماشا اللہ قدرت نہ تھی۔

میر حسن نے اپنی لاجواب مثنوی سحر البیان اس نظم سے چند سال پہلے تمام کی تھی جس کی فصاحت بیان شیرینی زبان۔ صفائی بندش پر آج پونے دو سو برس کے بعد بھی حرف رکھنے کی گنجائش نہیں۔ نہ اُس سے پہلے

اصاف روزمرہ کسی واقعہ نگار نے نظم کیا تھا اور نہ اس کے بعد پچاس ساٹھ برس تک کوئی مثنوی گو اُس کی
پیدا کرسکا لیکن یہ ایک مستثنے ہے جو قاعدۂ کلیہ کو ثابت کرتا ہے۔ سودا و قائم کی نظمیں۔ انشا اور جرأت کی مثنویاں
حفی کی بحر المحبت۔ نواب محبت خاں کی اسرار محبت۔ میر تقی ہوس کی لیلے مجنوں اسی دور کی تصنیفات ہیں
ر اُن میں وہ سب نقائص موجود ہیں جن سے آج عبرت و عشرت کا کلام ہدفِ ملامت بنایا جاسکتا ہے
رت کے نظم کردہ حصہ میں میر تقی علیہ الرحمہ کا سوز و گداز کسی قدر پایا جاتا ہے۔ البتہ عشرت کی نظم کا آخری حصہ
شک اور بے لطف ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ نہایت بے توجہی اور بے دلی سے لکھا گیا۔ عشرت نے عجلت کو مدِنظر رکھا
ڈیڑھ مہینہ میں نظم تمام کی اور محاسن کلام کو نظر انداز کیا۔ بہرحال ان کی سعی مشکور سے مثنوی پایۂ تکمیل کو پہونچی۔
قصہ کی رنگینی۔ خیالات کی بلند پروازی نے پھول کی جستجو میں کانٹوں کی زحمت ناگوار نہونے دی۔ مثنوی کی
دل آویز ابتدا نے مایوس کن انتہا کا کسی قدر معاوضہ کر دیا۔ سخن فہموں نے قدر و قیمت کی۔ عوام و خواص
نے قبولیت کی سند دی۔ شعرا نے تحسین و آفرین کے خلعت پہنائے۔ مصحفی نے تذکرۂ شعرا میں اس نظم کی
داد دی اور فرانسیسی مستشرق گارسن ڈی ٹاسی نے اس مثنوی کی بہت تعریف لکھی۔ یہ دلچسپ مثنوی
غدر سے نو سال پہلے ۱۲۶۵ھ میں مطبع مصطفائی لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی اور اب کمیاب ہے۔ قدیم
کتب خانوں میں اس کے نسخے موجود ہیں مگر بازار میں کوئی کاپی دستیاب نہیں ہوسکتی۔ نظم طویل ہے۔
تقریباً چار ہزار اشعار ہیں اور اس کے بعض مضامین مثل توصیف عمارات و باغات و تجمل برات وغیرہ
زمانۂ حال میں دلکش نہیں لہذا ضرورت تھی کہ اس مثنوی کا ایک خلاصہ شایع کیا جائے جس میں عبرت
و عشرت کی نظم کردہ داستان مسلسل و مکمل آجائے مگر زوائد حذف کر دئے جائیں۔ جامع الاوراق
نے خلاصہ کا ایک نمونہ مرتب کیا ہے۔

داستان مسلسل ہے۔ ترکیب و بندش قدیم میں کوئی تصرف نہیں حتی الامکان بہترین اشعار انتخاب
میں آگئے ہیں اور کتاب کا حجم نصف سے بھی کم ہوگیا ہے۔ کتاب کا آخری حصہ شاعرانہ حیثیت سے حذف کے
قابل تھا لیکن داستان کی تکمیل کے لئے شامل رکھا گیا ہے اور نہایت ادب سے یہ انتخاب اہل دانش
و بینش کی خدمت میں پیشکش ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

فقیر امیر احمد علوی

فنونِ ادبیہ اور حقیقت نگاری

اس میں شک نہیں کہ انسان فطرت کا آخری اور مکمل ترین شاہکار ہے، لیکن اُس کا تدریجی ارتقا کتنا ہی پاکیزہ اور اس کے کارنامے کتنے ہی بلند کیوں نہ ہوں، وہ اپنے آپ کو اُس ماحول سے کبھی علحدہ نہیں کر سکا جس میں اُس کا نشوونما ہوا ہے۔

زندگی کا قانون سمندر کے حیوانات بے استخواں سے لیکر ترقی یافتہ انسان تک تمام ذی روح اشیاء کو اپنے شکنجہ میں کسے ہوئے ہے اور جس طرح ایک پہاڑ چلانے والا وحشی اُس سے آزاد نہیں۔ اسی طرح ایک نازک دست نقاش پر بھی اس کی گرفت پوری طرح قایم ہے۔

عہد قدیم کا وحشی، زمین، سورج، سمندر، آسمان، پہاڑوں کی چوٹیوں، جنگلوں اور میدانوں کو دیکھتا تھا اور حیرت کرتا تھا، طوفان اور سیلاب کو دیکھتا تھا اور حیران رہجاتا تھا وہ بیماری اور موت کو دیکھتا تھا اور خوفزدہ ہوجاتا تھا۔ اس کی سمجھ میں سوائے اس کے کچھ نہ آتا تھا کہ ان تمام مظاہر فطرت کو دیکھنے کے بعد سوائے حیرت کرنے اور ڈرنے کے ایک انسان اور کر ہی کیا سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے ان کیفیات کی تشریح کے لئے خداؤں اور اچھے برے دیوتاؤں کو پیدا کیا جو وحشی طیور کی صورت میں ہوا کرتے تھے یا خود ایک دیو پیکر انسان کی شکل میں۔ جب وہ دریاؤں کی طغیانی کو دیکھتا تھا تو سمجھتا تھا کہ وہ ایک غضبناک دیوتا ہے جو گنہگار دنیا کو تباہ و برباد کر دینا چاہتا ہے۔ جب وہ طوفان برق و باد کو دیکھتا تھا تو یقین کرتا تھا کہ یہ دیوتاؤں کا غصہ ہے جو انسان پر نازل ہو رہا ہے اور آخرکار ان آفات سے بچنے اور برہم دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے انسان نے جانوروں اور بچوں کی قربانی دینا شروع کی۔ یہ تھے قدیم وحشی انسان کے جذبات و خیالات جو پتھر یا لکڑی پر منقوش کئے گئے اور یہ تھا قدیم انسان کا قدیم لٹریچر اور اس کا وحشی آرٹ۔

جب دنیا نے اور ترقی کی تو دیوتاؤں کے علاوہ بادشاہوں اور دلیروں کی عظمت ظاہر کرنے کیلئے بھی اس آرٹ سے کام لیا گیا ہے لیکن اس قدر بالقصد ساتھ کہ واقفیت ہنوز پنہاں رہی۔ انھوں نے

اُس کو بادشاہوں کی توہین خیال کیا کہ ان کی تصویریں معمولی گوشت و پوست رکھنے والے انسانوں کی طرح طیار کی جائیں اور اُن کے افسانے ایسے لکھے جائیں جن میں شاہزادے، امراء و بیگمات، معمولی مرد و اور عورتوں کی طرح کام کرتے ہوئے نظر آئیں، چنانچہ انسان نے اپنے خیال کے مطابق فرضی داستانیں گھڑیں اور خداؤں اور فرشتوں کی تمام حیرت انگیز طاقتیں شاہی خاندان کے افراد میں منتقل کر دیں۔

عہد قدیم میں ادب، سنگتراشی، مصوری، موسیقی، اور فن تعمیر، بلکہ آرٹ کے تمام اصناف بڑے آدمیوں کی واحد ملکیت ہوا کرتے تھے اور اُس زمانہ کے مصوروں سے بھی (آج کل کے اکثر مصوروں کی طرح) یہی کام لیا جاتا تھا کہ وہ طاقتور کی طاقت قائم رکھنے اور کمزوروں میں احساس کمزوری باقی رہنے دینے کے لئے اپنے موقلم سے کام لیں۔ کسی شخص کے خواب میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ایک معمولی انسان کی زندگی میں کوئی خوبی یا کوئی رومان پیدا ہو سکتا ہے۔

بہرحال دنیا کو جو کچھ آرٹ اور لٹریچر کے متعلق معلوم ہوا ہے وہ یکسر غیر حقیقی ہے۔ کیونکہ وہ نتیجہ ہیں صرف اُن پراگندہ دماغ اور واہمہ پرست لوگوں کی خیال آفرینیوں کا جنھوں نے صرف خداؤں، ولیوں، فرشتوں اور شیطان کی نمایندگی کی۔ دلی بجائے خود ایک چیز ہے مگر اس کی تصویر کو اس طرح پیش کرنا کہ اس کے سر کے چاروں طرف نوری حلقہ نظر آئے، صرف واہمہ کی پیداوار ہے اور آرٹ کی غیر حقیقی نمایندگی۔ فرشتوں کے وجود کو بھی مان لیجئے مگر ہاتھ رکھنے والے فرشتہ کے بجائے پر دار فرشتہ کے کیا معنی۔ جب یہ مصور ولیوں اور مریم کی تصویریں نہ کھینچتے تو اپنا وقت بادشاہوں کی تصویریں بنانے میں صرف کرتے جو عام مردوں اور عورتوں سے بالکل علحدہ ہوتیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک آرٹسٹ اُس زمانہ میں کسی معمولی آدمی کی تصویر کھینچتا ہی نہیں تھا۔ کیونکہ اس غریب کے پاس نہ اچھے کپڑے ہوتے تھے جو تصویر کے لئے موزوں ہوں اور نہ روپیہ جو آرٹسٹ کی محنت کا معاوضہ ہو سکے۔ الغرض عہد قدیم کا مصور ایک غریب کی خدمت کسی طرح نہیں کر سکتا تھا، جس طرح موجودہ عہد کا ایک وکیل کسی مفلس کی پیروی نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد لٹریچر کی ترقی کا ایک دور اور آیا جس میں خداؤں اور بادشاہوں کے علاوہ دوسری ہستیوں کی طرف اس کو توجہ ہوئی لیکن اس وقت بھی مصنفین کی اعجوبہ زائیاں بدستور قایم رہیں مثلاً دیو کی طرح اور جادو کی تلوار رکھنے والے سورما، طلسم بند محلوں اور سونے کے ڈھیر رکھنے والے شاہزادے، ایسے مسافر جن کا خونخوار درندوں سے مقابلہ ہوتا اور وہ ان کو عجیب و غریب طریقوں سے مار ڈالا کرتے۔ کوہ دیو جو بجز پستہ قامتوں کے اور سب کو گرفتار کر سکتے تھے۔ اُس زمانہ میں ریل ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ مگر ایک قدم میں تین میل کی مسافت طے کرنے والے جوتوں نے سفر کو بہت آسان کر دیا تھا۔ غباروں اور دو

کو لوگ نہیں جانتے تھے مگر ہیرو ستاروں اور آسمانوں کی رفعت سے نیچے زمین کی ہر ہر چیز کو دیکھ سکتا تھا، ان کو رات کے وقت سونے سے قبل صرف ایک مٹر کا دانہ رکھنے کی ضرورت تھی جو صبح کو ایک طویل درخت بنکر آسمان تک پہونچ جاتا ہیرو، اگرچہ اوپر چڑھنے کا ماہر نہ ہوتا تھا مگر صرف ڈنڈے کو پکڑ کر اُس کا یہ کہنا میں اوپر چڑھتا ہوں - میں اوپر چڑھتا ہوں" کافی ہوتا اور اس طرح وہ بادلوں میں غائب ہو جاتا تھا - ایک زمانہ تھا کہ اس قسم کے افسانے لوگوں کو خوش کرنے کا باعث ہوا کرتے تھے اور ان کے پڑھنے والے انھیں بالکل غلط نہیں سمجھتے تھے -

موجودہ زمانہ کا انسان اس قسم کے افسانوں کو پسند نہیں کرتا - ہر چند اُسے جھوٹ ضرور اچھا معلوم ہوتا ہے مگر صرف اس قدر کہ وہ یہ محسوس کرتے ہوئے بھی کہ یہ سچ نہیں ہے اپنے آپ کو اس کا یقین دلا سکے کہ یہ جھوٹ بھی نہیں ہے لیکن دورِ حاضر کا ادبی ذوق یقیناً اتنا صحیح ہو چکا ہے کہ اب اُسے ایسے افسانوں کی ضرورت ہے جو کم از کم نصف سچ ہوں -

واقعیت صرف فطرت کی پرستار ہے، وہ یہ نہیں کہتی کہ ایسی کوئی جگہ ہی نہیں جہاں انسان سے زیادہ طاقت رکھنے والی ہستیاں پائی جاتی ہوں یا یہ کہ آنکھیں اُس سے زیادہ خوبصورت آفتاب کبھی دیکھ ہی نہیں سکتیں جس کا بادلوں اور سمندروں سے کرتے دیکھنا ممکن ہے، لیکن ہاں واقعیت کو یہ ضرور معلوم ہے کہ بے شمار صدیوں کے بعد فطرت نے انسانی دماغ اور انسانی آنکھ کو آہستہ آہستہ اس زمین اور اس کی اشیاء کا خوگر بنا دیا ہے اور اسلئے اس دنیا میں انسانی آنکھ کا ایک دنیا وی منظر سے متاثر ہونا ضروری ہے -

یہ کہنا کہ "واقعیت" حقیر و ادنی چیز ہے، گویا یہ ظاہر کرنا ہے کہ انسان ان چیزوں کا بھی تصور کر سکتا ہے جو مصنوعات فطرت سے زیادہ ارفع و اعلیٰ ہیں، اس میں شک نہیں کہ بت ساز کی آنکھ ان تمام خطوط کو دیکھ لیتی ہے جو ایک مکمل انسانی شکل تیار کر سکتے ہیں اور وہ سنگ مرمر کے ٹکڑے کی اس حد تک تراش خراش کرتا ہے کہ وہ اصل سے مشابہ ہو جائے، لیکن یہ اصل کیا ہے؟ وہی جس کا نمونہ سب سے پہلے فطرت نے طیار کیا تھا اور جس میں نقاش و مصور کوئی اضافہ نہیں کر سکتا -

مذہب نے سیکڑوں طویل اور تاریک صدیوں تک ہمیں یہی درس دیا کہ انسانی جسم ایک حقیر شے ہے جس میں انسانی روح مقید ہے چنانچہ اسی لئے وہ اپنے جسم کو بدنما و داغدار کر لیتے تھے اور ان پر کپڑے ڈال لیا کرتے تھے - جسم انسانی کے حسن کے متعلق مذہب نے سیکڑوں سال تک یہ تعلیم دی کہ وہ بری اور نفرت انگیز چیز ہے - اہل مذہب کی یہ عام تلقین تھی کہ جسم کی موت روح کی پیدائش ہے اور اس لئے مصور کا جسم میں زندگی پیدا کرنا روح کی موت ہے -

ہر چند یہ قدیم مذہبی تعصب انسان کے دماغوں سے آہستہ آہستہ محو ہو چکا ہے مگر اُس کے آثار ابھی تک پائے جاتے ہیں۔ یعنی ہر چند اب یہ کہنے کے لئے کوئی بھی طیار نہ ہوگا کہ تمام جسم ناپاک ہے مگر پھر بھی عام رواج اور وراثتی عقیدہ کی وجہ سے ہم کو یہ خیال ضرور رہتا ہے کہ اُس کا کچھ حصہ پاک اور کچھ ناپاک ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا کسی خاص حصۂ جسم کو چھپانا کسی فطری جذبۂ حیا کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ جس چیز کو ہم حیا کہتے ہیں وہ ہمارے رواج پوشش سے پیدا ہوئی ہے۔ اگر ہم اپنے دماغ سے وہ سب کچھ محو کردیں جو وراثت اور ماحول کا عطیہ ہے تو بھی ہمارے لئے یہ معلوم کرنا دشوار ہو جائے گا کہ کتنا پھر بھی باقی رہنا چاہئے کیونکہ رسم ورواج نے اکثر چیزوں کو اچھا بنا دیا ہے اور اکثر چیزوں کو بُرا۔ اسی لئے حقیقت دریافت کرنے کے لئے ہم کو فطرت کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔

حقیقی مصور اس نظریہ کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ انسانی جسم میں کوئی خط ایسا کھینچا جا سکتا ہے جو پاک اور ناپاک کو علحدہ کردے۔ بعض پرستاران حقیقت ایسے بھی ہیں جو ایک چیز کے حسن اور اُس کے نقائص کو دیکھتے ہیں اور اس فرسودہ سوال کا جواب دینے کی کوشش نہیں کرتے کہ اس کی پشت پر کوئی قادر مطلق قوت ہے یا نہیں۔ بلکہ وہ صرف اس نازک رشتہ کو چھونے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کی انفرادی زندگی کو اُس چیز سے ہم آہنگ بناتا ہے جس سے ان کو محبت ہے اور وہ بجز اس کے کچھ نہیں جانتے کہ زندگی کا ہر حصہ اچھا ہے۔

ایک سچا مصور، کسی انسانی شکل یا ڈھانچے میں تمام خوبصورتی نہیں دیکھ لیتا۔ وہ غروب آفتاب کی طرف دیکھتا ہے جو بادلوں کو گلابی بنا دیتا ہے اور اس کی سب سے بڑی تمنا یہی ہوتی ہے کہ اسی طرح کا منظر پیش کرسکے اُسے یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ وہ ایک ایسے غروب آفتاب کی تصویر کھینچ سکتا ہے جو تاریک ہو جانے والی دنیا کو روشنی پہونچانے والے سورج سے زیادہ بہتر ہو۔ وہ خاموش جھیلیں، سبزہ زاریں، اور بہنے والے چشمے یا خوبصورتی دیکھتا ہے۔ وہ آبشار اور پہاڑ کی چوٹی میں ایک عظمت دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ ان چشموں اور پہاڑ کی چوٹیوں سے (جنھیں فطرت نے بنایا ہے) زیادہ مکمل اور کوئی چشمہ یا پہاڑ کی چوٹی نہیں بنا سکتا۔

آرٹ کی ترقی کی طرح ادب کی ترقی بھی فرضی داستانوں سے فطرت وحقیقت کی طرف ہوئی ہے۔ ازمنۂ قدیم کے افسانے عام انسانوں اور عام مناظر سے متعلق نہیں ہوتے تھے۔ ایک ادیب کسی غلام کی عظمت نہیں دکھا سکتا تھا یا کسی غریب آدمی کا افسانہ نہیں بیان کر سکتا تھا۔ اُسے دنیا کے نظام موجودہ کی تائید میں اور بادشاہ کی مسرت کے لئے جو اُسے روزی دیتا تھا لکھنا ضروری تھا چنانچہ وہ بادشاہوں، ملکاؤں، سورماؤں عورتوں، جنگ اور فتوحات کے بارے میں لکھتا اور جو رنگ وہ استعمال کرتا وہ انسانی خون ہوتا تھا۔
دُنیا ان پرانے قصوں، جنگ وخون کے مناظر اور روح کو تھرا دینے والے افسانوں کی عادی ہو چکی ہے

اُس نے ان افسانوں کو اتنے عرصہ تک پڑھا کہ اب وہ ایک معمولی چیز اور کتاب کے لئے غیر موزوں معلوم ہوتے ہیں یہ واقعہ ہے کہ ایک افسانہ ہم کو اس وقت تک پسند نہیں آسکتا جب تک ہم اس کو کسی حد تک صحیح نہ تصور کریں۔ افسانہ کے افراد اور ان کی زندگیوں سے ہمیں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور ہم کو انکی کامیابی یا ناکامیابی کا خیال آنے لگتا ہے۔ اس لئے اس جذبہ سے بے نیاز ہو کر کوئی افسانہ نگار کامیاب نہیں ہو سکتا۔

بازیچۂ حیات میں ہر ایکٹر اپنی نگاہ میں اپنے آپ کو بہت اہم تصور کرتا ہے۔ جس دنیا سے وہ واقف ہے وہی اس کے گرد گردش کرتی رہتی ہے اور اُس کے نزدیک دنیا نام ہے صرف ان حالات کا جن کے ماتحت وہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ باہر کی متلاطم دنیا کو بالکل بھول جاتا ہے اور اسے یہ کبھی خیال نہیں ہوتا کہ اس وسیع دنیا میں وہ کتنی کم جگہ پُر کئے ہوئے ہے وہ مرجاتا ہے، اس کے چند غمخوار دوست چند دن تک اظہار افسوس کرتے رہتے ہیں اور پھر دنیا کو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ وہ کبھی تھا بھی یا نہیں۔ روز زندگی میں تقریباً ہر واقعہ معمولی ہوتا ہے مگر بعض دنوں میں کچھ خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم کھاتے ہیں، پیتے ہیں، کام کرتے ہیں، سوتے ہیں اور کبھی کبھی ہم کو دفعتاً ایک مسرت عظیم حاصل ہوتی ہے یا غیر معمولی صدمہ برداشت کرنا پڑتا ہے لیکن ایسے واقعے اولاً تو بہت کم ہوتے ہیں اور جو ہوتے بھی ہیں تو ان کا تعلق صرف ہماری ذات سے ہوتا ہے، ساری دنیا کو اس سے دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ پُرانے ناولوں میں فطری مناسبت و توازن کا لحاظ نہیں ہوتا تھا اور ہیرو وہیروئن کی اہمیت اتنی زبردست ہوتی تھی کہ تمام دنیا خاموشی سے اُس وقت تک دیکھتی رہتی تھی، جب تک محبت کرنے والوں کے دل اور ہاتھ نہ ملجاتے تھے۔ وسیع سمندر، وحشتناک جنگل، منجمد سمندر جب قسمت کے لکھے کے سامنے مجبور ہوتے تھے اور جب محبت تمام ناممکنات پر فتح پالیتی تھی تو قصہ ختم ہو جاتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ حقیقی زندگی میں محبت کے کارنامے بہت عظیم الشان ہیں اور بعض اوقات محبت کے نام پر بڑی بڑی خدمتیں انجام دی گئی ہیں، بڑی بڑی قربانیاں کی گئی ہیں لیکن زندگی کے دوسرے واقعات بھی کم دلچسپ نہیں ہیں۔

بہ سلسلۂ واقعہ نگاری ایسے افسانوں کے خلاف جن میں خواہشات انسانی کا ذکر ہوتا ہے احتجاج کیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو شخص ان خواہشات سے انکار کرتا ہے وہ انسانی زندگی سے انکار کرتا ہے جو لوگ ایسے افسانوں کی مذمت کرتے ہیں وہی ان عشقیہ قصوں کی حمایت کرتے ہیں جو عورت اور سوسائٹی دونوں کے لئے بہت زیادہ مضر ہیں۔

اس نوع کے قدیم عشقیہ افسانے ایک لڑکی کو یہ بتاتے تھے کہ کسی وقت وہ بھیس بدلے ہوئے شہزادہ سے ملیگی جس کو وہ اپنا نقد دل دے بیٹھے گی چنانچہ وہ سڑکوں پر ایسے شہزادہ کو ڈھونڈھنے نکلتی اور جتنا زیادہ وہ

بھیس بدلے ہوئے ہوتا اتنا ہی زیادہ اُسے یقین ہوتا کہ یہی وہ شہزادہ ہے مگر ایک حقیقت نگار، خواہشات اور محبت کی اُسی طرح مصوری کرتا ہے جیسی وہ دراصل ہیں۔ مرد اور عورت دونوں اپنی خوبصورتی، اپنے ڈر، اپنی صحیح پوزیشن کا احساس کرتے ہیں اور کسی ایسی گمراہی میں مبتلا نہیں ہوتے جس کا تعلق صرف تاویلات کی دنیا سے ہے۔

دنیا اب مبلغین مذہب اور ان کے مواعظ سے تنگ آچکی ہے اور اب اُسے حقایق کی ضرورت ہے وہ پریوں اور فرشتوں کے تذکرہ سے گھبرا چکی ہے اور اب وہ گوشت پوست کے انسانوں کی بابت دریافت کرنا چاہتی ہے۔ وہ زندگی کے حسن کو بھی دیکھنا چاہتی ہے اور اُس کے عیب کو بھی، وہ صرف شہزادیوں اور گروہ پتیوں کو ہی نہیں بلکہ مزدوروں، فقیروں، آقا اور غلام کو بھی دیکھنا چاہتی ہے۔

اعلیٰ انسانی ہستیاں حقایق زندگی سے پیدا ہوئی ہیں۔ ایک فلاسفر نہایت صحیح منطق کے ساتھ بحث کرسکتا ہے اور ہم کو دکھا سکتا ہے کہ دنیا کہاں پر غلطی کرتی ہے۔ اقتصادیات کا ایک ماہر ہمیں دولت اور غربت کی بابت جو ساتھ ساتھ چلتی ہیں بتا سکتا ہے مگر یہ سب نظریات ہیں۔ ڈکنس Dickens نے ایک مرتبہ کسی بڑے شہر میں ایک غریب خاکروب کو اپنی جھاڑو سے سڑک صاف کرتے دیکھا۔ اُس کے چاروں طرف عالیشان ایوان تھے، نفیس گاڑیاں تھیں، خوبصورت لباس تھے لیکن ان سیکڑوں مکانوں اور محلوں میں اس غریب خاکروب کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اُس کا گھر سڑک ہی تھی اور جب کبھی وہ ایک منٹ کے لئے رُک جاتا تو پولیس کا آدمی برہم ہوتا اور حکم دیتا کہ "آگے بڑھو" آخر کار اس "آگے بڑھو" سے مضمحل و پریشان ہوکر وہ ایک عالیشان عمارت کے زینہ پر بیٹھ گیا جو "انجیل مقدس کی تبلیغ" کے لئے تعمیر کی گئی تھی۔ جب ہم اُس بدنصیب اور پریشان حال خاکروب کا اس عیش و عشرت کے ہنگامہ میں خیال کرتے ہیں تو ہمیں دنیا کے اور ہزاروں لاوارث بچوں کا تصور پیدا ہوتا ہے اور ہم اس دنیا کی تمام نہاد تہذیب کو بُرا سمجھنے لگتے ہیں۔ ایک حقیقت شناس دولت و اقتدار کی پرستش کبھی نہیں کرسکتا اور نہ وہ دولت کی خاطر اپنے جذبات کی قربانی کرسکتا ہے۔

پرانے زمانے کے آرٹسٹ یہ خیال کرتے تھے کہ وہ ولیوں، فرشتوں اور دیوتاؤں کے فرضی افسانوں سے انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔ وہ جنگ کی تصویریں اس طرح کھینچتے تھے کہ سپاہیوں کی لانبی لانبی قطاریں وردی پہنے کھڑی ہیں اور ہر سپاہی خوش خوش نظر آرہا ہے۔ جنگ کا منظر ہمیشہ فتحمند کیمپ کا دکھایا جاتا تھا جس میں علم جنگ اپنے شوخ رنگوں کے ساتھ دشمن کے قلعہ پر لہراتا ہوتا تھا۔ گویا جنگ ایسی دلچسپ چیز ہے کہ ہر شخص کو اس کی خواہش کرنا چاہئے۔

برخلاف اس کے ورشگین Vereschagin بھی جنگ کی تصویر کھینچتا ہے لیکن

اس طرح کہ اس سے نفرت پیدا ہونے لگے۔ ایک ڈرامائی منظر، جہاں انسان کورانہ جوش سے مغلوب بندوقوں اور
توپوں کی آواز اور بہتے ہوئے خون سے پاگل ہو کر دوسرے کو مفلوج، مجروح اور قتل کرنے کی کوشش کر رہا
ہے۔ وہ میدانِ جنگ کا اس طرح نقشہ کھینچتا ہے گویا وہ قتل و غارت کا میدان ہے جہاں انسان اپنے خون
کی پیاس بجھانے کے لئے درندوں سے بازی لیجانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ وہ دشمن کون ہے
جس سے جنگ کی جاتی ہے؟ وہ بھی انھیں کی طرح انسان ہے جو ایک دوسرے بادشاہ کے فرمان پر اندھا دھند
اپنی جان دینے چلا آیا ہے۔ وہ ایسے غلام ہیں جن کے پاس کوئی زمین تک نہیں اور نہ جن کی جانبازی کا کوئی
صلہ۔ اختتامِ جنگ کے بعد کا منظر دیکھئے، ہر چہار طرف لڑائی کی تباہ کاریاں ہیں میدان پر ہر سمت خاموشی
طاری ہے اور صحرائی جانوروں کا تسلط ہے۔ ایک نوجوان سپاہی زمین پر پڑا ہوا ہے، چاروں طرف
برف گر رہی ہے ہر چہار سمت پہاڑوں کی سنسان چوٹیاں ہیں اور ہر جگہ جنگ کی تباہ کاری نظر آ رہی ہے
سپاہی [illegible] اس کے سینہ پر ایک سرخ نشان دکھائی پڑتا
[illegible] زندگی کا خون [illegible] تیر کی نوک ٹکسر جانے کی وجہ سے
بہ نکلا تھا [illegible] اقتدار کے خواب دیکھا کرتا تھا اور یہ سوچا
کرتا تھا کہ اس کی ساحرانہ طاقت کے سامنے [illegible] دنیا اطاعت قبول کرنے کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ جنگ و
جدل، فتحمندی اور شہرت کے خواب دیکھا کرتا تھا اور یہ سوچتا تھا کہ اگر وہ مر جائے گا تو اُس کے دوست اُس کی قبر کی
پرستش کریں گے۔ لیکن اب کوئی انسانی آنکھ اس کے دیکھنے کی بھی روادار نہیں اور جب برفباری کے بعد
گرمی کا زمانہ آئے گا تو کوئی شخص اس کی ہڈیوں کو بھی نہ پا سکے گا۔ اس جنگ کے منظر میں آثارِ زندگی اگر پائے
جاتے ہیں تو [illegible] انکار [illegible] اور صرف اس بات کا یقین کرنے کے لئے چکر لگا رہا
ہے کہ آیا یہ شخص واقعی مر چکا ہے یا نہیں۔ [illegible] گدھ نوجوان کی آنکھوں کی طرف دیکھتا ہے — وہ آنکھیں جن سے وہ
کبھی خود اس عظیم الشان دنیا کو دیکھا کرتا تھا اور جن پر کبھی اُس کی ماں نہایت اشتیاق سے بوسہ دیا کرتی تھی —
انھیں آنکھوں کو وہ گدھ اب اپنی غذا بنائے گا! — حقیقت یہ ہے کہ نہ تمام دنیا خوبصورت ہے اور نہ تمام زندگی
اچھی ہے۔ ایک سچے مصور کو اس کا استحقاق نہیں کہ وہ صرف خوبصورت مقام ہی کا انتخاب کرے اور ہم کو یہ
یقین دلائے کہ دنیا اسی کا نام ہے۔ اُسے جس طرح صداقت سے محبت ہے اسی طرح اُسے جھوٹ اور برائی کو بھی پیش
کرنا چاہئے۔ جس طرح وہ سچی مساوات کو پسند کرتا ہے اُسی طرح اُسے آقا اور غلام کی تصویر بھی کھینچنا چاہئے۔ اُسے
سچ کہنا چاہئے، سچ کو سچ ہی بنانا چاہئے حتیٰ کہ ایک بہرہ سننے لگے اور غبی سے غبی دماغ بھی اُس پر غور و فکر کرنے لگے۔

آگ اور خون سے کھیلنے والا ایک انسان

آگ — آگ — آگ — !!

یہی ایک کلمہ تھا جو ہزاروں خشک زبانوں پر جاری تھا اور روما کے گوشہ گوشہ میں گونج رہا تھا، لوگوں کے گلوں میں کانٹے پڑ گئے تھے، لب ہلانے کی بھی طاقت انہیں باقی نہ تھی، لیکن اب بھی ایک خشک "چیخ" کی صورت میں جو آواز پیدا ہوتی تھی وہ یہی تھی کہ — آگ — آگ !!

کامل تین گھنٹے آتشزدگی کو ہو چکے تھے لوگوں کے ہنگامہ و اضطراب، شور و شیون، کا یہ عالم تھا، گویا کرۂ زمین کا دل دھڑک رہا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کس وقت باہر نکل پڑے۔

آگ نے شہر کے تمام مکانوں اور معبدوں کو اندر باہر چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور دھوئیں کے بادلوں سے جو لال لال شعلے بلند ہو ہو کر نمودار ہو رہے تھے، تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پہاڑ سے خون کے فوارے چھوٹ رہے ہیں اور "رگِ سنگ" کا ہر ہر شرارہ لہو میں تبدیل ہو گیا ہے۔

مکانوں کی چھتیں عجیب و غریب دھماکے کی آواز سے گر رہی تھیں جس کے ساتھ بچوں، بڑھوں اور عورتوں کی چیخیں، ملکر ایسا ہیبتناک منظر پیش کر رہی تھی کہ اُسے سوائے خدا کے اور کوئی صبر و سکون کے ساتھ دیکھ ہی نہ سکتا تھا۔ شہر کے معابد اور وہاں کا قیمتی سامان، ہیکلوں کی قربانگاہیں اور وہاں کے مقدس ہدایا سب آگ کی نذر ہو چکے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آسمان و زمین کے سب سے بڑے دیوتا کے سامنے آج سب سے بڑی قربانی پیش کی جا رہی ہے۔

ٹھیک یہی وقت تھا کہ نیرون — روما کا شاہنشاہ اعظم — قصر کے اندر سے مسکراتا ہوا، اٹھکیلیاں کرتا ہوا برآمد ہوا۔ سیکڑوں خدام مشعلیں لئے ہوئے اس کے آگے آگے تھے اور امراء دربار زرق برق لباسوں کے ساتھ اس کے جلو میں — اس کی آنکھوں میں مسرت کی چمک تھی اور رخساروں میں خوشی کی لہک، لبوں پر اطمینان و سکون کا تبسم تھا اور رفتار میں عجیب و غریب "اندازِ گلگشت" — اس کے ہاتھ میں اس کا محبوب سرود تھا جس کے تاروں پر اس کی انگلیاں اس طرح چل رہی تھیں گویا اس سے

بہتر فرصت نغمہ اس کو کبھی مل ہی نہیں سکتی۔ شعلوں کی لپٹیں گویا اس کے لئے بادِ نسیم کے جھونکے تھے جو اسے مست کئے ہوئے تھے اور مخلوق کی چیخ پکار گویا نغمۂ الوہیت تھی جس کے ساتھ سرود کے تاروں کو چھیڑنے میں وہ سماوی سکون محسوس کرتا تھا۔

—— یہ واقعہ ۶۴ء کا ہے جبکہ روما پر حکمرانی کرتے ہوئے نیرون کا گیارھواں سال گزر رہا تھا۔

جب آگ کا دیوتا اپنی نذریں لیکر رخصت ہو گیا اور سارا شہر خاکستر کا ڈھیر نظر آنے لگا تو نیرون بھی اپنے قصر کو واپس آیا اور ہاتھ سے سرود رکھ کر مسند پر بیٹھ گیا جس کے سرخ اطلس کو فنیقیا کی خوبصورت لڑکیوں کے خوبصورت ہاتھوں نے بُنا تھا۔

نیرون نے امراء دربار سے مخاطب ہو کر کہا کہ — آج میں نے شہر روما کو خاک سیاہ کر کے واقعات عالم میں ایک ایسے واقعہ کا اضافہ کیا ہے جس کو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی اور جو تاریخ کے صفحات پر جلی سُرخ حروف سے لکھا جائے گا، لیکن اسی کے ساتھ میں روما کی خاک پر ایک اور دوسرا شہر بناؤں گا جس کے عظمت و جمال کے سامنے تم قدیم شہر کو بھول جاؤ گے۔

نیرون کی شخصیت کو تاریخ نے جس طرح پیش کیا ہے اس سے ہر شخص واقف ہے اور جہاں کہیں اس کا نام آتا ہے "آتشزنِ روما" کی صفت بھی ضرور استعمال کی جاتی ہے دنیا میں بڑے بڑے ہیبت و جبروت والے بادشاہ گزرے ہیں، ظلم و ستم سے کھیلنے والی بڑی بڑی ہستیاں گزر چکی ہیں، لیکن آگ اور خون کی جتنی پیاس نیرون کو تھی اتنی کسی کو نہ تھی۔

نیرون کی شخصیت صرف اپنی سنگدلی اور شقاوت و بیرحمی ہی کے لئے مشہور نہ تھی بلکہ مجموعۂ اضداد ہونے کی حیثیت سے بھی دنیا نے اسے حیرت کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نیرون مجموعہ تھا بہت سے ایسے آدمیوں کا جو ایک دوسرے سے بالکل متضاد طبیعت رکھتے تھے اور نہیں کہا جا سکتا تھا کہ خود اسے کیا سمجھا جائے۔

وہ حد درجہ سنگ دل تھا اور اتنا ہی رحیم المزاج، وہ بے انتہا غضبناک شخص تھا اور اتنا ہی محبت کرنے والا، وہ ایک مصلح تھا خرابات پسند، وہ ایک شاعر تھا دشمنِ شعر و شاعری، وہ ایک موسیقار تھا عدوئے نغمہ و موسیقی — الغرض یہ کچھ تھا نیرون جو روما کو آگ لگا کر سرود بجانے میں مصروف تھا۔

کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں کبھی لطف و کرم سے کام نہیں لیا، مگر صرف ایکبار لیکن اپنے لطف کا کتنا بڑا معاوضہ وہ پہلے ہی وصول کر چکا تھا اس کا حال ذیل کے واقعہ سے معلوم ہو گا۔

نیرون اپنے تخت پر جلوہ افروز ہے اور امراء چاروں طرف بیٹھے ہوئے ہیں، غلامانِ زرین کمر سیکڑوں کی تعداد میں تعمیل احکام کے لئے سر جھکائے ہوئے کھڑے ہیں اور فرطِ ہیبت سے قصر میں ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہے۔ دفعتہً اس کی شیر کی سی آواز بلند ہوتی ہے اور حکم دیتا ہے کہ شراب حاضر کی جائے۔

خدام میں ایک شخص یونانی الاصل بھی تھا جو اپنے آقا کے وطن اتینھس سے بھاگ کر یہاں آگیا تھا اور جسے نیرون نے آبدارخانہ کا داروغہ بنا دیا تھا اس کا نام دیوموس تھا۔

نیرون نے غلاموں سے کہا کہ "حاضرین کو خوب جام بھر بھر کر شرابیں پلاؤ کیونکہ آج کا دن میری انتہائی مسرت کا دن ہے اور آگ کے خوبصورت منظر سے جو سکر پیدا ہوا ہے اُسے اس قدر جلد ختم نہ ہونا چاہئے" پیا پے جام بھر بھر دئے جانے لگے، لوگوں نے خالی کرنا شروع کئے اور نشہ کی سرخیاں حاضرین کے چہروں پر دوڑ گئیں۔ لیکن دیوموس اس وقت موجود نہ تھا اور باہر آبدارخانہ کے انتظام میں مصروف تھا۔

نیرون کو دفعتاً خیال آیا اور اس نے پوچھا کہ "دیوموس آج یہاں نظر نہیں آتا، کہاں ہے"، جواب ملا کہ "باہر انتظام میں مصروف ہے"

یہ سنتے ہی نیرون کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں اور باڈی گارڈ کے افسر سے جو دروازہ پر کھڑا ہوا تھا مخاطب ہو کر کہا کہ۔ "کیا میں نے دیوموس کو حکم نہیں دیا تھا کہ وہ دعوتوں میں مجھے ہمیشہ اپنے ہی ہاتھ سے شراب پلائے۔ پھر وہ کیوں نہیں آیا۔ جاؤ اس ملعون یونانی کو ابھی پکڑ کر حاضر کرو"۔

دیوموس کانپتا ہوا سامنے آیا اور قدموں پر گر کر معافی چاہی کہ "میں نے عمداً یہ خطا نہیں کی ہے بلکہ باہر کے انتظام میں اتنا مصروف تھا کہ حاضری کا خیال دل سے نکل گیا۔

لیکن نیرون، جس نے آج تک کبھی کسی کا عذر نہیں سُنا تھا اس کا عذر کیوں سنتا۔ اس نے عصائے شاہی اُٹھایا اور اس زور سے اس کے سر پر مارا کہ خون کا فوارہ سر سے جاری ہو گیا اور وہ بیہوش ہو کر وہیں گر پڑا۔ نیرون نے حکم دیا کہ ہاتھ پاؤں باندھ کر اس کو ایک طرف ڈال دیا جائے۔ جب دعوت ختم ہونے کا وقت قریب آیا اور ہر شخص کے دماغ پر شراب پوری طرح مسلط ہو گئی تو نیرون نے حکم دیا کہ "دیوموس کو سامنے لایا جائے"، اور پھر جلاد کو بلا کر حکم دیا کہ اس کے دونوں ہاتھ کاٹ لے، چنانچہ جلاد نے اس کے دونوں ہاتھ تلوار کی ایک ضرب سے جدا کر دئے، اس حال میں کہ نیرون اور تمام امراء اس کی تکلیف اور تڑپ کو دیکھ دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے۔

— "کیا تمھیں بہت تکلیف ہے"

— "ہاں، یہ اذیت ناقابل برداشت ہے اور اس لئے میں نے تم سے کہا تھا کہ تم چھری لیکر میرا کام

کردو تاکہ اس عذاب سے مجھے نجات مل جائے۔

—— "لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ہم غلام سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور میرا فرض ہے کہ جس طرح ممکن ہو تمھیں زندہ رہنے دوں اور تمھاری خدمت کروں"

جس وقت دیوموس کے ہاتھ کاٹے گئے تو اس نے اپنے ساتھی ایک افریقی غلام سے کہا کہ تم مجھے ہلاک کر ڈالو کیونکہ اس زندگی سے موت بہتر ہے، لیکن اس نے اس پر عمل نہیں کیا بلکہ قصر کے ایک گوشہ میں لیجاکر اسکی خدمت و تیمارداری شروع کی یہاںتک کہ اس کے زخم اچھے ہوگئے اور رفتہ رفتہ تمام وہ کام جو ہاتھ سے کیا کرتا تھا، پاؤں کی مدد سے انجام دینے لگا۔۔۔ نیرون کا معمول تھا کہ کبھی کبھی وہ خود قصر کے مختلف حصوں میں جاکر دیکھا کرتا تھا کہ کون کیا کر رہا ہے، چنانچہ ایک دن اتفاق سے اس کا گزر وہاں بھی ہوا جہاں دیوموس پاؤں سے برتن صاف کر رہا تھا۔ نیرون اس کے سامنے کھڑا ہوگیا اور حیرت سے دیکھنے لگا کہ یہ کون ہے جو پاؤں سے ہاتھ کا کام لے رہا ہے۔ وہ بالکل بھول گیا تھا کہ دیوموس یہی ہے جس کے ہاتھ اس نے کسی وقت قطع کرائے تھے۔

نیرون نے محل واپس جاکے داروغہ کو بلایا اور پوچھا کہ یہ کون تھا جو پاؤں سے برتن صاف کر رہا تھا" اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا کہ" اے آقا یہ آپ ہی کا دیرینہ غلام دیوموس یونانی ہے، جس کے ہاتھ کاٹے جانے کا آپ نے حکم دیا تھا، موت اس کی قسمت میں نہ لکھی تھی اس لئے بچ گیا اور بدستور اپنے آقا کی خدمت میں مصروف ہے" نیرون یہ سنکر بہت متاثر ہوا (اسکی زندگی کا یہ بالکل پہلا اور آخری تاثر تھا) اور حکم دیا کہ دیوموس کو حاضر کیا جائے۔ دیوموس سامنے آیا تو نیرون نے اس سے مخاطب ہوکر کہا کہ" اے میرے بھائی اس میں شک نہیں کہ میں نے تمھارے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا تھا لیکن امید ہے کہ اب تم معاف کردوگے"۔۔۔ نیرون کی زندگی کا یہ بالکل پہلا واقعہ تھا کہ اس نے کسی سے معافی چاہی ہو۔۔۔ دیوموس اس کے قدموں پر گر پڑا اور بولا کہ" اے آقا، آپ میری جان کے مالک تھے اور ہیں، آپ نے جو کچھ کیا وہ بھی حق بجانب تھا اور اب جو آپ کرینگے وہ بھی بالکل درست ہوگا"

نیرون نے کہا کہ" آج میں تمھیں آزاد کرتا ہوں اور اپنے قصر کا محافظ مقرر کرتا ہوں،

یہ کہکر اس نے دیوموس کو رخصت کردیا اور متعدد غلام اس کی خدمت کے لئے مامور ہوگئے۔

اس کے بعد دس سال تک دیوموس اور زندہ رہا اور پاؤں سے کام کرنے کی ایسی مشق بہم پہونچائی کہ نقاشی، و بت تراشی میں بھی اس نے خاص شہرت حاصل کی چنانچہ اس نے نیرون کا بھی ایک مجسمہ طیار کیا جو نیرون کی خوابگاہ میں ہر وقت رکھا رہتا تھا۔ جب ۶۸ء میں نیرون کا انتقال ہوا تو یہ مجسمہ بھی توڑ دیا گیا لیکن دیوموس بدستور اپنی خدمت پر مامور رہا کیونکہ سارا روما اس کے کمال نقاشی کا معترف تھا۔

نہ اب نیرون باقی ہے، نہ دیوموس لیکن ایک کے ظلم و ستم اور دوسرے کے صبر و تحمل کی داستان ہنوز زندہ ہے۔ ممکن ہے نیرون کی روح اب بھی اس بات پر نازاں ہو کہ اسی کی وجہ سے روما کو اتنا بڑا صاحب کمال نقاش میسر ہوا۔

زندہ قوموں کی داستانِ زندگی

نباتات وحیوانات کی زندگی کا انحصار صرف اس قوت پر ہے جو فضا سے حاصل ہوتی ہے اور جس کا سب سے بڑا ماخذ آفتاب ہے۔ کرۂ زمین سے انسان کو جتنی قوتیں حاصل ہوتی ہیں خواہ وہ کوئلہ کی صورت میں ہوں یا پٹرول کی شکل میں، آبشاروں سے حاصل کی جاتی ہوں یا ہوا سے، سب آفتاب ہی کا صدقہ ہیں۔

آپ خشکی میں ہوائی چکیوں کو اور پانی میں بادبانی جہازوں اور کشتیوں کو چلتا ہوا دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہوا کی مدد سے ہو رہا ہے، لیکن ہوا کیا ہے؟ وہ ایک تلاطم ہے گیس کے سمندر کا جو آفتاب کے درجۂ حرارت کے اختلاف سے پیدا ہوتا ہے۔

آپ کوئلہ کو مشتعل کرتے ہیں اور اس سے قوت حاصل کر کے مشینوں کو حرکت دیتے ہیں، لیکن کوئلہ کیا ہے؟ وہ نتیجہ ہے آفتاب کی حرارت کا جو درختوں میں لاکھوں سال تک ایک کیمیائی قوت پہونچاتی رہتی ہے اور پھر ان کو زیر زمین دفن کر کے کوئلہ کی شکل میں تبدیل کر دیتی ہے۔ جس کو آپ پٹرول کہتے ہیں وہ بھی حرارت آفتاب ہی کے کیمیائی عمل کا نتیجہ ہے۔

اسوقت تک میکانکی طاقت حاصل کرنے کے سب سے بڑے ذریعے یہی دو ہیں۔ کوئلہ اور پٹرول، لیکن سوال یہ ہے کہ انسان کی بڑھتی ہوئی آبادی اور اس کی ذہنی رَو کا ساتھ دینے کے لئے یہ دونوں ذریعے کب تک کام دیں گے۔ یقیناً ایک وقت ایسا آئے گا جب کوئلہ کی معدنیں ختم ہو جائیں گی، پٹرول کے چشمے خشک ہو جائیں گے اور انسان کی بنائی ہوئی تمام مشینیں یک لخت ٹھہر کر رہ جائیں گی۔

ماہرین کی تحقیق وجستجو یہ ہے کہ زمین کی تمام معدنوں میں کوئلہ کی مقدار دو ہزار بلین ٹن ہے اور فی الحال سالانہ خرچ ایک بلین ٹن کا ہے۔ لیکن چونکہ اس کا خرچ ہر سال برابر بڑھ رہا ہے اس لئے اندازہ کیا گیا ہے کہ ایک ہزار سال کے اندر معدنوں کا تمام کوئلہ ختم ہو جائے گا اور یہ زمانہ انسان کے مستقبل کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ یہ اندازہ صرف اس صورت میں درست ہو سکتا ہے کہ کرۂ ارض کے تمام معدنوں کا کوئلہ حاصل کر لیا جائے، لیکن چونکہ بعض فنی و مالی دشواریوں کی وجہ سے اس کا امکان نہیں ہے۔

اس لئے ہزار سال سے قبل ہی کوئلہ کا قحط پڑ جانا لازم ہے۔

یہی وہ خطرہ تھا جس پر غور کرنے کے لئے برطانیہ کے مشہور کیمیا داں سر ولیم رمزے نے ۱۹۱۰ء میں بڑے بڑے ماہرین فن کی ایک کمیٹی ترتیب دی اور فکر ہونے لگی کہ علاوہ کوئلہ اور پیٹرول کے وہ اور کونسے ذرائع ہیں جن سے ہم مشین چلانے والی قوتیں پیدا کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سمندر کے مد وجزر کی طرف خیال گیا، زمین کی اندرونی حرارت پر غور کیا گیا، ہوا اور آبشار کی قوت پر فکر کی گئی، زمین کی حرکت محوری اور آفتاب کے چاروں طرف اس کی گردش پر نگاہ کی گئی بلکہ اس قوت پر بھی غور کیا گیا جو جواہر مادی کو باہم گر مربوط رکھتی ہے۔

آخر کار کافی بحث وگفتگو کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہر چند زمین کی اندرونی حرارت اور اس کی گردش محوری سے بھی قوت حاصل کیجا سکتی ہے اور ذرات مادہ میں جو قوت پنہاں ہے اس کا تو جواب ہی نہیں ہو سکتا، لیکن چونکہ اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے بڑا زمانہ درکار ہے اس لئے فی الحال پانی اور مد وجزر سے قوت حاصل کرنا مناسب ہوگا۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ اسوقت تمام پانی سے جتنی قوت حاصل کی جاتی ہے وہ ۷ کروڑ ٹن کوئلہ جلانے کے بعد میسر آسکتی ہے گویا دنیا میں اس وقت جتنی قوت سے کام لیا جا رہا ہے، یہ اس کی چوتھائی کے برابر ہے اگر دنیا کے تمام آبشار وغیرہ خواہ وہ قدرتی ہوں یا مصنوعی کام لیا جاسکے تو اس سے کہیں زاید قوت حاصل ہوسکتی ہے لیکن غالباً اس کا امکان نہیں ہے۔ مد وجزر سے قوت پیدا کرنے کی طرف اُنیسویں صدی سے اسوقت تک لوگ متوجہ ہیں اور حال ہی میں ایک طریقہ اس قوت کے حصول کا نکالا بھی گیا ہے لیکن اس کا عملی دائرہ صرف فرانس، انگلستان اور جرمنی کے اندر محدود ہے اور اس کی عام اشاعت اس لئے متعذر ہے کہ مصارف بہت آتے ہیں۔

سمندر سے قوت حاصل کرنے کا بھی ایک جدید طریقہ دریافت کیا گیا ہے اور اس کا انحصار اس نظریہ پر ہے کہ ان حصوں میں جو خط استوا کے نیچے واقع ہیں سطح بحر کی حرارت اس کی اندرونی حرارت سے بہت مختلف ہوا کرتی ہے اور اس اختلاف سے جو بخار پیدا ہوتا ہے اس کے دباؤ سے کہربائی قوت پیدا ہو سکتی ہے۔

آفتاب سے جو قوت خط استوا کے نیچے واقع ہونے والے حصص زمین کو پہونچتی رہتی ہے اس کا اندازہ فی گھنٹہ ہر مربع میٹر پر ۱۸۰ کالوری کیا گیا ہے یعنی اگر یہ قوت برابر آٹھ گھنٹے پہونچتی رہے تو فی مربع میل اتنی قوت حاصل ہو سکتی ہے جو ۴۰۰۰ ٹن کوئلہ جلانے کے بعد میسر آتی۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ کرۂ ارض کے ریگستانوں پر (جنکی پیمایش ۲۳۰۰۰۰۰ مربع میل ہے) آفتاب کی جتنی قوت بیکار جاتی ہے وہ تمام دنیا کی زغالی[1] قوت سے ۱۸۰۰ گنا زاید ہے۔

---

[1] زغال کوئلہ کو کہتے ہیں

چنانچہ اب ماہرین کے سامنے یہ اہم مسئلہ پیش ہے کہ آفتاب کی اتنی زبردست قوت کو کیونکر ضایع ہونے
سے بچایا جائے۔ اس کے لئے ایک طریقہ تو یہ سوچا گیا ہے کہ آئینوں اور محدب شیشوں کے ذریعہ سے حرارت
آفتاب کو جذب کرکے کسی ایک ظرف میں محدود کیا جائے اور یہاں سے اسے ایک معدنی مخزن میں پہونچایا جائے
جہاں اس سے بخار یا اسٹیم پیدا کی جائے، چنانچہ امریکہ میں اس کا تجربہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ایک گھنٹہ تک اس
طرح حرارت آفتاب حاصل کرنے کے بعد ۲۲۵ پونڈ کا دباؤ ایک مکعب انچ پر ڈال سکتے ہیں۔ لیکن اس طریق
سے صرف ان ممالک میں کام لیا جاسکتا ہے جو خط استوا کے نیچے واقع ہیں (غیر استوائی مقامات میں جہاں
آفتاب زیادہ تر گرد و غبار یا بادلوں میں چھپا رہتا ہے وہاں اس کا امکان نہیں ہے علاوہ اس کے ایک اعتراض
اس طریق پر یہ بھی کیا جاتا ہے کہ کسی وسیع حصۂ زمین پر پڑنے والی تمام شعاعوں کو ہم ایک مرکز پر نہیں لاسکتے
کیونکہ اسوقت تک جس پیمایش کے محدب شیشے طیار ہوسکے ہیں وہ شعاعوں کے پھیلاؤ کے لحاظ سے بہت چھوٹے
ہیں۔ تیسرا طریقہ آفتاب کی شعاعوں سے فایدہ اٹھانے کا وہی ہے جو خود فطرت نے اختیار کیا ہے۔ یعنی
نباتاتی خلایا جس طرح ہوا، مٹی اور پانی وغیرہ سے کاربن حاصل کرکے لکڑی اور اس کے بعد کوئلہ طیار کرنے کا
باعث ہوتے ہیں بلکہ اسی اصول پر ہم بھی حرارت آفتاب سے کوئلہ طیار کریں۔ ڈاکٹر برون کا تجربہ ہے کہ
سو مربع گز قطعۂ زمین صرف دو گھنٹے کے اندر نور آفتاب کی مدد سے اتنا ایندھن طیار ہوسکتا ہے جو ۴۵ پونڈ
کوئلہ کی قوت کے برابر ہو۔ چوتھا طریقہ یہ ہے کہ نور آفتاب سے براہ راست برقی قوت حاصل کی جائے
چنانچہ بعض کیمیائی اشیاء کی مدد سے اس میں بھی ایک حد تک کامیابی حاصل کی گئی ہے۔

الغرض اسوقت دنیا کے سامنے سب سے بڑا سوال حصول قوت کا ہے اور اس کے لئے وہ آسمان
و زمین کی ہر ہر چیز کو ٹٹول رہے ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ آیندہ یہ جستجو کس مرکز پر جاکر ٹھہرے گی۔ لیکن کیا یہ حیرت
کی بات نہیں کہ ٹھیک اسی وقت جبکہ عالم کے اندر تگ و دو کا یہ اضطراب برپا ہے اور ہر مہذب و تعلیم یافتہ
قوم حصول قوت و استعلا کے لئے صحرا کے ایک ایک ذرہ کو الٹ کر رکھدینے پر تلی ہوئی ہے۔ ایک قوم ایسی
بھی ہے جو اب تک سو رہی ہے اور سوتے رہنے پر صرف اس لئے مصر ہے کہ اگر اس کی آنکھ کھل گئی تو حور و قصور،
کوثر و سلسبیل کے نظارے آنکھوں سے اوجھل ہوجائیں گے۔ یہ بدنصیب قوم مسلمانانِ ہند کی ہے جن کی
سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ مذہب انسان کے لئے پیدا کیا گیا تھا نہ کہ انسان مذہب کے لئے۔ وہ
زندہ رہنا چاہتے ہیں صرف اس لئے کہ مذہب زندہ رہے اس لئے اب کہ دنیا سے مذہب رفتہ رفتہ ختم ہو رہا ہے
ان کا ختم ہوجانا بھی یقینی ہے اور مادر زمین کے لئے وہ وقت انتہائی مسرت کا ہوگا جب وہ اپنی گردن کو
لعنت کے اس طوق سے آزاد دیکھے گی۔

باٹا و باٹانگر

دُنیا میں آج وہ کون شخص ہے جو باٹا کے نام سے واقف نہیں، لیکن بہت کم لوگ اس سے آگاہ ہونگے کہ اس کی صنعت کی ترقی کا کیا راز ہے باٹا کا انتقال ہو چکا ہے اور عمر طبیعی تک پہونچنے سے قبل ہی۔ لیکن وہ تھوڑے ہی زمانہ میں اپنے کاروبار کو اتنا مضبوط کر گیا ہے کہ اسکی موت و زیست کا کوئی سوال ہی اس سلسلہ میں پیدا نہیں ہوتا۔

جوتا بنانے والے کارخانے ہزاروں لاکھوں دنیا میں قائم ہوئے اور ہونگے لیکن جتنی شہرت باٹا کو حاصل ہوئی وہ آج تک کسی کو نصیب نہ ہوسکی اور نہ اتنے وسیع پیمانہ تک اس کاروبار کو کوئی پھیلا سکا۔

جس وقت کسی کارخانہ کا نام لیا جاتا ہے تو ہم ذہن کی انتہائی وسعت سے کام لیکر زیادہ سے زیادہ یہ خیال قائم کرتے ہیں کہ وہ کوئی بہت بڑی عمارت ہوگی اور سیکڑوں مزدور اس میں کام کرتے ہونگے لیکن حقیقت یہ ہے کہ باٹا کا کارخانہ نام ہے کسی ایک عمارت کا نہ ایک درجن عمارتوں کا، بلکہ وہ عبارت ہے ایک ایسے شہر سے جس میں بیس ہزار سے زیادہ انسان بستے ہیں اور جن کا کام سوائے جوتا طیار کرنے کے اور کچھ نہیں ہے اچھا تو آیئے مختصر الفاظ میں اس شہر اور یہاں کے بسنے والوں کا بھی حال سُن لیجئے نیز یہ کہ باٹا کی ترقی کا راز کیا تھا۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسوقت دنیا کے تمام کارخانوں میں سرمایہ دار اور مزدور کا تعلق صرف اسقدر ہے کہ ایک محنت کرتا ہے اور دوسرا اس کی اُجرت ادا کرتا ہے اور اس کے علاوہ ان دونوں میں کوئی اور تعلق نہیں ہوتا۔ اگر سرمایہ دار اپنی کسی تجارتی اُپج (SPECULATION) کی وجہ سے تباہ ہو تو مزدوروں کو پرواہ نہیں ہوتی اور اگر مزدوروں کی جماعت کسی وجہ سے پریشان حال ہو تو سرمایہ دار کو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن سب سے پہلی چیز جس کی طرف باٹا نے توجہ کی اسی مغایرت و بے تعلقی کو دور کرنا تھا، کیونکہ یہ باہمی مغایرت نہ صرف یہ کہ اُصول انسانیت کے خلاف ہے بلکہ اکثر کارخانوں کے زوال کا باعث بھی ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے کام کا یہ اُصول قرار دیا کہ کارخانہ کے تمام کام کرنے والے خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے ایک دوسرے کے ساتھ مل جلکر رہیں گے اور سوسائٹی میں ان کو بالکل مساوات حاصل ہوگی،

دوسرے یہ کہ ہر کام کرنے والا علاوہ اپنی اُجرت کے نفع میں بھی شریک ہوگا، یعنی وہ صرف مزدور نہ ہوگا بلکہ کمپنی کا حصہ دار بھی ہوگا۔ اس سے ایک فایدہ تو یہ ہوا کہ عدم مساوات کی وجہ سے جو منافرت اونچے اور نیچے درجے کے کام کرنے والوں میں پیدا ہو جاتی ہے اور کام کی خرابی کا باعث ہوا کرتی ہے، دور ہوگئی اور دوسرے یہ کہ ہر شخص انتہائی جدوجہد اور پورے ولولۂ عمل کے ساتھ کام کرنے میں مصروف ہوگیا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ کمپنی ہی کے فایدہ میں اس کا فایدہ بھی مضمر ہے۔ یہ تھا اصل راز باٹا کی کامیابی کا، جس نے اسے دنیا میں اتنا مشہور کردیا۔ اب اسی کے ساتھ یہ بھی سنئے کہ مزدوروں کے ساتھ اس کا سلوک کیا تھا؟

سب سے بڑی چیز جس نے وہاں کے مزدوروں میں عزم و نشاط کی روح پیدا کی، تحریک مساوات ہے، جس نے تمام مزدوروں کو ایک رشتۂ اتحاد سے وابستہ کردیا ہے اور ان میں سے ہر شخص اپنے آپ کو ایک ہی خاندان یا قبیلہ کا فرد سمجھتا ہے۔ نہ ان کے لباس میں کوئی فرق ہے نہ مکان میں، نہ غذا میں عدم مساوات ہے نہ طریق معاشرت میں۔ جس طرح وہاں کا بڑے سے بڑا مینیجر زندگی بسر کرتا ہے اسی طرح وہ ادنیٰ مزدور جس کا کام صرف جوتوں میں کیل ٹھونکنا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ باٹا نے اور ذرایع بھی اس روح عمل کے قیام کے لئے اختیار کئے جن کا تعلق اُصول صحت و معاشرت سے ہے۔ چنانچہ اس وقت باٹانگر کی زاید از بست ہزار آبادی میں تمدن جدید کی وہ تمام چیزیں پائی جاتی ہیں جو دنیا کے کسی بڑے سے بڑے شہر میں ہوسکتی ہیں وہاں نہایت پاک و صاف ہوٹل ہیں، نفیس حمام ہیں، پاکیزہ تفرجگاہیں ہیں، سینما ہیں، تھیٹر ہیں ورزشگاہیں ہیں، جھیلیں ہیں، کشتیاں ہیں، مدرسے ہیں، تادیب گاہیں ہیں جہاں وہ، ان کی عورتیں اور اُنکے بچے بالکل فردوسی زندگی بسر کرتے ہیں۔

باٹانگر کا قانون بھی ایک خاص ہے جو باٹا نے وضع کیا ہے اور اس کی پابندی ہر شخص کرتا ہے چنانچہ وہاں کوئی شخص اس وقت تک نکاح نہیں کرسکتا، جب تک اس کی آمدنی وہاں کے مروجہ قانون کے مطابق نہ پائی جائے۔ اسی کے ساتھ ہر ہر مزدور کی آمدنی کا بجٹ طیار کیا جاتا ہے اور اس کو ہدایتیں کیجاتی ہیں کہ وہ اپنی آمدنی میں کیونکر اضافہ کرسکتا ہے اور روپیہ کا بہترین مصرف کیا ہے۔

یہاں ہفتہ میں صرف پانچ دن کام ہوتا ہے۔ اور جمعہ کی شام سے پیر کی صبح تک پورے دو دن اور تین راتیں سیر و تفریح میں بسر ہوتی ہیں اس فرصت میں کچھ لوگ پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں، کچھ فٹ بال وغیرہ میں مصروف ہوجاتے ہیں، بعض سائکلوں پر سوار ہوکر دور نکل جاتے ہیں اور بعض قہوہ خانوں کی زندگی سے لطف اُٹھاتے ہیں جہاں سوائے شراب کے ہر چیز کھانے پینے کی میسر آسکتی ہے۔ شراب اور شراب کی قسم کی کوئی چیز اس آبادی کے اندر نہیں پائی جاسکتی۔

مزدوروں کے لئے جو ہوٹل یہاں طیار کئے گئے ہیں وہ بالکل جدید طرز کے ہیں اور حفظانِ صحت کے نہایت ہی مکمل اُصول پر قائم ہیں۔ حتےٰ کہ برتنوں کو صرف بھاپ سے صاف کیا جاتا ہے اور کوئی شخص انہیں ہاتھ نہیں لگاتا۔ ان ہوٹلوں کی وسعت و خوبی اہتمام کا یہ عالم ہے کہ دس منٹ کے اندر چار ہزار آدمیوں کے سامنے کھانا آجاتا ہے۔ بچوں کے ناشتہ کے لئے جن کو کوئی ثقیل غذا نہیں دیجا سکتی، توس اور صاف دودھ فراہم کیا جاتا ہے جس کی قیمت ایک آنہ سے زیادہ نہیں ہوتی اور دوپہر کا کھانا ایک جوان آدمی کا پانچ چھ آنے میں ملجاتا ہے۔

یہاں کی تماشہ گاہوں اور سرود خانوں میں صرف وہی چیزیں پیش کی جاسکتی ہیں جو انسان کے جذبۂ عمل کو ابھارنے والی ہیں۔ سینما کا ٹکٹ دو آنے سے زیادہ نہیں ہے اور یہاں صرف وہی فلم دکھائے جاسکتے ہیں جو معلومات میں اضافہ کرنے والے ہیں۔ عشقیہ فلم یا ایسے فلم جن میں جرائم وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے یہاں داخل ہی نہیں ہوسکتے۔

یہاں ایک وسیع حدیقۂ حیوانات بھی ہے جہاں لوگ جاکر وحوش وطیور کی طبیعی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں متعدد شفاخانے بھی ہیں، جہاں جدید ترین آلات و ذرایع سے لوگوں کا علاج کیا جاتا ہے۔

باٹا نے اخلاقی حالت کی طرف بھی کافی توجہ کی، چنانچہ وہاں رات کو مقررہ وقت کے بعد کوئی لڑکی یا عورت گھر سے باہر نہیں نکل سکتی اور اگر کوئی اس حکم کی خلاف ورزی کرے تو اسے سزا دیجاتی ہے۔

عبادت کے لئے یہاں گرجا بھی ہیں اور جلسوں کے لئے لکچر ہال بھی، جہاں لوگ جمع ہوتے ہیں اور تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ یہاں کے بازاروں میں عمال کی تمام ضروریات پائی جاتی ہیں اور مقررہ ارزاں قیمت پر فراہم کی جاتی ہیں۔

باٹا کے کارخانوں میں نہ صرف جوتا بلکہ وہ تمام چیزیں طیار کی جاتی ہیں جن کا تعلق اس صنعت سے ہے۔ دباغت کے کارخانہ میں چونکہ بُو زیادہ ہوتی ہے اس لئے ایک خاص قسم کے نقاب طیار کئے گئے ہیں جن سے چہرہ چھپالیا جاتا ہے اور شامہ بدبو سے محفوظ رہتا ہے۔ یہاں ایک مطبع بھی ہے جس سے ہفتہ میں تین بار باٹا گزٹ شایع ہوتا ہے اور تمام ممالک کی سیاسی وتجارتی خبریں عمال تک پہونچاتا ہے۔

خود باٹا کی محنت کا یہ عالم تھا کہ وہ ۱۴ گھنٹے مسلسل روزانہ کام کرتا تھا اور تھکنا نہ جانتا تھا ——— ہندوستان میں بھی ایک دو نفوس اس عزم وارادہ کے ہوئے ہیں جن کا حال ہم آیندہ اشاعت میں بیان کریں گے۔

ریڈیو سننے والے

(لاسلکی نشرگاہ دہلی سے ۲۹ مئی ۱۹۳۶ء کو نشر کیا گیا)

خدا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سنتا سب کی ہے کرتا اپنی جیسی ہے۔ ریڈیو سننے والوں کا حال یہ ہے کہ وہ سنتے سب کی ہیں اور کر کچھ نہیں پاتے، غالب کو بھی یہی دقت پیش آئی تھی لیکن وہ تو یہ کہکر صاف نکل گئے۔

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی!

لیکن آپ کو تو معلوم ہے جب آدمی کچھ کر نہیں پاتا تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے یا اس کے بندوں کو گالی دینے لگتا ہے مگر اب زمانہ اتنی ترقی کر چکا ہے کہ آدمی کو اللہ کا شکر ادا کرنے کی نہ تو فرصت ہے اور نہ ضرورت، چارناچار گالی سے جی بہلاتا ہے۔ اس میں ریڈیو والوں کا کوئی قصور نہیں ہے ان کی کمزوری ضرور ہے۔ وہ ہر ایک کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ بعض لوگ خوش ہونے سے شرماتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ خوش ہونے سے کھانا کم ہضم ہوتا ہے۔ ریڈیو سننے والے بھی اکثر قابل رحم ہوتے ہیں۔ اول تو یہی کیا کم آفت ہے کہ ان کی کوئی نہ سنے اور وہ سب کی سنتے جائیں۔ اس لئے اگر اگر وہ کبھی کبھی اول فول بکنے لگیں یا بکنے لگ جائیں، (بکنے لگیں یا بکنے لگ جائیں دونوں صحیح ہیں۔ بشرطیکہ آپ پہلے یہ دریافت کرلیں کہ بکنے والا کون ہے) یا چہرہ ایسا بنائیں جیسے کوئی اناڑی کی طرح سوڈا واٹر چڑھا جائے اور ڈکار آنے والی ہو تو مہذب بننے کی کوشش کرے تو ان کو معاف کر دینا چاہئے۔

ریڈیو سٹ ابھی ہندوستان میں عام تو ہوا نہیں ہے اس لئے جس کسی کے پاس اس قسم کا سٹ ہے اس کو وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جیسے کسی گاؤں میں پہلے پہل اونٹ آیا لوگوں نے کہا بھگوان آئے۔ آپ معاف فرمائیں اونٹ اور بھگوان والی مثل کا میں مصنف نہیں ہوں۔ یہ روایت صرف بزرگوں سے سنتا آیا ہوں۔ میں سچ عرض کرتا ہوں میں نے نہ تو اونٹ قسم کا بھگوان دیکھا نہ بھگوان قسم کا اونٹ البتہ ان اقسام کے آدمی ضرور دیکھے ہیں۔ بہت ممکن ہے آپ ہی کے آس پاس کوئی صاحب اسی قسم کے بیٹھے ہوں۔ لیکن آپ گھبرائیں نہیں وہ جس کل بیٹھ گئے ہوں گے بیٹھے ہوں گے۔ پھر اونٹ کی صحبت کچھ بری بھی نہیں۔ بشرطیکہ آپ اس وقت کسی اونٹ گاڑی کی اوپر والی منزل پر نہ بیٹھے ہوں۔ معاف کیجئے گا ریڈیو سننے

کے بارے میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس وقت کہاں اور کس حال میں ہوں گے۔ میں نے احتیاطاً اونٹ گاڑی کا نام لے دیا ورنہ کجا آپ اور کجا اونٹ۔ پورب کی مثل تو آپ نے سنی ہوگی دودھیلی گائے کی دولات بھی برداشت کرنا چاہئے۔ اور اونٹ کا حال تو آپ جانتے ہیں اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اونٹ اور گائے دونوں الہامی جانور ہیں جن سے ذرا دور ہی رہنا بہتر ہے۔

اچھا دیکھئے وہ صاحب جو سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان سے تو آپ واقف ہی ہوں گے۔ ان کی آنکھ دیکھئے دونوں مصنوعی ہیں کہنے کا مطلب یہ کہ بٹن جیسی یعنی پتھرائی ہوئی۔ یہ گانا جانتے نہیں۔ لیکن ان سے زیادہ گانا سمجھنے کی کوشش کرنے والا شخص میں نے نہیں دیکھا ہے۔ گانا سنتے وقت ان کا پیٹ پھولنے لگتا ہے اور شکل چوروں جیسی ہوجاتی ہے یہ پوچھا جاتا ہے حضور گانا کیسا تھا؟ اگر جواب دیتے ہیں گانا کون سن رہا تھا، پوچھا گیا حضرت کس فکر میں تھے بولے کنجی نہیں بھول آیا۔ تلاش میں نکلا، پھر سوچا ریڈیو ہی سنتے چلیں اور کیوں جی یہ جو گا رہا تھا کوئی عورت تھی یا مرد، میں نے کہا نہ عورت نہ مرد، گراموفون تھا۔ کہنے لگے جب ہی تو سوچتا تھا کہ آواز کبھی کی سنی ہوئی ہے لاحول ولاقوۃ۔

ریڈیو سننے والوں کو ایک جگہ بیٹھا دیکھ کر مجھے اکثر کونسل یا اسمبلی کا اجلاس یاد آجاتا ہے یعنی پروگرام جاری ہے لیکن حاضرین اپنے اپنے حال میں مست ہیں کوئی ہنس رہا ہے کوئی بول رہا ہے کسی کو بولنا نہیں آتا تو کڑھ رہا ہے کوئی اونگھ رہا ہے کوئی کسی ایسے مقام کی تلاش میں ہے جہاں نہ اس کو کوئی دیکھ سکے اور نہ اُس کی سن سکے کوئی آمادہ فوجداری ہے تو کوئی آمادۂ وفاداری۔

میرا تجربہ تو یہ ہے کہ بعض لوگ ریڈیو کے بہانے شربت یا پانی سگرٹ سے شغل کرنے آتے ہیں اور چلتے وقت یہ کہکر دل بڑھا جاتے ہیں کہ آپ کا ریڈیو اچھا ہے فرصت ہوئی تو کبھی پھر سنوں گا، اچھا پروگرام ہوا کرے تو اطلاع بھجوا دیا کیجئے۔ ریڈیو کے بعض مالک خود ریڈیو نہیں سنتے بلکہ ریڈیو سننے والوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں اور اُن کو اُس نظر سے دیکھتے ہیں جس نظر سے اللہ تعالیٰ اپنے کمزور بندوں کی دوڑ دھوپ، مکر وفریب، رنج وراحت دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے۔ وہ سوچتے ہیں دیکھئے کیسی معمولی چیز کو یہ شخص کس انہماک یا دلچسپی سے سن رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی کیسا کارساز ہے۔ اپنے کمزور بندوں کی حاجت روائی مجھ سے کراتا ہے، اچھا خوب لطف اُٹھائیے قبل اس کے کہ تو اس دُنیا سے اُٹھ جائے ناداں کھلونے کھیلنے والا جانور!

بعض سننے والے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر مجھے بے اختیار محسوس ہوتا ہے کہ یہ شخص بیوی سے لڑکر آیا ہے۔ ورنہ یہاں سے جاکر ضرور لڑے گا۔ ایسے اشخاص ریڈیو کا سارا پروگرام سن جائیں گے لیکن کانوں کے ذریعہ نہیں نتھنوں کے راستے۔ وہ بھی اس طور پر گویا براڈکاسٹنگ اسٹیشن والوں کو چیلنج دے رہے ہیں بس میرا

تم نے کیا بگاڑ لیا۔ ہاتھی جھومتا جائے کتا بھونکتا جائے حالانکہ آپ یقین مانئے اس میں اور ہاتھی میں سوا سونڈ کے اور کوئی چیز ملتی جلتی نہیں پائی جائے گی۔

میرے ایک دوست ریڈیو اس طور پر سنتے ہیں جیسے کوئی مذہبی شخص ہو جس کا گناہ کرنے کا جی چاہتا ہو لیکن گناہ کرنے کی نہ اہلیت ہو نہ ہمت۔ ان کا جی تو بہت چاہتا ہے کہ ریڈیو سنیں لیکن ڈرتے اس سے ہیں کہ کوئی ریڈیو سنتے دیکھ لے تو اللہ میاں سے نہ کہہ دے۔ یا کوئی مولوی کافر نہ قرار دیدے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کو کافر بننے میں عذر نہیں ہے۔ البتہ ایک کافر سے جو توقعات خوش مذاق لوگ کرتے ہیں وہ ان کے بس کی نہیں اس لئے کفر سے ڈرتے ہیں۔ سب سے زیادہ دلچسپ سننے والے میاں بیوی ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ دو چار بچے بھی موجود ہوں۔ فرض کیجئے کوئی محترمہ گا رہی ہیں۔ میاں کو غور سے سنتے دیکھ کر بیوی کے کان کھڑے ہوئے بولیں کیسا بُرا گا رہی ہے، میاں بولے ہاں لیکن آواز سے کم سن معلوم ہوتی ہے۔ بیوی چمک کر بولیں دلی نہیں چلے جاتے، میاں نے کہا تھوڑا اور سن لیں تو رائے قائم کریں استنے میں کسی خاموش بچے کو دیکھ کر بولیں، باہر جا کر کھیلتا کیوں نہیں۔ یہاں پڑا کیوں سڑ رہا ہے۔ اُس نے بھی کہدیا بھوک لگی ہے، ماں بولیں، باپ گانا سنیں، بیٹے کھانا ٹھونسیں اور میں ساری مصیبتیں جھیلوں۔ یہ ریڈیو جب تک جہنم رسید نہ ہوگا۔ اس گھر میں چین آرام دیکھنے نہیں ملے گا۔ اس اثنا میں کسی منچلے چھوٹے بچے نے لپک کر ریڈیو سٹ کی کوئی گھنڈی گھما دی۔ ریڈیو کا سانس تلے اوپر ہونے لگا۔ بیوی بچے پر جھپٹیں، بچے نے باوا کی پناہ پکڑی، باوا ریڈیو کی حفاظت کے لئے بڑھے۔ آخر میں مطلع صاف ہوا تو معلوم ہوا کہ باوا کی عینک بیوی کی زلف میں جھول رہی ہے اور بیوی کا بُندا باوا کی داڑھی سے پینگیں بڑھا رہا ہے بچوں نے تالیاں بجائیں اناونسر نے پکارا فلاں صاحبہ عورتوں کے حقوق پر گفتگو فرمائیں گی۔ بات آئی گئی ہوئی۔

ایک دن بازار سے گزر رہا تھا، ایک دوکان کی بالائی منزل پر ریڈیو سٹ تانیں اُڑا رہا تھا۔ نیچے مجمع تھا، یکہ بان تانیں سیکھنے کی مشق کر رہے تھے۔ بوڑھی عورتیں کھانس رہی تھیں اور کلجگ کو کوس رہی تھیں، فقیر بھیک مانگ رہے تھے، بچے گولی کھیلتے تھے، بوڑھے مرد قیامت کے منتظر تھے، نوجوانوں پر قیامت گزر رہی تھی۔ یہ سب کھیل ریڈیو کا تھا۔ ناگاہ ایک طرف گلی سے کوئی بے فکرا نکلا، صرف لنگوٹی بندھی ہوئی، مانگ نکلی ہوئی۔ منہ سے طبلہ بجاتے ہوئے۔ ایک یکہ بان کو دیکھ کر نعرہ لگایا، بیٹا گھوڑا بیچو نہیں جوانی مفلسی ہی میں کٹ جائے گی۔ بوڑھے کو دیکھا بولے، بابا کمر سیدھی کرنے کھڑے ہوگئے، گنگا اشنان کرو بال کالے ہو جائیں گے، بڑھیوں کو دیکھ کر کہنے لگے مائی جی سلام تم بھی کس سمے نکل پڑیں ابھی مائی جی پورے طور پر گالیاں بھی ختم کرنے پائی تھیں کہ ہمارے دوست نے ایک نوجوان عورت کو مخاطب کر کے تان لگائی آؤ آؤ نگریا ہماری۔ ایک بچے نے پکارا کلن دوست آؤ آج ہمارے ساتھ گولی کھیلو کتنے دنوں سے تم نہیں کھیلے استنے میں سارے لڑکے کلن کو جھپٹ گئے، کسی نے کہا گولی کھیلو، کسی نے کہا کندھے پر

بٹھاؤ کلن نے ایک کو کندھے پر بٹھالیا دوسرے کو کیے پر بٹھادیا، تیسرے کو اُٹھا کر ایک موٹے تازے بنئے کی گردن سے چپکا دیا، چوتھے کی دونوں ٹانگیں مضبوط تھام کر سر سے بلند کیا اور مرغے کی آواز بلند کی، سامنے سے پولیس کا سپاہی آتا نظر آیا مسٹر کلن نے ایک لڑکے کو دوکان کے سامنے کے ٹین کے چھجے پر پھینکا، چھجا نیچے آرہا، اسٹیل ٹرنک کی دوکان تھی سارے ٹرنک ایک دوسرے پر گرے، بھگدڑ مچ گئی، ریڈیو سننے والے ہنستے، بولتے، روتے، گالی دیتے، کھانستے، پھلانگیں مارتے یا لنگڑاتے اپنے اپنے راستے لگے اور مسٹر کلن یہ جا وہ جا غائب!

ریڈیو سننے والوں میں سب سے دلچسپ جماعت بچوں کی ہوتی ہے۔ میرا سابقہ ایسے بچوں سے ہے جو گانا یا تقریر سمجھنے کے بجائے ان کی نقلیں کیا کرتے ہیں۔ ایک ہی کمرہ میں ہر بچے نے ریڈیو سٹ لگا رکھا ہے، جوتے کے خالی کاغذی بکس میں ایک چوڑا گول سوراخ بنا کر سُرخ کاغذ لگا دیا ہے۔ یہ اصلی ریڈیو کے اس حصہ کا جانشین ہے جو گھڑی نا سامنے ہوتا ہے۔ نقلی ریڈیو کو کمر بند کے ذریعہ کھونٹی پر لٹکا کر ایریل کا کام لیا گیا۔ اب ریڈیو کے مالک کھڑے ہو کر پکارتے ہیں، دلی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے شیخ نیازی ستار بجائیں گے۔ اب شیخ صاحب منھ سے ستار بجا رہے ہیں۔ دوسرے نے پکارا دلی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے سلمیٰ نعت سنائیں گے، نعت بھی شروع ہوگئی، عذرا دلی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے بچوں کی تعلیم پر تقریر کریں گی، تقریر بھی شروع ہوگئی، اقبال نے آواز دی دلی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے اقبال انگریزی خبریں سنائیں گے، خبریں بھی آنی شروع ہوگئیں احسان نے نعرہ لگایا۔ دلی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے احسان بھجن سنائیں گے بھجن بھی شروع ہوگئے، اتنے میں ایک صاحب کا جو ابھی پر ہی تول رہے تھے، ریڈیو زمین پر آرہا انھوں نے چیخ چیخ کر بغیر پروگرام بتائے انگلش میوزک اور ہندوستانی پکا گانا ساتھ ساتھ شروع کر دیا، پورے، پورے کمرے میں .R.A.S آرکسٹرا بج رہا تھا کہ دفعتاً مریخ براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے آواز آئی، قہرن اب خر بڑے تقسیم کریں گی۔ اس خبر نے آرکسٹرے کو آناً فاناً درہم برہم کر دیا۔ اب جو دیکھتے ہیں تو کسی کا ریڈیو کمر بند کے ساتھ چلا آرہا ہے، کسی کا پاجامہ ہاتھ میں ہے اور کمر بند کھونٹی پر، کسی کی نعت نتھنوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ اور کسی کی بھجن گلے میں اٹکی ہوئی ہے۔ کسی کا ہاتھ خر بڑے پر اور کسی کی گردن قہرن کے ہاتھ میں!

سننے والے ہر قسم کے ہوتے ہیں امیر، غریب، مرد، عورت، جاہل، تعلیم یافتہ، معقول، نامعقول، تندرست، مریض، فلسفی، چور۔ غرض کہاں تک تفصیل بتائی جائے، سنانے والے بھی اسی قسم کے ہوتے ہوں گے قطع کلام ہوتا ہے میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ممکن ہے سنانے والوں میں بعض اقسام نہ ہوتی ہوں گی۔ مثلاً چور یا کوئی اور، لیکن آپ اس کی ذمہ داری کیسے لے سکتے ہیں کہ کب وہ سنانا ختم کر دیں گے اور چوری نہ شروع کر دیں۔ بالفرض چوری نہ بھی شروع کریں تو قیافے سے چور معلوم ہوتے ہوں گے یہ بھی نہ سہی تو میری ہی غلطی سہی۔

غلطی انسانوں ہی سے ہوتی ہے خواہ وہ چوری ہی کیوں نہ ہو۔

پکے گانے سُنکر بعض لوگوں کو وحشت ہونے لگتی ہے لیکن جو اصحاب گانے کے فن سے واقف ہیں ان کو میں نے دیکھا ہے اس قسم کے گانے سے بے حد لطف اُٹھاتے ہیں۔ میرے ایک دوست ہیں جن کو میں نے دنیا اور دنیا داروں سے بہت کم مطمئن اور خوش پایا ہے لیکن جب سے ریڈیو شروع ہوا ہے ان کی ذہنی زندگی بالکل بدل سی گئی ہے۔ ایک دن کسی قدر بشاش ہوکر فرمایا، دنیا ابھی رہنے کے لائق ہے۔ ہندوستان میں اچھے گانے بجانے والے اب بھی موجود ہیں۔ میں نے کہا اس قسم کا گانا بجانا ہوا کرے تو فدوی کو بھی یاد فرمالیا کیجئے چنانچہ ایک دن مجھے انھوں نے ایک صاحب کا گانا سنایا۔ میں نے کہا حضرت یہ گانا ہے یا ہسٹریا، بگڑ کر بولے جہنم میں جاؤ، چھوکریوں کی چیں چیں اور ریں ریں سنا کرو تمھاری کئی پشت گانا نہیں سمجھ سکے گی۔ بہرحال میں نے ان کو اس گانے پر اونگھنے دیا اور خود بھاگ کھڑا ہوا لیکن اب اس امر کا بھی لحاظ رکھیں کہ میرے ان دوست کی عمر چالیس سال سے زاید نہیں ہے اور بیوی سے ڈرتے ہیں۔

ریڈیو کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے ہر شخص کے دوستوں اور عزیزوں کے دائرہ کو وسیع کر دیا ہے۔ کم سے کم میں تو یہی سمجھتا ہوں۔ مقررہ وقت پر ریڈیو نے ہماری توجہ ہر طرف سے ہٹا کر اپنی طرف مائل کرلی، اناؤنسر کی آواز خاندان کے کسی دوست کی آواز کی طرح کانوں میں آئی طبیعت خوش ہوگئی لیکن ظاہر ہے یہ تعلق اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب اناؤنسر بار بار نہ بدلے جائیں۔ زمانہ گزرنے کے بعد اناؤنسر کی وہی حیثیت ہو جائے گی جو گھر کے ڈاکٹر یا ڈاکیے کی ہوتی ہے جس کی آواز پر گھر کا ہر چھوٹا بڑا دوڑتا ہے اس سے ایک قسم کی یگانگت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت براڈکاسٹنگ اسٹیشن کے بعض بات چیت کرنے والوں کے ساتھ پیدا ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ ایسی بات چیت کریں جس سے لوگوں کا دل بہلے۔ بات چیت سے مراد گھریلو قسم کی بات چیت سے ہے مثلاً کچھ بچوں کی باتیں کچھ ہنڈیا ڈوئی — کچھ ہنسی ٹھٹھول، رشتے ناتے، آمدنی خرچ، مہمانوں کا آنا جانا، تیج تیوہار، موسم کا حال، سیر و تفریح کے ذرایع اور وسایل، میٹھی میٹھی ہمدردی یا دل بہلانے کی باتیں۔ میرے کہنے کا منشا یہ ہے کہ کوئی مستقل آدمی ایسا ہو جو براڈکاسٹنگ کا نہیں بلکہ صحیح معنوں میں سننے والوں کا آدمی ہو یعنی اسکو وہی حیثیت حاصل ہو جو اپنے گاؤں میں رپ وان ونکل کو حاصل تھی یعنی عورت، مرد، کتے، بچے سب کے دوست ہیں۔ اور سب کے معتمد اپنے کام کے علاوہ سب کا کام کرتے ہوں، موسم وقت، عمر رنج راحت کسی کی قید نہیں۔

رشید احمد صدیقی

بین الاقوامی مزدور پارٹی کی تاریخ

اس میں شک نہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام، اقطاعی دور (Feudalage) سے زیادہ ترقی یافتہ چیز ہے اور انسانی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس عہد میں انسان نے جتنی ترقی کی ہے، اتنی اور کسی عہد میں نہیں کی۔ یہی وہ عہد ہے جس میں ریل، تار، بجلی اور مشینری کی ایجاد ہوئی، اور عہد عتیق کا وعدۂ فردا، حال میں تبدیل ہو گیا۔ یہی وہ عہد ہے جب تجارتی مسابقت اس صورت سے دنیا کے سامنے آئی کہ امن وسکون ایک مسئلہ لاینحل ہو کر رہ گیا، اور ذاتی ملکیت و سرمایہ داری سے عام بیزاری پیدا ہو گئی اور یہی وہ عہد ہے جبکہ ایک طرف سوسائٹی کے چند افراد دنیا کو فردوس بریں بنائے ہوئے ہیں اور اکثر افراد پریشانی و اضطراب میں مبتلا ہیں۔ اور یہی وہ احساس تھا جس نے محنت کش جماعت کو سرمایہ داری کے خلاف باقاعدہ تجاج شروع کرنے پر مجبور کیا۔

انسانی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آج تک انسان کو مختلف ادوار سے گزرنا پڑا ہے اور ہر آئندہ دور اپنے ماسبق دور سے زیادہ ترقی یافتہ رہا ہے۔ ایک زمانہ اس انسان پر ایسا بھی گزر چکا ہے جب وہ جنگلوں میں خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرتا تھا اور صرف شکار پر اس کی حیات منحصر تھی، اس کے بعد آہستہ آہستہ اس نے ترقی کی یہاں تک کہ اقطاعی دور شروع ہوا یعنی انسان، انفرادی اقتدار حاصل کرنے کی طرف مایل ہوا اور سوسائٹی دو مختلف الخیال جماعتوں یعنی کسانوں اور زمینداروں میں منقسم ہو کر رہ گئی۔ اسکے بعد انسان کی ذہنی ترقی کا نمایاں دور شروع ہوتا ہے، اس نے مشینری طیار کی اور اقطاعی دور ختم ہو کر کسانوں کی جگہ مزدوروں نے لے لی۔ مگر دور ترقی اب بھی اسی رفتار سے جاری ہے اور چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کی جگہ بڑے سے بڑے سرمایہ دار لے رہے ہیں۔ ان میں بھی باہم تصادم ہوتا ہے اور ایک کی کمزوری سے دوسرا فایدہ اُٹھاتا ہے۔ جس کا دوسرا نام ملوکیت ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ آج کی ملوکیت پرانے زمانے کی ملوکیت نہیں ہے جو شخصی استبداد سے تعلق رکھتی تھی بلکہ اس کا تعلق تجارت و اقتصاد کی شاہنشاہی سے ہے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر تمام دنیا ایک بازار ہو کر رہ گئی ہے اور نظام حکومت

ایک سرمایہ دار تاجر۔ اس تجارتی تصادم اور اقتصادی کشمکش کا آخر میں صرف یہ نتیجہ ہوگا کہ تمام دنیا کی دولت جب ایک جگہ جمع ہوجائے گی تو وہ پھر سوسائٹی کے ہاتھوں میں پہونچ جائے گی، سوسائٹی کے انھیں افراد کے ہاتھوں میں جن سے لیکر وہ ایک جگہ جمع کی گئی تھی۔ حقیقتاً یہی وہ زمانہ ہوگا جسے ہم بالفاظ دیگر انسانی تاریخ کی تکمیل کا زمانہ کہہ سکتے ہیں۔

اس قدر تمہید کے بعد اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مزدوروں کی تحریک کب شروع ہوئی، اس کی ابتدائی حالت کیا تھی اور وہ کونسے اسباب تھے جو اس تحریک کا باعث ہوئے۔

جب اُنیسویں صدی کی ابتدا میں مشنری کا آغاز ہوا تو کارخانہ دار مزدوروں سے کام لینے کے بجائے مشینوں سے کام لینے لگے کیونکہ اس سے ان کے ذاتی مفاد میں زیادہ اضافہ ہوتا تھا، لیکن اس سے سوسائٹی کا توازن خراب ہونے لگا یعنی اگر ایک طرف سرمایہ دار طبقہ مالی مفاد زیادہ حاصل کرنے لگا تو دوسری طرف محنت کش جماعت کی بیکاری بڑھنے لگی کیونکہ پہلے جس کام کی تکمیل کے لئے سو آدمی درکار ہوتے تھے اب مشینوں کی وجہ سے وہی کام دس آدمیوں سے نکلنے لگا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدوروں کو کم اُجرت پر کام کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑا یہی نہیں بلکہ انھیں اپنے آپ کو سرمایہ داروں کے ہاتھ میں دیدینا پڑا اور اس طرح مزدوروں کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی اور سرمایہ داروں کی ہوس زرکشی بڑھنے لگی۔ ظاہر ہے کہ اس عدم توازن کی طرف سے مزدور طبقہ عرصہ تک بے خبر نہیں رہ سکتا تھا، چنانچہ اس کا احساس اس میں پیدا ہوا اور احساس کے ساتھ ہی ہیجان۔

یوں تو مزدور جماعت کو اپنی تنظیم کا خیال پہلے ہی پیدا ہوگیا تھا، لیکن سنہ ۱۸۶۰ء سے انگلینڈ، فرانس اور جرمنی میں یہ تحریک زیادہ قوی ہوگئی سنہ ۱۸۶۲ء میں لندن میں ایک تجارتی نمائش ہوئی جس میں فرانس کے مزدوروں کا ایک وفد اس میں شرکت کرنے کے لئے روانہ کیا گیا اور اس کو انگلینڈ کے مزدور لیڈروں سے ملنے کا موقع ملا اور آخر کار ستمبر سنہ ۱۸۶۴ء میں بین الاقوامی مزدور لیگ کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ ۲۸ ستمبر کو اس کا ایک عام جلسہ کیا گیا جس میں انگلینڈ، فرانس، اٹلی اور جرمنی کے مزدور لیڈروں کے نمایندے شامل ہوئے۔ جرمنی کے نمایندوں میں سوشلزم کے مشہور بانی کارل مارکس بھی شریک تھے اور مقاصد لیگ کی اشاعت کی ساری ذمہ داری انھیں کے سر رکھی گئی۔

لیگ کے خاص مقاصد یہ تھے:۔ مزدوروں کی ایک آزاد پارٹی کا قیام۔ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی حفاظت و ترقی کے لئے قانون بنوانا۔ کوآپریٹو جماعتوں کا قیام اور قومیت کے نام پر ایک ملک کی حکومت کا دوسرے ملک کی حکومت سے جنگ کرنے کی مخالفت۔

لندن اس بین الاقوامی لیگ کا مرکز بنایا گیا۔ اور اس کی مجلس عاملہ میں مارکس اور کچھ انگریز مزدور لیڈر شامل ہوئے۔ یہ بین الاقوامی مزدور لیگ مختلف ممالک کی مزدور پارٹیوں کے سامنے ایک معیار پیش کرنے میں تو ضرور کامیاب ہوئی مگر اس سے کوئی خاص عملی تحریک بروئے کار نہ آسکی۔

اس بین الاقوامی لیگ نے پانچ جلسے کئے جن میں ٹریڈ یونین۔ امداد باہمی۔ مزدوروں کی حفاظت اور زمین کی اصلاح وغیرہ پر خاص طور سے غور و خوض کیا گیا۔ پہلا جلسہ بمقام جنیوا ۱۸۶۶ء میں ہوا، دوسرا سال آئندہ لوسان میں، تیسرا بمقام برسلز ۱۸۶۸ء میں، چوتھا بمقام باسل ۱۸۶۹ء میں اور ۱۸۷۲ء میں آخری بار ہیگ میں۔ ۱۸۷۲ء تک لیگ پر فرانس کے زبردست انقلابی پرودھن کا اثر رہا اور اس کے بعد مارکس کا۔ مگر اسی اثنا میں مشہور روسی انقلاب پسند باکونن لیگ میں شامل ہوا اور مارکس سے اس کی مخالفت ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باکونن نے لیگ کے اندر ایک خفیہ پارٹی بنائی جس کو لیگ نے کبھی منظور نہیں کیا۔ آخر کار اس جھگڑے میں لیگ کا دفتر نیویارک منتقل کر دیا گیا اور ۱۸۷۶ء میں لیگ ہی کو توڑ دیا گیا۔

کچھ عرصہ بعد ۱۸۸۹ء میں بمقام پیرس ایک عظیم الشان نمائش ہوئی اور اس موقع پر سوشلسٹ مزدوروں کی ایک کانگریس منعقد ہوئی۔ جسے بین الاقوامی مزدور لیگ کا نشاۃ ثانیہ کہنا چاہیئے۔ بین الاقوامی مزدور لیگ کی نگرانی میں آئندہ کانگریسیں ہوئیں۔ اور ۱۹۰۰ء کے بعد اس کا دفتر برسلز میں قائم کیا گیا اور ۱۸۹۶ء تک اس کی یہی کوشش رہی کہ سوشلسٹ اور انارکسٹ باہم ملنے نہ پائیں۔

۱۹۰۰ء تک کانگریس نے کل طور پر یہ طے کر لیا کہ خاص وجوہ کے علاوہ کوئی سوشلسٹ کسی غیر سوشلسٹ حکومت سے تعلق نہ رکھ سکے گا۔ چنانچہ اس کے خلاف عمل کرنے اور فرانس کی وزارت منظور کر لینے کے جرم میں اسے لیگ سے علیحدہ کر دیا گیا۔ یہی حالت فرانس، جرمنی، برطانیہ اور اٹلی میں پسپائی کی ہوئی۔ مگر جنگ کے وقت اور جنگ کے بعد یہ شرط قائم نہ رہی۔ ۱۹۰۴ء کے بعد یہ لیگ کچھ سہولت پسند ہو گئی تھی اس لئے امپیریلزم کے متعلق یہ لیگ صاف طور پر کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ اسٹٹ گارٹ کانگریس میں گستاؤ ہروے نے یہ رزولیوشن پیش کیا کہ جنگ کے خلاف مزدوروں کو انتہائی حربوں سے کام لینا چاہیئے لیکن کوئی اصول طے نہ پا سکا

اگرچہ ۱۹۱۴ء کے جنگ عظیم کے زمانہ میں تمام بندشیں ختم ہو گئی تھیں مگر پھر بھی کچھ ایسی ہستیاں ضرور تھیں، جو اپنے اصول پر آخر تک قائم رہیں اور انھوں نے ۱۹۱۵ء میں تیسری بین الاقوامی مزدور لیگ قائم کرنے کے متعلق غور کرنا شروع کیا۔ اس میں جرمنی، روس، فرانس اور بعض دوسرے ممالک کے نمائندے شریک تھے۔ اس کانفرنس نے جماعتی جنگ و جدل کو عملی صورت دینے کے متعلق غور کیا اس کے بعد ۱۹۱۶ء میں ایک اور کانفرنس ہوئی۔ ان دونوں کانفرنسوں میں انگریزی حکومت نے نمائندوں کو

پاسپورٹ دینے سے انکار کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی بہت سے دوسرے ملکوں نے بھی مخالفت کی آواز اٹھائی تھی۔ سنہ ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے بعد اس کا ایک حصہ کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گیا جو بولشیوک پارٹی کے نام سے مشہور ہے اور سنہ ۱۹۱۷ء کا انقلاب روس اسی پارٹی کا کام تھا۔ روس کی اس انقلاب پسند جماعت نے دوسری بین الاقوامی مزدور لیگوں کو بیکار قرار دیکر مارچ سنہ ۱۹۱۹ء میں تھرڈ انٹرنیشنل پارٹی کی بنیاد ڈالی۔

آج کمیونسٹ بین الاقوامی لیگ میں ۶۷ ملک شامل ہیں۔ جہاں کمیونسٹوں کو طرح طرح کے مظالم کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چین میں کمیونسٹ پارٹی کے آج ۴ لاکھ بیس ہزار ممبر ہیں۔ ان میں سے آدھے تو سویٹ چین کی حفاظت کے لئے لال فوج میں شامل ہیں۔ اور ۴۸ ہزار کمیونسٹ چین کے کومن ٹنگ حکومت میں اپنے انقلابی کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ جہاں کی حالت یہ ہے کہ اگر حکومت کو کسی پر کمیونسٹ ہونیکا شک بھی ہو جائے تو اس کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ جرمنی میں ہٹلر کے خلاف ... ۹ کمیونسٹوں کی جماعت جد و جہد کر رہی ہے۔ اگرچہ جرمنی کی نازی حکومت نے انھیں مٹا دینے کے لئے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ مگر پھر بھی جرمن مزدوروں کی انقلابی پارٹی سنہ ۱۹۱۹ء کے باغیوں کی تعداد سے چوگنا زیادہ ہے۔ جاپان کی حکومت بھی اسی طرح ہر سال یہ دعوےٰ کرتی ہے کہ اس نے کمیونزم کو بالکل ختم کر دیا ہے اور جاپان میں ... کمیونسٹ جیل کے اندر بند ہیں مگر کمیونزم اپنا اثر دکھاتی ہی رہتی ہے۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ سویٹ روس کے علاوہ کمیونسٹوں کی تعداد ۳ لاکھ ۵۰ ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔

رسول احمد ابوھ

باب الاستفسار

وجود روح۔ تناسخ۔ حاضرات

(جناب سید علیم الدین صاحب۔ جہان آباد)

آپ موت کے بعد بقار روح کے قایل نہیں ہیں اور چونکہ اسی عقیدہ پر مذاہب کی بنیاد قائم ہے اسی لئے آپ مذہب کی اہمیت کا بھی اعتراف نہیں کرتے، لیکن دیکھا جاتا ہے کہ لوگ حاضرات کرکے روحوں کو بلاتے ہیں ان سے سوالات کرتے ہیں اور وہ جواب دیتی ہیں۔ مغرب میں سر آلیور لاج، کینن ڈایل وغیرہ بڑے بڑے لوگ بقار روح کے قایل ہیں اور ارواح سے مخاطبت کے قایل ہیں۔ خود یہیں ہندوستان میں متعدد واقعات اسی قسم کے سُنے گئے ہیں جن سے نہ صرف وجود روح بلکہ اس کے احساس و بقار حافظہ کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں دہلی کے کسی ہندو خاندان کی کمسن لڑکی نے بتایا کہ وہ اپنے اگلے جنم میں متھرا کے کسی خاندان میں پیدا ہوئی تھی وہیں اس کی شادی ہوئی اور وہیں اس کے اعزہ موجود ہیں، چنانچہ اس کی نشاندہی پر جب جستجو کی گئی تو اس کا بیان حرف بہ حرف صحیح نکلا۔ براہ کرم مطلع فرمایئے کہ اس باب میں آپ کیا کہتے ہیں۔

(نگار) یہ بالکل صحیح ہے کہ میں موت کے بعد بقار روح کا قایل نہیں ہوں، لیکن یہ درست نہیں کہ میں اسی بنیاد پر مذاہب کی اہمیت سے انکار کرتا ہوں، چونکہ میں موجودہ دنیا کے علاوہ کسی اور ایسی دنیا کا قایل نہیں ہوں، جس کو اس دنیا کا تتمہ کہہ سکیں اور آخرۃ و یوم آخرۃ کو میں اسی دنیا کے انجام اور اسی دنیا کے نتایج اعمال و افکار سے متعلق سمجھتا ہوں، اس لئے ظاہر ہے کہ مذہب کی افادی حیثیت میرے نزدیک دنیا سے علیحدہ کسی اور عالم سے وابستہ نہیں ہو سکتی، اور اسی لئے میں مذہب کو ایک ایسا سماجی قانون سمجھتا ہوں جس کا مقصود ہماری

اسی زندگی کو سنوارنا، اور اسی دنیا کے تمدن کو قایم رکھنا ہے۔

میری جنگ مذہب واہل مذہب سے یہ نہیں ہے کہ میں سرے سے مذہب ہی کو بُری چیز سمجھتا ہوں بلکہ اختلاف صرف اس بات پر ہے کہ وہ مذہب کی بنیاد حیات بعد الموت کو قرار دیتے ہیں اور میں یہ کہتا ہوں کہ مذہب کا مدعا ہماری اسی زندگی کو سنوارنا ہے۔ اگر یہ زندگی اور یہ دنیا بالکل مہمل چیز ہے اور اصل حیات وہی ہے جو موت کے بعد شروع ہونے والی ہے (جیسا کہ عام اہل مذاہب کا خیال ہے) تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس کے پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

یہ تمنائیں، یہ کاوشیں، یہ تگ ودو، یہ جذبات وتاثرات، یہ تمدنی وابستگیاں، یہ عمرانی دلچسپیاں، یہ مناظر لذت والم، یہ ہنگامۂ کیف وکم کیا خدا نے بالکل بیکار پیدا کئے ہیں اور اگر یہ دنیا صرف دار العمل ہے تو کیا ہمارے وہ تمام افعال وکردار جن کے ظہور وصدور میں ہمارے جوارح، ہمارے جسمانی اعضاء نے اتنا نمایاں حصہ لیا ہے کسی ایسی دنیا میں مستوجب جزا وسزا قرار دئے جائیں گے جہاں اس جسم کا وجود ہی نہ ہوگا اور اگر یہ کہا جائے کہ انسانی حشر ونشر اسی جسم کے ساتھ ہوگا اور بالکل یہی انسان انھیں احساسات کے ساتھ زندہ کیا جائے گا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسی دنیا میں یہ سب کچھ نہ ہو اور خواہ مخواہ بگاڑنے بنانے کی زحمت اختیار کی جائے۔ الغرض میں مذہب اور مذہب کی اہمیت کا منکر نہیں ہوں لیکن اُس کو اسی دنیا کے فلاح وبہبود کا ذریعہ قرار دیتا ہوں۔ نہ آیندہ احیاء ثانی کی کوئی ضرورت ہے اور نہ اس سے مذہب کا کوئی تعلق ہونا چاہئے۔ یہ تو خیر ایک ضمنی گفتگو تھی جو آپ کے ایک ضمنی اعتراض کے جواب میں کی گئی۔ اب میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ بقاء روح کے ثبوت میں جو دلایل طلب ارواح یا مخاطبت ارواح وغیرہ کے پیش کئے جاتے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔

ہر امر کے ثبوت میں دو قسم کے دلایل پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق صرف عقل سے ہوا کرتا ہے اور دوسرے وہ جو مشاہدات سے متعلق ہوتے ہیں۔ پھر اس میں کلام نہیں کہ اہل مذاہب نے دونوں ہی قسم کے دلایل پیش کئے ہیں لیکن اسوقت تک وہ کسی ایک میں بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ عقلی دلایل کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے، کیونکہ جب تک حیات بعد الموت کی ضرورت کو ثابت نہ کیا جائے روح وبقاء روح کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، رہگئے مشاہدات سو اُن کی بنیاد یا تو اُن بھوت پریت کی روایات پر قائم ہے جو عام طور سے بیان کئے جاتے ہیں یا پھر روحانیین مغرب کے اس دعوے پر کہ روحیں اُن سے مخاطب کرتی ہیں اور وہ روحوں کو طلب کرکے اُن سے ہمکلام ہوسکتے ہیں۔ اس ضمن میں آپ عمل حاضرات اور ان روایات کو بھی لے لیجئے جو تناسخ کے ثبوت میں بیان کی جاتی ہیں۔

کی روحوں نے کیوں نہ مرنے کے بعد اس حقیقت کو ہم پر واضح کیا اور اس کفر و بیدینی کو کیوں جاری رہنے دیا۔
۲۔ طلب ارواح کے بعض بڑے بڑے دعویٰ کرنے والوں نے اخیر میں اس کا اعتراف کیا کہ جو کچھ وہ کہتے تھے محض دھوکا تھا اور جو دکھاتے تھے وہ بھی شعبدہ اور نظربندی سے زیادہ نہ تھا۔ ڈاکٹر سلایڈ نے ایک زمانہ تک لوگوں کو اسی فریب میں مبتلا رکھا کہ وہ روحوں کو بلاتا ہے جو تختی پر سوالوں کا جواب لکھتی ہیں لیکن آخر آخر اس نے خود اپنا پردہ فاش کر کے بتایا کہ وہ اس عمل میں کن چالاکیوں سے کام لیتا تھا۔ مغرب کی دو مشہور عورتوں مارگریٹ اور کیٹی کا حال اس سے قبل ہم کسی اشاعت میں بیان کر چکے ہیں کہ طلب ارواح کا تماشہ دکھانے میں کتنا زبردست جال انھوں نے پھیلا رکھا تھا۔
۳۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جو روحیں طلب کی جاتی ہیں وہ سوائے ادنیٰ معمولی باتوں کے کوئی اور بات نہیں کرتیں۔ اگر ارواح کی رسائی وہاں تک ہے جہاں تک ہمارا ذہن نہیں پہونچ سکتا اگر واقعی وہ لوگوں کے دلوں کا حال معلوم کر سکتی ہیں اور فطرت کے رازوں سے آگاہ ہیں تو کیا وجہ ہے کہ وہ کوئی علمی خدمت انجام نہیں دیتیں، ان کو چاہئے کہ وہ ہماری حیات کی بہت سی گتھیوں کو سلجھائیں، مسایل علمی کا حل بتائیں، سیاسی مشکلات کو دور کریں، ایجادات و اختراعات کے بارے میں رہنمائی کریں۔ لیکن بجائے اس کے ان کے پیغامات سوائے کھانے پینے رہنے سہنے اور گانے بجانے کے اور کسی اہم مسئلہ سے متعلق نہیں ہوتے۔
۴۔ وہ لوگ جو تنہا طلب ارواح کے قایل ہیں وہی ہیں جن کے قواعصبی قدرتی طور پر کمزور واقع ہوئے ہیں۔ پھر جوں جوں وہ طلب ارواح کی مشق کرتے جاتے ہیں، ان کے اعصاب اور زیادہ ضعیف ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ بالکل مجنون ہو جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے دماغ و اعصاب کا یہ عالم ہے ان کے احکام و تصورات پر کیا یقین لایا جا سکتا ہے۔

مغربی مصنفین اور مشرقی عورت

(جناب محمد زکریا خانصاحب۔ علی گڈھ)

مغرب کے اہل قلم نے مشرقی عورت کا ذکر جب کبھی کیا، ہمیشہ اس سے یہی ثابت ہوا کہ یہاں کی عورت جاہل تھی، کنیز تھی، بیکس و لاچار تھی اور یہ کہ مردوں نے کبھی اس کی ترقی و تعلیم کی طرف توجہ ہی نہیں کی اور یہ الزام خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں پر زیادہ شدت کے ساتھ

ظلم کیا جاتا ہے، پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ مسلمان عورتوں کا موجودہ پردہ، ان کی خانگی زندگی اور ان کی تعلیمی پستی کو دیکھ کر سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ مغربی مصنفین کا بیان حقیقت سے خالی نہیں ہے اور اسلام نے عورت کی اصلاح کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی کیا آپ اس مسئلہ میں اپنے خیالات ذریعہ نگار ظاہر کریں گے۔

(نگار) یہ بالکل صحیح ہے کہ اہل مغرب مشرقی عورت کی جو تصویر پیش کرتے ہیں وہ نہایت مکروہ ہوتی ہے، لیکن یہ کہنا کہ مشرق کی عورت ہمیشہ سے ایسی ہی مجبور و نااہل رہی ہے درست نہیں اور یہ تو سراسر غلط ہے کہ اسلام نے عورت کی اصلاح و تعلیم کی طرف سے بے پروائی کی۔

ملکہ سبا، عرب ہی کی عورت تھی جس نے یمن اور بیت المقدس پر حملہ کر کے حکمۂ سلیمان کی اشاعت کی۔

زنوبیا بھی تدمر کی رہنے والی اور مشرق ہی کی عورت تھی جو ہومر کی شاعری کی دلدادہ تھی اور جس نے ایک زمانہ تک جیوش رومہ کا مقابلہ کر کے اپنے وطن کی حفاظت کی اور جناب خدیجۃ الکبریٰ بھی سرزمین عرب ہی کی خاتون تھیں جن کے قافلۂ تجارت جزیرۃ العرب اور دمشق کے درمیان آیا جایا کرتے تھے، خنساء بھی عورت تھی اور مشرق ہی کی عورت تھی جس نے اپنی شاعری کا سکہ بڑے بڑے مرد شعراء کے دلوں پر بٹھا رکھا تھا۔

عہد نبوی میں بھی ایسی متعدد عورتیں تھیں جو لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ چنانچہ بلاذری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء اسلام میں منجملہ ان سترہ لوگوں کے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے چار یا پانچ عورتیں تھیں خود رسول اللہ کو عورت کی تعلیم کا جسقدر خیال تھا وہ اس سے ظاہر ہے کہ آپ نے شفاء بنت عبداللہ کو بلا کر حکم دیا کہ وہ جناب حفصہ کو کتابت کی تعلیم دے۔ ام کلثوم کا خواندہ ہونا بھی تاریخ سے ثابت ہے اور علاوہ ان کے عایشہ بنت سعد، کریمہ بنت المقداد اور ام سلمہ بھی لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔

علامہ نووی نے تہذیب الاسماء میں بہت سی ان مشہور عورتوں کا حال لکھا ہے جو روایت احادیث کے ذریعہ سے تاریخ اسلام میں اپنے نقوش چھوڑ گئی ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت ابوبکر صدیق کی دو صاحبزادیوں جناب عایشہ و اسماء کا حال کون نہیں جانتا۔ حضرت عایشہ کی ذہانت و فطانت اور امور سیاسی میں ان کے اقدامات تاریخ کے روشن واقعات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کو ایک ہزار احادیث یاد تھیں۔ ان کی بہن اسماء نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ جنگ یرموک میں اپنے شوہر کے ساتھ آپ کا شریک ہونا اور اپنے بیٹے کو حجاج کے مقابلہ میں یہ کہکر روانہ کرنا (یا بنی عش کریما و مت کریما)[1] وہ واقعات

---

[1] اے میرے بیٹے زندہ رہنا ہے تو عزت کے ساتھ زندہ رہ اور مرنا ہے تو عزت کے ساتھ جان دے۔

ہیں جن سے آپ کے بلند و پاکیزہ اخلاق پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اسی طرح ام الدرداء سے تاریخ اسلام کا ہر طالب علم واقف ہے کہ آپ کو علم سے کتنا شغف تھا اور آپ کس قدر ذہین و باخبر تھیں۔

یہ زمانہ وہ تھا جب لڑکیوں یا لڑکوں کی تعلیم کا بھی کوئی خاص انتظام نہ تھا اور صرف فطرت کی رہنمائی سے انھوں نے یہ سب کچھ حاصل کیا تھا لیکن اس کے بعد جب باقاعدہ درس و تدریس کا دور آیا تو لڑکیاں مدرسوں میں بھی بھیجی جانے لگیں۔ آج انتہائی ترقی یافتہ ممالک ہی میں لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ پڑھتی ہوئی نظر آتی ہیں لیکن اب سے ایک ہزار سال قبل عہد اسلام میں طریقۂ تعلیم بالکل یہی تھا اور لڑکے لڑکیاں پہلو بہ پہلو سب ساتھ ایک ہی مدرسہ میں تعلیم پاتے تھے۔ چنانچہ کوفہ میں بھی ایک مدرسہ ایسا موجود تھا جہاں نہ صرف کمسن بلکہ نوجوان لڑکیاں بھی پڑھنے جایا کرتی تھیں، چنانچہ اسی زمانہ کا ایک واقعہ ہے کہ کوئی نوجوان کسی لڑکی پر عاشق ہو گیا جو مدرسہ جایا کرتی تھی اور اس نے مدرسہ کے اُستاد (خلیل) سے ساز باز کرکے نظار بازی کی فرصت حاصل کرلی۔ ایک بار اموی خلیفہ عبدالملک خود اس مدرسہ میں گیا اور اس نے وہاں کنیزوں کو بھی تحصیل علم میں مصروف پایا۔

اس واقعہ سے نہ صرف شرفا کی لڑکیوں بلکہ کنیزوں کی تعلیمی حالت پر بھی روشنی پڑتی ہے اور تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کو جو تعلیم دیجاتی تھی وہ نہایت بلند و اعلیٰ قسم کی ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ جس وقت خلیفۂ ہارون رشید کے سامنے ایک کنیز پیش ہوئی اور اس کی قیمت دس ہزار دینار طلب کی گئی تو خلیفہ نے حکم کہ اس کا امتحان لیا جائے چنانچہ فقہ و تفسیر، طب و فلسفہ، ادب و موسیقی کے بڑے بڑے ماہرین نے اسکا امتحان لیا اور ایسے جواب اس نے دئے کہ سب دنگ ہو کر رہ گئے۔

ایک بار خالد ابن عبداللہ نے تین کنیزیں خریدیں جن میں سے ہر ایک شعر و ادب، غنا، و موسیقی میں یدطولیٰ رکھتی تھیں۔ اسپین سے لائی ہوئی ایک کنیز کو نحو و لغت کی اتنی زبردست تعلیم دی گئی کہ ان دونوں فنوں میں اس نے سند و حجت کی حیثیت اختیار کرلی۔

وہ مسلمان جو آج عورتوں کے پردہ کے حامی ہیں اور جو لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کے پڑھنے کے خلاف ہیں ان کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ عرب کے مسلمانوں میں نہ پردہ کا رواج پایا جاتا تھا نہ تعلیم کے باب میں وہ اتنے آزاد تھے کہ لڑکے لڑکیوں دونوں کو ایک ہی مدرسہ میں بھیجدیتے تھے۔ عرب عورتیں ہمارے ہندوستان کی عورتوں کی طرح قفس میں بند نہ رہتی تھیں بلکہ وہ ان کے ساتھ میدان جنگ جاتی تھیں، زندگی کے تمام مشکلات میں مردوں کا ساتھ دیتی تھیں اور شاید آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ وہ یورپ کی موجودہ عورت کی طرح بال بھی کٹوا دیتی تھیں۔

ابن خلکان اور المقری کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کی بعض عورتوں نے علوم و فنون کی اشاعت میں بھی خاص حصہ لیا تھا۔ چنانچہ شہدہ بنت ابی نصر نے تعلیمی مہارت میں خاص شہرت حاصل کی تھی اور کثرت سے طلبہ کو درس دیا کرتی تھی اور جب امام شافعی قاہرہ پہونچے تو نفیسہ بنت ابی محمد کے پاس جاکر متعدد احادیث کی سند حاصل کی۔

ابوحیان کا بیان ہے کہ اساتذہ میں سے جو درس دیا کرتے تھے تین عورتیں بھی تھیں۔ ایک مونسہ بنت الملک العادل، دوسری شامیہ بنت الحافظ، اور تیسری زینب بنت عبداللطیف۔ ان کے علاوہ ایک اور معلمہ شہدہ بنت عنبری بھی تھی جس نے عبدالرحمان الفقیہ کو بخاری کا درس دیا تھا۔

اشبیلیہ میں مریم بنت ابی یعقوب شاعرہ بھی تھی اور لغت و انشار کا درس بھی دیا کرتی تھی۔ یا مُوت کی روایت ہے کہ ابن عساکر نے ۱۳۰۰ اُستادوں سے پڑھا تھا جن میں ۸۰ عورتیں تھیں۔ ابن خلکان کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لڑکیاں مدرسوں سے فارغ ہوکر نکلتی تھیں ان کو سند بھی دیجاتی تھی۔

الغرض یہ کہنا کہ اسلام نے عورتوں کی تعلیم و اصلاح کی طرف توجہ نہیں کی یا یہ کہ تاریخ اسلام ایسی عورتوں کے وجود سے خالی ہے سراسر الزام ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ ہندوستان کی مسلمان عورت کو دیکھ کر کبھی ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوسکتا کہ کسی وقت اسلام نے اس کی ذہنی تربیت کی طرف توجہ کی ہوگی، لیکن جو لوگ تاریخ سے آگاہ ہیں ان کے لئے سب سے زیادہ حیرتناک امر یہی ہے کہ جس مذہب نے عورت کے مرتبہ کو اس قدر بلند کرنا چاہا تھا اور جس اسلامی تہذیب نے اس جنس کو ہر ممکن ترقی کے لئے آزاد چھوڑ دیا تھا وہ آج کیوں عورت کی آزادی و ترقی کا اس قدر مخالف ہے۔

مصر میں عورت آزاد ہوچکی، ترکی میں وہ مردوں کے دوش بدوش کام کرنے لگی، ایران میں اس نے نقاب نوچکر پھینک دیا، شام و فلسطین، دمشق و عراق میں وہ برافگندہ نقاب مدرسوں میں جانے لگی، لیکن ہندوستان کی عورت ہنوز غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے کیونکہ مسلمان مردوں ہی کی ذہنیت کونسی ایسی بلند ہے کہ عورتوں کی پستی پر حیرت کی جائے۔

مکتوبات نیاز

خان محترم — کل ہی بیس دن کے بعد ایک طویل سیاحت سے واپس آیا ہوں اور نہ صرف جسم
دل و دماغ کی خستگی کا بھی یہ عالم ہے کہ کسی معقول بات کے سوچنے سے بھی جی گھبرا اٹھتا ہے۔ لیکن جب کوئی نام
مشغلہ دل بہلانے کا میسر نہ ہو تو چار و ناچار عقل کی ہرزہ کاریوں ہی سے کام لینا پڑتا ہے۔

ڈاک دیکھی اور سب سے پہلے آپ کے خط کا جواب لکھنے بیٹھ گیا، لیکن سوچ رہا ہوں کہ آخر لکھوں کیا
آپ کے خط کی اہمیت حد درجہ اعتدال حواس چاہتی ہے اور یہاں جو کیفیت ذہن و دماغ کے عدم توازن
اسے عرض ہی کر چکا ہوں۔ چونکہ آپ سے بہت ڈرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ "ہوش میں آلوں تو کہوں" کا عذر
کی بارگاہ میں کبھی مسموع ہو ہی نہیں سکتا اس لئے جو بات سب سے زیادہ اہم ہے اس کے متعلق تو اپنی را
ظاہر کئے دیتا ہوں اور باقی امور کا فیصلہ "وقت دگر" پر اٹھا رکھتا ہوں۔

سنئے، اگر آپ نے اس مسئلہ کو صرف اس لئے دوبارہ چھیڑا ہے کہ چار سال کی مدت آپ کے نزدیک
"پیر خرف" بنا دینے کے لئے کافی ہے اور اب میں آپ کے ہم آہنگ ہو جاؤں گا، تو مجھے افسوس ہے کہ آپ
یہ خیال درست نہیں لیکن اگر مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ آپ اس کام کے کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور میری رائے
کی مخالفت اب اس کی مزاحم نہیں ہو سکتی تو پھر اس "استشارہ و استشہاد" کی کیا ضرورت تھی۔ یہ
بات کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ پہلے اس کے لئے کوئی بہترین توجیہہ تلاش کی جائے۔ آپ اگر کسی کو نا
ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو بیشک ہلاک کر ڈالئے لیکن یہ تو نہ کہئے کہ جو کچھ آپ کرنا چاہتے ہیں وہ درست بھی ہے
مکر و ریا کی یہ ایسی ذلیل صورت ہے کہ کم از کم آپ ایسے جری انسان کو ضرور اس سے احتراز کرنا چاہئے
مجھ سے اسلم صاحب سے تو زمانہ ہوا کہ خط و کتابت بند کر دی ہے اور اگر آپ یہ نہ لکھتے کہ وہ بمبئی میں ہیں تو
بھی خبر نہ ہوتی کہ وہ زندہ ہیں یا مر گئے — موجودہ حالات اگر آپ کے لئے اطمینان بخش ہیں تو بسم اللہ ان کو
یا خود وہاں جا کر کام کی طرح ڈال دیجئے۔ یہ سات آسمان بلا وجہ تو گردش میں ہیں نہیں، کوئی نہ کوئی فتنہ
ہو ہی جائے گا۔

عزیز گرامی۔ آپ مجھے صبر و تحمل کی تلقین کرتے ہیں، اس ہمدردی و دلنوازی کا شکریہ لیکن آپ کو شاید معلوم نہیں کہ تعلقات محبت و خلوص کے باب میں ضبط کا مفہوم میرے نزدیک بھی وہی ہے جو سعدی کا تھا یعنی یہ کہ

دو دستی نیست دراں دل کہ شکیبائی ہست

آپ جانتے ہیں کہ میں " دل کے خون ہو جانے" سے کبھی نہیں ڈرتا اور نہ کبھی آج تک اس کی شکایت میں نے کسی سے کی ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ کوئی دوسرا مجھ سے دعوائے محبت کرے اس حال میں کہ " باندازۂ خلش خار" بھی اس نے کوئی تکلیف برداشت نہیں کی ہے۔ بہرحال اگر وہ میری خواہش کے خلاف یہ اقدام کر چکے تھے تو آپ نے اس کا ذکر ہی کیوں کیا اور اگر کیا تھا تو کم از کم یہ تعزیت و تلقین کی صورت تو اختیار نہ کی جاتی۔ مجھے زبان پر قابو حاصل ہے لیکن غم و غصہ پر نہیں۔۔۔ کہوں گا نہیں لیکن کڑھوں گا ضرور۔۔ آپ کو ان کی معذوریوں پر تو بہت رحم آتا ہے، کبھی میری مجبوریوں پر بھی رحم آجائے تو کیا گناہ ہے۔

کرم گسترا۔ آپ نے جو کچھ فرمایا بالکل درست، جو تدبیریں آپ نے سوچی ہیں مانا کہ تیر بہدف لیکن اس کا کیا علاج کہ

بہ کار سازی بخت خود اعتقادم نیست

میری مراد یہاں " بخت" سے وہ قوت مجہول نہیں جو اپنے بنائے کاموں کو بگاڑ دینے میں خاص شہرت رکھتی ہے، اور نہ وہ " ربانی لوح" جس پر میرے گناہوں اور علمائے کرام کے اعمال حسنہ کی پوری فہرست بہ تید وقت منقوش ہے۔۔۔ بلکہ مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ میں اپنی اُفتاد طبیعت کو کیا کروں جو اس حد تک گر کر حصولِ مراد کو بھی ناکامی تصور کرتی ہے۔۔

جب تک کسی خواہش کا اظہار صرف " آنکھوں" سے ہو رہا ہے، وہ " تمنا" ہے، لیکن زبان سے کہا اور اس نے گدائی کی صورت اختیار کر لی۔ پھر آپ ہی انصاف کیجئے کہ جو اتنا شدید احمق ہو اس کو مجبور کرنا کہ وہ کہے اور بار بار کہے، کتنی عظیم الشان دانائی کی ذمہ داری اس کی گردن پر رکھنا ہے۔

یقیناً بے نیازانہ زندگی بسر کرنے کے اسباب مجھے حاصل نہیں ہیں، لیکن اتنا تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ یہ نتیجہ ہے انھیں اسباب کی طرف سے بے نیازی کا، میں جس سے لڑتا نہیں اس سے ڈرتا بھی نہیں، خدا سے میں نے کبھی جنگ نہیں کی تو اس سے کیوں ڈروں۔ جسم و روح سب کو فانی سمجھتا ہوں اور اس

"المکدہ روزگار" میں سب سے بڑی تسکین میرے لئے یہی ہے - آپ کیوں اپنا وقت میری ہمدردی میں خراب کریں -
با دلشدگاں ہر کہ در افتاد، برافتاد

مکرمی - آپ کا خط تو جواب طلب نہ تھا، لیکن چونکہ خود مجھے ایک بات آپ سے پوچھنا ہے، اس لئے یہ عریضہ پیش کر رہا ہوں - وہاں ایک صاحب ہیں جو وفاؔ تخلص کرتے ہیں - غالباً دو محلے میں رہتے ہیں - میں نے سنا ہے کہ ان کے پاس ایک قلمی نسخہ کلیات مومنؔ کا ایسا موجود ہے جسے خود مومنؔ نے درست کیا تھا - راوی خود اپنا دیکھنا تو بیان نہیں کرتے لیکن ان کے انداز بیان میں اتنا وثوق ہے کہ خواہ مخواہ اعتبار کر لینے کو جی چاہتا ہے -
اگر آپ سے وفاؔ صاحب کے مراسم ہوں تو اس کا پتہ لگائیے اور لکھئے کہ کیا وہ بیک نظر اس نسخہ کے مطالعہ کی اجازت دے سکتے ہیں ؟
میں خود وہاں آنے کے لئے تیار رہوں بشرطیکہ آپ خود اسے ایکبار دیکھ کر یہ کہیں کہ واقعی دیکھنے کی چیز ہے -

---

جناب من - تسلیم - آپ نے میرے تبصرہ کو بہ امعان نظر دیکھا - شکریہ - یقیناً مسایل تصوف آپ کے ممدوح بھی نظم کرتے ہیں اور میرؔ و دردؔ بھی نظم کرتے تھے، لیکن یہ آپ کو کیونکر سمجھاؤں کہ
دارد تفاوت آب شدن تا گریستن
آنسو ٹپکا دینا رونا نہیں ہے اور نہ باچھیں پھاڑ دینا ہنسنا - حال وقال کے فرق سے اگر آگاہ ہوتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ "آورد" و "آمد" میں کتنا تفاوت ہے - شاعری کی جان صرف "جذبۂ بے اختیار" ہے نہ کہ عاقلانہ حزم و احتیاط، یہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اصغرؔ صاحب نے ابن عربی کے فصوص الحکم کی شرح لکھی ہے لیکن خدا کے لئے اسے غزلیات کا دیوان نہ کہئے -

---

اعتبارات

دوسری دُنیا کی زبان

پیدا ہونے کے تین دن بعد میں ریشمی گہوارہ میں پڑا ہوا، اپنے چاروں طرف نئی دنیا کو عجیب حیرت کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا کہ میری ماں نے میری دایہ سے پوچھا۔ "آج میرے بچہ کا کیا حال ہے"۔ اس نے جواب دیا "بی بی، نہایت اچھا حال ہے، آج تین دفعہ میں نے دودھ بھی پلایا اور ایسا خوش تو میں نے کبھی کسی بچہ کو دیکھا ہی نہیں"۔

میں نے یہ سنا اور غصہ سے بیتاب ہو کر ایک چیخ ماری جس کا مطلب یہ تھا کہ "اے ماں، اس کے کہنے کا اعتبار نہ کرو، کیونکہ میرے گہوارے کے گدّے بھی سخت ہیں اور جو دودھ اس نے پلایا وہ تلخ تھا، اسکی چھاتیوں سے بو آ رہی تھی" لیکن نہ میری ماں نے میری زبان کو سمجھا اور نہ میری دایہ نے، کیونکہ میں دنیا کی اس زبان میں گفتگو کر رہا تھا جہاں سے میں آیا تھا۔

ساتویں دن جب میرا عقیقہ ہوا تو کھانے کے بعد مُلّا نے میرے لئے دعا مانگی کہ میں مسلمان رہوں اور اسلام ہی پر میرا خاتمہ ہو۔ میں نے اپنی زبان میں اس سے کہا کہ "اگر مسلمان ایسا ہی ہوتا ہے جیسا تو ہے، تو خدا نہ کرے میں مسلمان رہوں اور اسلام پر میرا خاتمہ ہو"۔۔۔ لیکن کسی نے کچھ نہ سمجھا اور میں خاموش ہو گیا

سات ماہ کے بعد ایک نجومی آیا اور اس نے میرا زائچہ دیکھ کر حکم لگایا کہ "میں بڑا زبردست عالم دین ہوں گا اور ہزاروں آدمی میرا اتباع کریں گے"۔

یہ سنکر میں نے اپنی پوری قوت کے ساتھ چیخکر کہا کہ "یہ پیشین گوئی بالکل غلط ہے کیونکہ مجھے یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ میں سوائے گانے کے اور کچھ نہ سیکھوں گا"۔۔۔ ان واقعات پر تیس سال گزر گئے ہیں میری ماں بھی مر چکی ہے اور دایہ و ملا بھی، لیکن نجومی ابتک زندہ ہے۔ کل بازار میں اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے پوچھا میرا مشغلہ کیا ہے میں نے کہا کہ "نقاشی سیکھ رہا ہوں"۔۔۔ اس نے مسکرا کر کہا کہ "میں جانتا تھا کہ تم اپنے زمانہ کے بڑے ماہر نقاش ہو گے اور میں نے تمہاری ماں سے بھی یہی پیشین گوئی کی تھی"، میں یہ سنکر خاموش ہو رہا کیونکہ میں خود اُس دنیا کی زبان بھول چکا تھا۔

مطبوعات موصولہ

کلام جوہر مولانا محمد علی مرحوم کے کلام کا مجموعہ ہے جسے جامعہ ملیہ دہلی نے نظر ثانی کے بعد اس نام سے شائع کیا۔ مولانا محمد علی ان لوگوں میں سے تھے جو دنیا میں سب کچھ بننے کی اہلیت رکھتے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فی الحقیقت کس کام کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے جس طرح سیاسیات و خطابت میں خاص شہرت حاصل کی اسی طرح انھوں نے بہ حیثیت ایک شاعر و انشا پرداز کے بھی لوگوں کے دلوں میں جگہ کر لی تھی اور یہ مجموعہ ثبوت ہے ان کی شاعرانہ اہلیت کا۔ مولانا ہر چند فطرتاً شاعر پیدا نہ ہوئے تھے جیسا کہ ان کے کلام کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے، لیکن اکتساباً جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ بھی اتنا دلکش ہے کہ ان کی قوت نظم کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اس مجموعہ میں چند نظمیں بھی ہیں جن میں سوائے اس کے کوئی خاص بات نہیں کہ وہ خاص موقعہ و محل پر لکھی گئی ہیں اور تاثرات سے بیگانہ نہیں ہیں۔ چند غزلیں ابتدائی دور کی ہیں جو جذبات و قدرت نظم دونوں حیثیت سے واقعی ابتدائی مشق کی معلوم ہوتی ہیں اس کے بعد اصل دیوان ردیف وار شروع ہوتا ہے جس میں بعض اشعار واقعی نہایت پاکیزہ ہیں مثلاً :۔

ہیں شوق کی اگر یہی امیدواریاں نوبت کب آئے دیکھئے گفت و شنید کی

وہی دن ہے ہماری عید کا دن جو تری یاد میں گزرتا ہے،

نہ بھائے گا تمھیں قصۂ عزیز عیش رفتہ کا پہ کیا کیجیے، ہمیں تو اک یہی افسانہ آتا ہے

نقد جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر کام کرنے کا یہی ہے، تمھیں کرنا ہے یہی

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں اب ہونے لگیں اُن سے خلوت کی ملاقاتیں

چونکہ مولانا کا یہ دیوان محض ان کا تفنن طبع ہے نہ کہ شاعرانہ ادعا اسلئے ان اسقام و اغلاط کا ذکر فضول ہے جو اس مجموعہ میں نظر آتے ہیں۔ شروع میں عبدالماجد دریابادی کا لکھا ہوا مقدمہ بھی ہے جس کا قابل اعتنا حصہ صرف اس قدر ہے جو سیرۃ محمد علی سے تعلق رکھتا ہے، شاعری سے چونکہ عبدالماجد صاحب کو خود کوئی لگاؤ نہیں ہے اس لئے مناسب یہی تھا کہ وہ اس باب میں خاموشی اختیار کرتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا اور آخر کار ہر جگہ انھوں نے ٹھوکر کھائی۔ مقدمہ نگار کی بد ذوقی اور "تحسین ناشناسی" کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ جوہر کے منتخب اشعار میں ذیل کے شعر کو بھی جگہ دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ حنا کا قافیہ کیا

خوب باندھا ہے۔

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے　　میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

اس مجموعہ کی قیمت ۸؍ روپے ہے۔

بانگ جرس مختصر سا مجموعہ ہے جناب شفیق جونپوری کے کلام کا جس میں نظمیں، قطعات، رباعیات وغیرہ سبھی کچھ شامل ہے، غزلوں کا حصہ کم ہے۔ شفیق صاحب مولانا حسرت موہانی کے شاگرد ہیں اور جس حد تک تغزل کا تعلق ہے وہ یقیناً اپنے اُستاد کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں

خوب سوچا تو نہ نکلا کوئی دشمن اپنا　　ان کی پہلی نظر لطف و عنایت کے سوا

سرورِ عشق و محبت ہے جانِ مستی ہے　　شرابِ حسن میں ڈوبا ہوا شباب ان کا

نشانِ رفتگاں پاکر بڑھی اور اپنی بیتابی　　بہت رویا کئے دامن میں گردِ کارواں لیکر

شفیق صاحب نے رنگ حسرت کے تتبع کی پوری کوشش کی ہے اور ایک حد تک انھیں کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اتنی جلدی انھیں مجموعہ کی اشاعت کی کیوں سوجھی علی الخصوص ایسی حالت میں کہ ان کا کلام اسقام و اغلاط سے پاک بھی نہیں ہے۔ علاوہ غزلوں کے اور جو کچھ ہے وہ یکسر ناقابل توجہ ہے (اور بدقسمتی سے بہت کچھ وہی ہے) لکھائی چھپائی بھی اچھی نہیں ہے۔ قیمت ۸؍ روپے اور ملنے کا پتہ۔ دفتر برق جونپور۔

خمکدۂ سرور سرور جہان آبادی کے کلام کا مجموعہ ہے جسے قاضی محمد غوث صاحب فضا حیدر آبادی نے شائع کیا ہے۔ سرور ان شعراء میں سے تھے جنھوں نے موجودہ دورِ شاعری کی طرح ڈالنے میں حصہ لیا تھا اور جن کی خدمات کو اُردو زبان کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

اس سے قبل ان کا مجموعۂ کلام جامِ سرور اور خمخانۂ سرور کے نام سے زمانہ پریس کانپور اور انڈین پریس الہ آباد شائع کرچکے ہیں، لیکن یہ ضرور نہیں کہ سرور ایسے شاعر کا ذکر بار بار نہ کیا جائے۔ سرور کے کلام کی مستی ایک ایسی چیز ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گی اور دنیا کو کوئی حق حاصل نہیں کہ اسے فراموش کردے۔

غوث صاحب نے کوشش کی ہے کہ سرور کا تمام کلام اس مجموعہ میں آجائے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ابتدا میں چند مقالات بھی دیدئے گئے ہیں، جن سے سرور کے حالات زندگی اور اُن کے رنگ سخن پر روشنی پڑتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ طباعت و کتابت کے لحاظ سے یہ مطبوعات حیدر آباد میں شامل کرنے کے قابل نہیں۔ قیمت ۱۲؍ ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن۔

مرثیۂ اندلس حصۂ اول جناب حفیظ نعیمی بیلی بھیتی نے اُندلس کے عہد اسلامی اور اس کے زوال کی

تاریخ کو اس نام سے نظم کیا ہے۔ لیکن ابتدا کی ہے تخلیق آدم سے۔ اشعار میں کافی جوش ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے جو کچھ لکھا ہے وہ شدید تاثر کے ساتھ لکھا ہے اور کسی نظم کی خوبی کی یہی دلیل ہو سکتی ہے۔

ابتدا میں جناب حاجی نبی احمد صاحب بریلوی کا مقدمہ ہے جس میں حفیظ صاحب کے حالات، اور انکی شاعری پر نقد کیا گیا ہے۔ ان کے بعد مولوی محمد خلیل الرحمان صاحب مولف اخبار الاندلس کا ایک تاریخی مقالہ ہے جنھوں نے تاریخ اسپین پر ماسرانہ تبصرہ فرمایا ہے۔ نظم کی نوعیت اور ناظم کے انداز بیان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس نوجوان شاعر کا مستقبل بہت کچھ امکانات اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے اور یقیناً افسوسناک واقعہ ہوگا اگر یہ امکانات بروئے کار نہ آئے۔

یہ کتاب مصنف سے ایک روپیہ میں ملسکتی ہے اور خط وکتابت کا پتہ موضع کرگھناں ڈاکخانہ امریا ضلع پیلی بھیت۔

مضامین فلک پیما مجموعہ ہے میاں عبدالعزیز ام۔ اے لاہوری کے ان مضامین کا جو ہمایوں میں فلک پیما" کے نام سے شایع ہوئے ہیں۔

"فلک پیما" اُردو کے اُن انشاپردازوں میں سے ہیں جنھوں نے بغیر کسی سعی و کاوش کے "انفرادیت" حاصل کرلی ہے اور جن کی "ادبیت" چھٹی حس کی طرح ہر وقت اور ہر جگہ کام کرتی رہتی ہے۔

ایک ادبی مقالہ کا حُسن "ندرتِ خیال" سے اتنا تعلق نہیں رکھتا جتنا "ندرتِ بیان" سے لیکن اگر دونوں کا کسی جگہ اجتماع ہوجائے تو پھر یوں سمجھئے کہ وہ "نفخ صور" سے کم نہیں۔ میرے نزدیک "فلک پیما" بھی انھیں صور پھونکنے والے ادیبوں میں شامل ہیں۔ ان کا خیال، دماغ کی جن راہوں سے گزر کر صفحۂ کاغذ پر آتا ہے وہ ایسی ہیں جو اول تو عام دماغوں میں پائی نہیں جاتیں اور اگر پائی بھی جائیں تو ان سے کام لینے کا سلیقہ شاذ ونادر ہی کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ حیاتِ انسانی کا مفہوم ان کے نزدیک صرف یہ ہے کہ

"زندگی کا لباس غرور سے پہنو، جیسے کوئی بادشاہ تاج پہنتا ہے"

اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اسی غرور و پندار سے لکھا ہے۔

ان کی انشاپردازی کی ایک اور نمایاں خصوصیت اس کا وہ مخصوص "مزاحی رنگ" ہے کہ اگر کوئی اس سے خوش ہونا چاہے تو تبسم کیسا قہقہہ کی بھی کمی نہیں اور اگر کوئی بُرا مانے تو گالیاں دینے کے بعد بھی تسکین نہیں ہوتی (ملاحظہ ہوں فلک پیما کے وہ مقالات جن میں انھوں نے مذہبی مفروضات اور مولویوں کے مزخرفات سے بحث کی ہے)

فلک پیما، صرف "مژدۂ بہار" سنانا چاہتا ہے اور "خبر بد" سنانے کی خدمت صرف مولوی وصوفی کیلئے موزوں سمجھتا ہے۔ وہ دنیا اور اس کے ہنگامہ کو بالکل "افادی" نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور سوائے مسرت ونشاط کے نہ کچھ اور کہنا چاہتا ہے نہ سننا۔ ان کے ہر فقرہ سے امنگ ٹپکتی ہے اور ان کے ہر خیال سے

ولولۂ انبساط۔ الغرض وہ ایک زندہ مضمون نگار ہے جو ہمیں صرف زندگی کا درس دینا چاہتا ہے اور موت کو "صید زبوں" جانکر اس کی طرف نگاہ ڈالنا بھی پسند نہیں کرتا۔

اس مجموعہ میں نئو کے قریب ان کے مقالے شامل ہیں اور ہر مقالہ بجائے خود اس قدر دلچسپ ہے کہ ساری کتاب بالکل "خاصہ" کی چیز نظر آتی ہے۔ طباعت و کتابت نہایت پاکیزہ ہے اور حجم ۳۰۸ صفحات۔ قیمت علاوہ محصول دو روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ:- دفتر رسالۂ ہمایوں لاہور۔

شاخ نبات مجموعہ ہے جناب طالب باغپتی کے کلام کا جس میں نظمیں، غزلیں اور رباعیاں ان کی یکجا نظر آتی ہیں۔ شروع میں جناب نواب محمد جمشید علی خانصاحب رئیس باغپت کا مقدمہ ہے اس کے بعد جگر مرادآبادی کا تبصرہ اور پھر اصل کلام۔

پہلا حصہ سو صفحات کا نظموں کے لئے وقف ہے جس میں سوائے دو ابتدائی نظموں کے (کہ ان میں سے ایک حمد کی ہے اور دوسری نعت کی) باقی تمام حسن و عشق سے تعلق رکھتی ہیں۔ چونکہ طالب صاحب کا اصل ذوق "غزلگوئی" ہے، اس لئے ان کی نظمیں بھی اس رنگ سے خالی نہیں اور بہت کیف آور ہیں۔ "سحر نغمہ" کے ابتدائی تین شعر ملاحظہ ہوں:۔

راگنی کے روپ میں اک کافرہ گیسو دراز　　سوہنی کے بھیس میں اک ساحرہ بربط نواز
کمسنی کی شکل میں رعنائی دورِ شباب　　پیکر دوشیزگی میں ایک ہلکی سی شراب
ہاتھ میں بربط گلے میں لحنِ داؤدی لئے　　سحر نغمہ گوش بر آوازِ صحرا کو کئے

یہ ہے اصل رنگ طالب صاحب کا جس سے ان کی کوئی نظم بھی خالی نہیں چہ جائیکہ غزل۔
رنگِ تغزل کے بھی چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

اب ترے انتظار میں سمجھا　　عمر کتنی دراز ہوتی ہے
ہم سے بھی پوچھ لو شبِ غم کس طرح کٹی　　تم نے تو کہدیا کہ "ہمیں نیند آگئی"
روک دیتا ہے ترے موجِ تبسم کو حجاب　　یا کسی سربند شیشے میں مچلتی ہے شراب

رباعیاں بھی اچھی ہیں۔ یہ مجموعہ غیر مجلد عہ میں اور مجلد عہ میں مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی سے ملسکتا ہے۔

اسلام کی حکیمانہ زندگی مجموعہ ہے ان مواعظ کا جو مولانا علی نقی صاحب نے گزشتہ عشرۂ محرم کے دوران میں ارشاد فرمائے۔ چونکہ مولانائے موصوف کے متعدد رسایل و تصانیف پر بارہا نگار میں اظہار خیال کیا جا چکا ہے، اس لئے قارئین نگار آپ سے ناواقف نہیں ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں اپنے فاضل دوست کی تمام تصانیف کو نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

مولانا کی اکثر تصانیف بہ سلسلۂ تبلیغ امامیہ مشن شایع ہوتی ہیں، لیکن ایسا بہت کم دیکھا گیا ہے کہ ان
مانیف کی "افادیت" صرف شیعہ طبقہ کے لئے مخصوص و محدود ہوتی ہو۔ وہ زیادہ تر اصولی مباحث
سامنے رکھتے ہیں اور اصول ہی کو پیش نظر رکھ کر اظہار خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ عشرۂ محرم کے یہ تمام مواعظ بھی
ی خصوصیت کے حامل ہیں جن میں انسانی زندگی، تعلیمات مذاہب، حریت عقل، قوت عمل، نظام اجتماعی
غیرہ نہایت اہم مسایل سے بحث کی گئی ہے۔ زبان و انشار کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے کیونکہ اس خصوص میں
لانا کو جو شہرت حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ بعض بعض جگہ فروعی مباحث یا طریق استنتاج میں مجھے
لانا سے ضرور اختلاف ہے لیکن وہ اتنا زیادہ اہم نہیں کہ اس کا اظہار ضروری ہو۔
اس کتاب کی قیمت ۸ر ہے اور سکریٹری صاحب امامیہ مشن لکھنؤ سے ۸ر میں مل سکتی ہے۔

ن زراعت ملک مالوہ تصنیف ہے مولوی محمد ضیاء الدین حیدر کی جو زراعت و فلاحت کے ماہر ہیں
اور جن کی زندگی کا تمام تر حصہ اسی مشغلہ میں بسر ہوا ہے۔ آپ جس زمانہ میں
دپال کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر زراعت تھے اس زمانہ میں آپ کو سرزمین مالوہ اور وہاں کی خصوصیات
شت کے مطالعہ کرنے کا زیادہ موقعہ ملا جو اس تصنیف کا باعث ہے۔
اس کتاب میں زمین کی قسموں، طیاری زمین کے طریقوں، تخم ریزی کے اصول، آبپاشی کے وسایل
راجناس ربیع و خریف کی تفصیلات سے بحث کرکے نہایت آسان زبان میں تمام وہ ذرایع قلمبند کردئے گئے
ں جو ایک کاشتکار کو پیداوار کی ترقی میں مدد دیسکتے ہیں۔ زبان نہایت سادہ و سلیس ہے تاکہ ہر شخص اسے
بجھ سکے۔ یہ دوسرا اڈیشن ہے اور اس کی قیمت ۱۲ر ہے۔ ملنے کا پتہ محلہ قاضی گڑھی کاکوری ضلع لکھنؤ اور
صنف کا نام۔

دیہات کی شام

جھٹپٹے میں شام کے ہے آسماں کھویا ہوا
جیسے دن بھر کا مسافر ہو کوئی سویا ہوا

گر رہا ہے یوں افق سے رنگ بالائے زمیں
جیسے سجدے میں کسی مومن کی جھکتی ہو جبیں،

سو چلا ہے مضطرب ذرّ دل کا دردِ مستقل
جس طرح آسودۂ آغوش ہو شاعر کا دل

نسترن کے کنج میں ٹھیرے ہوئے سے رنگ و بو
ڈوبتی کرنوں سے رنگیں تتلیوں کی گفتگو

ناز پرور کھیتیوں میں لہلہاتی سی بہار
جس طرح جنت بداماں مطمئن دل کا قرار

بیریا کا پیڑ تھراتا ہے کانٹوں میں اسیر
جیسے زاہد کا شکیب اور جیسے مجرم کا ضمیر

دہ، سنبل میں مصور کی نظر اُلجھی ہوئی
جیسے پھولوں میں کہیں دب جائے کوئی تیتری

نرم جاں پودے سکوں کی گود میں مست شباب
جیسے دیکھیں بلبلیں ہنستے ہوئے پھولوں کے خواب

خشک کانٹوں کی زباں پر زندگانی کا پیام
آشیاں بھولے ہوئے طائر کا شاخوں میں قیام

ہلکی ہلکی سی ہوا سرگوشیاں کرتی ہوئی
گلستاں کی غنچگی میں بجلیاں بھرتی ہوئی

رگھند کے پاس اک جھاڑی میں جگنو کی چمک
قلبِ ہستی میں ہو جیسے نورِ عرفاں کی جھلک

فاصلے پر ہلکا ہلکا جھلملاتا اک چراغ
کفر کی گمراہیوں میں جیسے ایماں کا دماغ

اک پرانے پھوس کے چھپر میں بیٹھا ہے کسان
رنگ و بو کی مملکت کا بادشہ، کھیتوں کی جان

انگلیوں سے دیکھتا رہتا ہے نبضِ کائنات
بادلوں سے کھیلتا ہے برق سے کرتا ہے بات

اس کے کس بل پر اکڑتا ہے سیاست کا دماغ
خون سے جلتا ہے اس کی شہریاری کا چراغ

یہ پھٹے کپڑے، یہ میلے پاؤں، یہ بخت سیاہ
دیکھ لے تو زندگی کے دل سے بھی نکلے اک آہ

عمر کی گہرائیوں میں کھوئی جاتی ہے نگاہ
ابر کے دامن میں جیسے لے کبھی سورج پناہ

بزمِ اسرارِ حقیقت کا دوامی رازدار
زندگی کے تیز کانٹوں پر ہمیشہ بیقرار

رنگ دنیا بھی اگر کروٹ بدلتا ہے کبھی
سب سے پہلے زد میں آتی ہے اسی کی جھونپڑی

ساری دنیا کو کھلائے اور خود بھوکا مرے
سب کو روٹی دے، خود اپنا پیٹ پتھر سے بھرے

علم کی گمراہ کن کرنوں سے یہ بیگانہ ہے
سب کی قسمت کے ستم سہلے یہ وہ دیوانہ ہے

کردگارِ صبحِ ہستی! دادرِ کون و فساد!
کب مٹے گا فطرت و انساں کی حالت کا تضاد!

ننگِ نظارہ بنا جاتا ہے انساں ہائے ہائے!
تیرگی سے کہہ دامن نظر کو جلد آکر چھپائے

فضل الدین اختر

عشق

پھر رہا ہے عشق اپنی دُھن میں لہراتا ہوا
وحشتِ کہنہ کے ہر قصے کو دُہراتا ہوا

شاعروں کے دِل جلا کر نطق کی قندیل میں
حُسن کی پُرتمکنت محفل کو گرماتا ہوا

حُسن کی پُرتمکنت محفل کو گرما کر ندیم
جھومتا، ہنستا، مچلتا، لغزشیں کھاتا ہوا

موت کی سرد اور بے رونق جبیں کو دیکھکر
روح پرور قہقہوں کی آگ برساتا ہوا

چند صد ریزہ گریبانوں کے سرائے کے ساتھ
دو جہاں پر پرچمِ تسخیر لہراتا ہوا

ہر شکستِ لازمی پر طنز سے ہنستا ہوا
ہر یقینی ہار پر فتحِ مبیں پاتا ہوا

جینے مرنے کے سلیقوں کا خدا، ہر گام پر
زندگی اور موت کے رازوں کو سلجھاتا ہوا

کلفتوں سے درسِ عیشِ جاوداں لیتا ہوا
فخر سے ہنس ہنس کے بے اندازہ غم کھاتا ہوا

مضمحل روحوں کو دیکر جھوم اُٹھنے کا پیام
سرد و پژمردہ دلوں کو وجد میں لاتا ہوا

حاصلِ کون و مکاں، ہنگامۂ ہستی کی جاں
وسعتِ کونین پر ہر رنگ میں چھاتا ہوا

التہابِ عشق کو اس سے جدا کر دیں اگر!
زندگی ہے اے عدم اک پھول مرجھاتا ہوا

عدم

نوازشِ فطرت

فلک سے سورج کی حشر خیز آتشیں شعاعیں برس رہی تھیں زمیں سے لیکر وہ آسماں تک ہر ایک شے کو جھلس رہی تھیں
جہاں کا ایک ایک ذرہ حدت کے ظلم سے بلبلا رہا تھا فضائے ہستی میں ایک طوفانِ آتشیں تلملا رہا تھا
وہ جوش تھا سیلِ آتشیں کا زمین بھی آگ اگل رہی تھی وہ زور تھا شعلہ خیزیوں کا کہ روحِ دوزخ دہل رہی تھی
سکوت ہر ذی حیات پر اک طلسم سا بنکے چھا رہا تھا جہاں کے اس آتشیں نظارے کی ہولناکی بڑھا رہا تھا

کسان اس قہر کی تپش میں بھی کھیت میں ہل چلا رہے تھے
تپش میں ڈوبے ہوئے تھے اور اپنی دھن میں گیت گا رہے تھے

یکایک اک نوجوان لڑکی ہوئی عیاں دامنِ جبل سے غبار اٹھا دھوئیں کی مانند ناگہاں دامنِ جبل سے
عرق عرق جسم اس کا اور ہانپتی ہوئی بیقرار لڑکی جلی ہوئی دھوپ کی تمازت سے مضمحل دلفگار لڑکی
جبیں سے تھی سادگی نمایاں، لباس سے مفلسی ہویدا گٹھے ہوئے جسم سے مشقت کی تندرستی کی شان پیدا
حسین چہرے کی فکرمندی سے صاف غربت ٹپک رہی تھی برہنہ پائی میں آہ تقدیر کی نوازش جھلک رہی تھی

غرض کسانوں کے واسطے کھانا لیکے گاؤں سے آرہی تھی
خلافِ معمول دیر ہونے سے رخ پہ زردی سی چھا رہی تھی

ادھر تھے بیتاب بھوک سے اسکے منتظر کاشتکار بندے جہاں کے پروردگار، خلقِ خدا کے خدمتگزار بندے
ادھر بیچاری کو ایک ہرے سانپ نے راستے میں کاٹا تڑپ اٹھی فرطِ درد سے وہ مگر مناسب نہ تھا ٹھہرنا

قدم بسوئے منزل بہ تیزی سے بیقراری میں بڑھ رہا تھا
نگاہ کچھ بہکی جا رہی تھی اور جسم میں زہر چڑھ رہا تھا

وہ آکے پہونچی وہ کھانا رکھا، وہ ہوکے بیہوش گر گئی ہے حیات نے اپنا رشتہ توڑا نگاہِ تقدیر پھر گئی ہے

زباں پہ اف تک نہ آنے پائی کہ گود میں لے لیا اجل نے
چراغِ ہستی کو چند لمحوں میں آہ گل کر دیا اجل نے

انجم رضوانی

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴
رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴
شاہی
تیار کردہ
طبی
دواخانہ
یونانی
SHAHI
BEST TONIC FOR
GENERAL DEBILITY
SHAHI
شاہی
تیار کردہ
طبی
دواخانہ
یونانی
ملیریا اور ٹائیفائیڈ (موتی جھرہ)
کے بعد کمزوری دفع کرنے کیلئے
"شاہی"
لاجواب دوا ہے
ہسٹریا اور اسقاط حمل
کے
دفع کرنے میں
"شاہی"
کا مقابلہ کرے ایسی
دوا شاذونادر
ہی ہو
انیمیا (کمی خون) دمہ
کھانسی وجملہ امراض
سینہ کے لئے
"شاہی"
اکسیر علاج
ہے
مزید معلومات کے لئے
ہفت رنگین رسالہ
مفت طلب کیجئے
طبی دواخانہ یونانی
اندور (مالوہ)
تار کا پتہ :- "شاہی" اندور
۶۶ محمد علی روڈ بمبئی ۳
ٹیلیفون نمبر ۳۲۹۸۴۳

شمارہ (۲)	فہرست مضامین اگست سنہ ۳۶ء	جلد (۳۰)

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۳۰) اگست ۱۹۳۶ء شمار (۲)

ملاحظات

ہماری بیماری اور اس کا صحیح علاج

جس طرح انفرادی طور پر ایک انسان مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو جایا کرتا ہے، بالکل اسی طرح دنیا کی قوموں پر بھی امراض کا حملہ ہوا کرتا ہے اور جس طرح مرض کی عدم تشخیص یا غلط علاج سے ایک انسان ہلاک ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح اپنی بیماریوں کی غلط تشخیص یا معالجین کی بے احتیاطی سے قومیں بھی مردہ ہو جایا کرتی ہیں۔ فرق اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ انسان جلد ہلاک ہو جاتا ہے اور قوم کی ہلاکت کے لئے نسبتاً زیادہ زمانہ درکار ہوتا ہے۔

ہماری قوم بھی بیمار ہے اور سخت بیمار ــــ اس کے معالج بھی نظر آتے ہیں اور کثرت سے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مرض میں برابر اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے اور کوئی صورت استردادِ صحت کی پیدا نہیں ہوتی۔ پس آیئے چند لمحے ہم آپ بھی مل کر اس مسئلہ پر غور کریں، ممکن ہے کوئی بات سمجھ میں آجائے۔ سب سے پہلے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اکابر قوم نے ہمارا مرض کونسا تجویز کیا ہے اور اس کے بعد یہ کہ علاج کی کیا صورتیں انھوں نے اختیار کی ہیں۔ اس سلسلہ میں نہایت عجیب و غریب بات یہ ہے کہ مختلف چارہ گروں نے ہمارے مرض کی تشخیص بھی مختلف کی ہے۔ مثلاً سب سے پہلے اس "چارہ سازِ اعظم" کو لیجئے جو اپنے آپ کو "مولانا" کہلاتا ہے۔ اس کا قطعی فیصلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی تباہی صرف

عدم پابندی مذہب کی وجہ سے ہے۔ اب آپ سوال کیجئے کہ مذہب سے ان کی کیا مراد ہے، تو دو جماعتوں کی طرف سے دو مختلف جواب ملیں گے۔ بہت زیادہ پست دماغی ذہنیت رکھنے والے علماء یا یوں سمجھئے کہ حور و قصور کی توقع میں دنیا کو تج دینے والے مولوی، اس کا جواب یہ دیں گے کہ مذہب سے مراد صرف نماز روزہ کی پابندی ہے اور "ایمان مجمل و مفصل" کی تمام تصریحات پر بلاچون وچرا آنکھ بند کرکے یقین راسخ پیدا کرنا۔ ان کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان اس دُنیا کے لئے پیدا ہی نہیں ہوا کہ وہ یہاں خوشحالی کی جستجو کرے، وہ پیدا ہوا ہے اُس عالم کے لئے جہاں ہر نعمت بغیر جستجو کے میسر آتی ہے اور جس کے حصول کی تدبیر یہی ہے کہ انسان ہر وقت خدا کا نام رٹتا رہے اور۔ اس دنیا کو قید خانہ سمجھ کر کسی نہ کسی طرح بُرے بھلے اس سے گزر جائے، گویا اس کے نزدیک ہمارا مرض عین ہماری صحت ہے، اور ہمارا دنیاوی انحطاط عین ہمارا اخروی عروج۔

دوسری جماعت مذہبی علماء کی جو نسبتاً زیادہ ذی فہم ہے، درستی اخلاق کا بھی درس دیتی ہے۔ لیکن جب ان سے سوال کیا جاتا ہے کہ اخلاق کی درستی کیونکر ممکن ہے تو وہ بھی اس کا انحصار مذہبی اعمال پر رکھتے ہیں۔ گویا انکے نزدیک بھی اصل چیز وہی صوم وصلوٰۃ کی پابندی قرار پاتی ہے۔ اب اگر ہم اس مذہبی پابندی کا کوئی معیار اپنے سامنے رکھنا چاہیں تو ظاہر ہے کہ علماء کرام سے بہتر نمونہ کوئی اور کیا مل سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے علماء کرام کی جماعت واقعی ترقی یافتہ ہے، کیا فی الحقیقت وہ عروج و استعلاء کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کیا اُن کے اخلاق در اصل بہت بلند ہیں، اور کیا یہ پانچ وقت ہاتھ پھیلا پھیلا کر "ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ" کی آواز بلند کرنے والے واقعی حسناتِ دین و دنیا کے حامل ہیں، یہ فیصلہ کرنے کے لئے ہم کو زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں۔ اگر دنیاوی ترقی سے مراد صرف "بے منت و بے سوال و بے استحقاق" عیاشانہ حد تک اسبابِ معیشت و معاشرت حاصل کر لینا ہے تو اس میں کلام نہیں کہ ہمارے بعض علماء کرام جنھوں نے ادارۂ بیعت و سلوک بھی قائم کر رکھا ہے یقیناً بڑی حد تک ترقی یافتہ کہلانے کے مستحق ہیں۔ اسی طرح اگر عروج و استعلاء نام ہے صرف اس بات کا کہ جہلاء کی جماعت پر تقدس کا رعب قائم کرکے ان کو دست بوسی کے لئے جھکا دیا جائے تو اس میں بھی شک نہیں کہ ہمارے بعض مذہبی رہنما "طارمِ اعلیٰ" سے بھی چند قدم آگے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن اگر ترقی کے مفہوم میں ذہنی و دماغی علو، اخلاقی پاکیزگی، اجتماعی احساس، اور ایثار و نفس کُشی کا جذبہ بھی شامل ہے تو ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جو جماعت ہمیں سب سے زیادہ صوم و صلوٰۃ کا حکم دیتی ہے وہی سب سے زیادہ ان خصوصیات سے بیگانہ نظر آتی ہے اور جو لوگ مذہبی پابندی ہی کو اصل علاج قرار دیتے ہیں وہی سب سے زیادہ آزار میں مبتلا۔ ضرورت نہیں کہ ان کے اخلاق و خصائل اور ان کی اندرونی زندگی پر تفصیل سے بحث کی جائے، کیونکہ اب یہ کوئی ایسا راز نہیں جس سے دنیا ناواقف ہو۔ بہت سے چہرے بے نقاب ہو چکے ہیں اور اُن کے خط و خال کی کراہت

سے بینائیاں بہت کافی طور پر مجروح ہو چکی ہیں۔

مذہبی پابندی کو ترقی کا ذریعہ بتانے والے لوگ ثبوت میں تاریخ اسلام کے اس دور کو بھی پیش کیا کرتے ہیں جب مسلمانوں نے توسیع حکومت اور اکتساب علوم وفنون کے لحاظ سے ساری دنیا کو مرعوب کر رکھا تھا۔ لیکن یہ دور وہ تھا جو اموئین سے شروع ہوا اور بنو عباس پر ختم ہو گیا۔ پھر اگر اس تمام ترقی وفلاح کا سبب صرف پابندی مذہب کو قرار دیا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانہ میں خلفاء راشدین بلکہ خود رسالتمآب کے عہد سے بھی زیادہ پابندی مذہب پائی جاتی تھی، حالانکہ ارباب نظر سے مخفی نہیں کہ مذہب کی اصل روح تو اسی وقت ختم ہو چکی تھی جب عنانِ حکومت امیر معاویہ کے ہاتھ میں گئی اور مسلمانوں کی تمام ذہنی وعلمی، ملکی واستعماری ترقیوں کا زمانہ وہی تھا جب اخلاق مذہب سے وہ یکسر بیگانہ ہو چکے تھے۔ الغرض مسلمانوں کی ترقی کا سبب ان کے مذہب کو قرار دینا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا اور دنیا میں کسی قوم نے صرف مذہب کی پابندی کی وجہ سے کبھی کوئی ترقی کی ہو جس کا سب سے بڑا ثبوت دور حاضر کا ذہنی ارتقا ہے کہ خدا کی آبادی جتنی خدا سے دور ہوتی جاتی ہے اتنی ہی وہ آگے بڑھتی جاتی ہے۔ علاوہ علماء کے ایک گروہ ہمارے چارہ سازوں کا اور بھی ہے، جنھیں سیاسی رہنما کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ان میں بھی دو جماعتیں ہیں۔ ایک وہ جو سیاسیات کو مذہب کا جزو قرار دیکر دونوں کو ساتھ ساتھ لیجانا چاہتی ہے۔ اس کی تشخیص یہ ہے کہ مسلمانوں نے چونکہ مذہب کے قائم کئے ہوئے رشتۂ سیاسی کو ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے اس لئے وہ برابر گرتے جا رہے ہیں۔ ان کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو عالم اسلامی کا ایک جزو قرار دیں اور محض ہندوستانی ہونے کے علاقہ کو نظر انداز کر دیں۔ چنانچہ اس کے لئے "خدام کعبہ" کی ایک جماعت قایم کی گئی، "خلافت" کی حمایت کے لئے ایک ادارہ کھولا گیا۔ لاکھوں روپیہ چندہ وصول کیا گیا۔ مرکز خلافت کے مٹ جانے پر طرح طرح سے ماتم کیا گیا، نجد وحجاز کے مسایل پر شور وواویلا مچایا گیا، عراق وفلسطین کے معاملات میں احتجاجی جلوس نکالے گئے، ایران وترکی کی بیدینیوں پر آہ وبکا کیا گیا۔ لیکن افسوس ہے کہ ہندوستان کا مسلمان بجائے بڑھنے کے گھٹتا ہی رہا اور یہ اخوت اسلامی کا رشتہ بھی بالکل ناستوار ثابت ہوا۔ دوسری جماعت سیاسی رہنماؤں کی وہ ہے جس نے محض سیاسیات سے دلچسپی نہ لینے کو ہمارے انحطاط کا سبب قرار دیا، چنانچہ اس نے ایک طرف مسلم لیگ قایم کی اور دوسری طرف کانگرس سے رشتہ جوڑا۔ لیکن مسلم لیگ نے جو کچھ کیا اور کر رہی ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں اور کانگرس میں شریک ہو کر جو سیاسی تفوق مسلمانوں نے حاصل کیا وہ بھی سب کو معلوم ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ اسوقت تک ہمارے لیڈروں اور اکابر قوم نے مختلف تشخیصیں ہماری بیماری کی قائم کیں اور مختلف علاج اس کے ازالہ کے لئے سوچے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے ایک بھی مفید ثابت نہ ہوا اور اب

حالت اس درجہ نازک ہوگئی ہے کہ اگر ہم اسے عالم نزع سے تعبیر کریں تو یہ تعبیر بالکل حق بجانب ہوگی۔ ہرچند مجھے رہنمایان ہند کی صف میں شامل ہونے کا فخر حاصل نہیں ہے، لیکن جماعت عوام کے ایک ادنیٰ فرد ہونے کی حیثیت سے میں نے بھی اس مسئلہ پر بارہا غور کیا ہے اور تمام ناکامیوں کا سبب میں نے ہمیشہ ایک ہی قرار دیا ہے۔ وہ کیا ہے، اس کو میں آگے چلکر ظاہر کروں گا، فی الحال میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کسی ملک یا قوم کی صحیح ترقی کا مفہوم کیا ہے۔

انسان تمام مخلوقات میں صرف اس لئے ممتاز سمجھا جاتا ہے کہ وہ فطرت کی طرف سے قوتِ عقل و تمیز لیکر آیا ہے اور اس کا فطری مطالبہ اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ اس کے ذہن و دماغ کو آزادی کے ساتھ سوچنے اور کام کرنے کا موقعہ ملے، پھر چونکہ اس کا فقدان ایک قوم میں سب سے زیادہ اسی وقت پایا جاتا ہے جب وہ غیر کی محکوم ہو، اس لئے ایک ملک کا سب سے بڑا کام یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ آزادی کی کوشش کرے اور ایک قوم صحیح معنے میں اسی وقت ترقی کر سکتی ہے جب اس کے قوائے ذہنیہ کو مفلوج کرنے کے لئے کوئی دوسری قوم اسپر حکمراں نہ ہو۔ چنانچہ اسی مقصد کا حصول کانگریس کا نصب العین ہے، یہی تمنا ہمارے مسلم رہناؤں کی ہے اور یہی اعلان ہمارے بعض علمائے کرام کی طرف سے بھی کیا جاتا ہے۔ کانگریس پچاس سال سے زاید زمانہ گزرا کہ اس تگ و دو میں مصروف ہے، مسلمانوں میں بھی اس احساس کو پیدا ہوئے بیس سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے اور ہمارے مذہبی قایدین کے ایک حلقہ میں بھی کم و بیش دس بارہ سال سے یہ خواہش پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے کوئی جماعت اسوقت تک کامیاب نہیں ہو سکی اور مستقبل قریب میں کوئی خاص توقع کامیابی کی نظر آتی ہے۔

پھر قطع نظر اس سے کہ ہندو مسلمانوں کے باہمی ناخوشگوار تعلقات سے سیاسی آزادی کی راہ میں کتنے موانع حایل ہوگئے ہیں یہ مسئلہ بجائے خود غور طلب ہے کہ اس مدعا کے حصول کی جو تدابیر اکابر وطن نے سوچی ہیں وہ کیا واقعی ایسی ہیں کہ اگر ہندو مسلم تعلقات خراب نہ ہوئے تو اسوقت تک ملک آزاد ہو چکا ہوتا۔ مجھے اس کے تسلیم کرنے میں تامل ہے، کیونکہ ملک نام صرف اُن چند افراد کا نہیں ہے جو شہروں میں رہتے ہیں اور تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بلکہ وہ عبارت ہے اس ۹۵ فی صدی آبادی سے جو گاؤں میں رہتی ہے اور بالکل جانوروں کی سی زندگی بسر کرتی ہے ایک ملک میں کوئی سیاسی انقلاب ہمیشہ اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب عوام کے احساس میں تبدیلی پیدا ہو اور ہندوستان کی ناکامی کا راز یہی ہے کہ اس وقت تک عوام میں بیداری پیدا نہیں ہوئی اور نہ اس کے پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہو سکتا ہے کہ بعض سیاسی ہنگاموں اور عدم تعاون کی تحریک سے تھوڑی سی ہلچل عوام میں بھی پیدا ہوگئی ہو، لیکن یہ بالکل عارضی و وقتی چیز تھی اور بجائے احساس کے صرف تقلید و اتباع سے تعلق رکھتی

آزادی کی روح جب تک انفرادی طور پر ہر ہر فرد میں پیدا نہ ہوا اور ہر شخص خود اضطراری طور پر اپنی غلامی کی ذلت کو محسوس نہ کرنے لگے، ملک کبھی آزاد نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی ترقی کر سکتا ہے۔

اس لئے مرض کی تشخیص تو یہ ہو چکی کہ ملک کے افراد کی وہ حس جو غلامی کی ذلت و تکلیف کو ناقابل برداشت بنا دیتی ہے مُردہ ہو گئی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا صحیح علاج کیا ہو سکتا ہے۔ کیا ملک کی سیاسی انجمنوں کے جلسے اس گمشدہ احساس کو پھر واپس لا سکتے ہیں؟ کیا ہماری مذہبی پابندی ہمارے اندر یہ حس پیدا کر سکتی ہے؟ اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ ہماری موجودہ حالت خود شاہد ہے کہ ان میں سے کوئی طریقہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہوا اور اس لئے ان پر اعتماد کرتے رہنا وقت ضائع کرنا ہے۔

میں نے جس حد تک اس مسئلہ پر غور کیا ہے میرے نزدیک اس کا صرف ایک ہی علاج ہو سکتا ہے اور وہ عام تعلیم کی اشاعت ہے۔ "مس امی رستم جی" نے کسقدر صحیح لکھا ہے کہ "ہم کوہ اوریسٹ کی چوٹی تک پہونچنے کی کوشش تو کر رہے ہیں لیکن جہل عامہ کا اس سے زیادہ زبردست پہاڑ جو ہماری راہ میں حایل ہے اس کو دور کرنے کی تدبیر کوئی نہیں سوچتے"۔

آپ سمجھتے ہوں گے کہ ہندوستان کی تعلیمی حالت بہت ترقی کر رہی ہے کیونکہ ہر سال خدا معلوم کتنے نئے کالج و اسکول جاری ہوتے ہیں اور کتنے طلبہ اُن سے پڑھکر باہر آتے ہیں، لیکن شاید آپ کو یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ باوجود شوق علم کے اس ہنگامہ کے ہندوستان کی ۸،۷،۳-۸۲۵۴ آبادی میں صرف ۲۸۱۳۱۳۱۵ نفوس لکھنا پڑھنا جانتے ہیں (اعلیٰ تعلیم کا ذکر نہیں ہے کہ وہ تو اتنی بڑی آبادی کو دیکھتے ہوئے تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے) گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ مردوں میں تیرہ فی صدی اور عورتوں میں دو فی صدی تعلیم کا اوسط پڑتا ہے یعنی یہاں کے مرد ۸۷ فیصدی اور یہاں کی عورتیں ۹۸ فی صدی جاہل ہیں ــــ مس امی رستم جی لکھتی ہیں کہ "اگر امریکہ کی طرح اس جہل کا حساب لگایا جائے تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ ہندوستان کے تمام جاہل بسنے والے اگر ایک ایک گز کے فاصلہ سے دو قطاروں میں کھڑے کئے جائیں تو ۲۶۴۲۲۹ میل جگہ اُن کے لئے درکار ہوگی یعنی کرۂ ارض کے گرد تقریباً اُن کے چار حلقے نظر آئیں گے اور اگر جاہلوں کی یہ فوج ۲۵ میل روزانہ کے حساب سے کوچ کرے تو ایک مقررہ نقطہ سے گزرنے کے لئے ان کو دس سال ۲۵ دن درکار ہوں گے"۔ اسوقت ہندوستان میں تعلیم یافتہ افراد کی تعداد صوبۂ متوسط اور آسام کی آبادی سے زیادہ نہیں ہے اور اس سے آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ ملک کا کتنا بڑا حصہ ہنوز جہل و وحشت کی زندگی بسر کر رہا ہے ــــ

ہم لوگ اپنی تمام جد و جہد میں مغربی اصول کو سامنے رکھکر کام کرنے کے عادی ہو گئے ہیں، چنانچہ ملک کی سیاسی آبادی میں بھی انقلاب و اصلاح کی وہی صورتیں تجویز کرتے ہیں جو ممالک یورپ میں اختیار کی جاتی ہیں۔ یہ غور نہیں کرتے کہ وہاں کے لوگ ترقی کی جن راہوں سے گزر رہے ہیں، ان تک پہونچنے کا ذریعہ صرف تعلیم تھا، یعنی وہاں سب سے پہلے جس چیز

کی طرف توجہ کی گئی وہ عام اشاعت تعلیم تھی۔ اسی طرح یہاں ہندو مسلم سوال اور اُردو ہندی نزاع میں ان ممالک یوروپ کو پیش کیا جاتا ہے جہاں مختلف عقاید و زبان کے لوگ بستے ہیں اور پھر بھی اتحاد و اخوت کی زندگی بسر کرتے ہیں، لیکن یہ نہیں دیکھا جاتا کہ وہاں کی اس یکرنگی و یک جہتی کا سبب صرف تعلیم ہے۔ کانگرس کو نصف صدی سے زیادہ زمانہ گزر گیا کہ وہ سیاسی بیداری پیدا کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہے، اسی طرح مسلم لیگ، جمعیتہ العلماء وغیرہ متعدد ادارے ایک زمانہ سے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کا مطالبہ کرتے چلے آرہے ہیں، لیکن نہ کانگرس اسوقت تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی اور نہ کوئی اور انجمن ــــ اگر وہ تمام قوت جو ان تدابیر میں صرف کی گئی ہے صرف اشاعت تعلیم میں صرف کیجاتی تو یقیناً آج ہندوستان کی حالت بالکل بدلی ہوئی نظر آتی اور وہ آواز جو اس وقت بار بار دُہرانے کے بعد بھی دلوں پر اثر نہیں کرتی خود لوگوں کے قلوب سے پیدا ہوتی ــــ اصل چیز صرف احساس ہے خواہ قومی ہو یا انفرادی اور اس کے پیدا کرنے کی تنہا تدبیر صرف تعلیم ہے۔ آج ہر چہار طرف سے دیہاتی اصلاح کی آواز بلند ہو رہی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ بالکل بے معنی چیز ہے، نہ ریڈیو کے ذریعہ سے وہ اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں، نہ نسل کشی کے بہترین مویشی فراہم کرنے سے ان کے درد کا علاج ممکن ہے۔ وہ بیمار ہیں صرف جہل و بے علمی کے، ان کی حالت تباہ ہے صرف اس لئے کہ وہ ان پڑھ ہیں اس لئے اگر واقعی ان کا علاج مقصود ہے تو ان کو تعلیم ہی کی طرف متوجہ کرنا چاہئے اور قوم و حکومت دونوں کو یہ کوشش کرنا چاہئے کہ کسی طرح ہندوستان کی ۹۰ فی صدی جاہل آبادی لکھنا پڑھنا سیکھ جائے ــ ہمارے تمام اصلاحی ادارے بیکار ہیں، ہماری جملہ سیاسی انجمنیں لغو و مہمل ہیں، ہمارے مواعظ مذہبی یکسر مزخرفات ہیں کیونکہ ان سب کا اثر قبول کرنے کے لئے ضرورت ہے خاص ذہنیت و احساس پیدا کرنے کی اور وہ صرف تعلیم ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ کانگرس اسوقت تک کروروں روپیہ سیاسی تحریکات پر صرف کر چکی ہے لیکن اگر اسکا نصف روپیہ بھی ملک کا جہل دور کرنے کے لئے صرف کیا جاتا تو آج یہ حالت نہ ہوتی کہ پنڈت جواہر لال کھڑے ہوئے اشتراکیت کا درس دے رہے ہیں اور لوگ آنکھیں پھاڑے ہوئے ان کا منہ تک رہے ہیں۔

آیندہ جنوری ۳۷ء کا "نگار"

منیجر کی طرف سے جو اشتہار جنوری ۳۷ء کے نگار کے متعلق شائع ہو رہا ہے وہ قارئین نگار نے ملاحظہ کیا ہوگا اور غالباً اس کی نوعیت کا اندازہ بھی ایک حد تک کر لیا ہوگا۔ میں آج ذرا تفصیل سے بتانا چاہتا ہوں کہ جس چیز کے انتظار میں آپ کو مبتلا کیا جا رہا ہے وہ اسوقت تک کے تمام سالناموں سے بالکل جدا چیز ہے۔

یہ خصوصیت غالباً نگار ہی کو حاصل ہے کہ ہر نئے سال کا نیا پرچہ کسی نہ کسی مخصوص موضوع کے لئے وقف ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں اس وقت تک ادبی و انتقادی حیثیت سے جو مواد پیش کیا جا چکا ہے وہ سوائے نگار کے صفحات کے آپ کو کسی اور جگہ میسر نہیں آسکتا۔

جس وقت گزشتہ جنوری کا رسالہ "ہندی شاعری" پر شائع ہوچکا تو مجھے آیندہ جنوری کے متعلق فکر ہوئی اور بعض احباب سے مشورہ کیا۔ کسی نے کہا کہ اسے فارسی شاعری کے لئے وقف ہونا چاہئے، بعض نے عربی شاعری کی طرف متوجہ کیا، کسی نے مصحفی کا نام لیا اور کسی نے موجودہ دور کے شعراء اور ادباء پر نقد و تبصرہ ضروری خیال کیا۔ لیکن میں نے ان میں سے کسی مشورہ کو پسند نہ کیا، کیونکہ اول تو مسلسل دو سال تک شاعری کے موضوع پر سالنامے نکالنے کے بعد پھر اسکی تکرار مناسب نہ معلوم ہوئی اور دوسرے اس لئے بھی کہ لکھنے والے کہاں سے پیدا کرتا اور خود لکھتا تو لوگوں کی خواہش تنوع پوری نہ ہوتی۔ جن حضرات نے نگار کی روش کا مسلسل مطالعہ کیا ہے اُن سے یہ حقیقت مخفی نہ ہوئی کہ رسالہ کا افادی پہلو بہ نسبت خیالی پہلو کے زیادہ قوی ہوتا جاتا ہے، یعنی میری یہ خواہش روز بروز زیادہ سنگین ہوتی جاتی ہے کہ لوگوں کے سامنے خواب و خیال کا لٹریچر پیش کرنے کے بجائے کوئی ایسی چیز پیش کیجائے جو بجائے قلب کو متاثر کرنے کے زیادہ تر دماغ کو متاثر کرے اور بجائے تخیل کے عملی قوت کے لئے محرک ثابت ہو، چنانچہ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ جنوری ۳۷ء کے رسالہ میں زیادہ تر کام کی باتیں کی جائیں اور وہ تمام باتیں صرف میری ہوں۔ وہ حضرات جو انشاء لطیف کے شائق ہیں ان کی تسکین کے لئے اصحاب کہف کا مکمل ڈرامہ پیش کیا جائے گا جو عربی سے اخذ و اقتباس کیا گیا ہے اور نہایت بلند تخیل کا نمونہ ہے۔ جو حضرات ندرت بیان اور انتقادی لٹریچر پسند فرماتے ہیں وہ غالباً یہ سنکر خوش ہوں گے کہ ایک نہایت بسیط مضمون اُن خطوط کے متعلق ہوگا جو آسکر وائلڈ نے سار برنہارڈ کو لکھے تھے۔ وائلڈ خلاق معانی تھا اور ندرت بیان، نزاکت تخیل اور طرز ادا کے تنوع میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا اس لئے ظاہر ہے کہ یہ مضمون کتنا دلکش اور کس قدر مرصع ہوگا۔ مذہبی مباحث سے دلچسپی لینے والے حضرات کے لئے مسئلہ خلافت و امامت پر ایک ایسا بسیط مضمون شائع کیا جائے گا جو شیعی نقطۂ نظر سے آخری لفظ کی حیثیت رکھے گا۔ ان کے علاوہ اور جو مقالات ہوں گے وہ تحقیقات تاریخی، ارتقاء علوم و فنون اور تازہ ترین معلومات سے متعلق ہوں گے اور حد درجہ شگفتہ و سلیس زبان میں لکھے جائیں گے اور اس لئے امید ہے کہ جنوری ۳۷ء کا نگار ہر شخص کے ذوق کی رعایت رکھنے والا ثابت ہوگا اور بہت پسند کیا جائے گا۔

راز حیدر آبادی سے

حال ہی میں ایک طویل مقالہ مسئلہ خلافت و امامت پر میرے محاکمہ کے جواب میں کسی صاحب راز حیدر آبادی کی طرف سے وصول ہوا ہے۔ چونکہ فاضل مقالہ نگار نے اپنا پتہ درج نہیں کیا اس لئے مجبوراً نگار کے ذریعہ سے ان کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ مناظرانہ انداز کا کوئی مضمون اس سلسلہ میں شائع نہیں ہوسکتا۔ یہ "قال اقول" قسم کا انداز گفتگو نہ مجھے پسند ہے اور نہ پبلک میں مقبول۔ اگر انہیں کچھ لکھنا ہے تو تحقیقی انداز میں لکھیں اور طرز بیان میں کوئی ایسی خشونت پیدا نہ ہونے دیں جس سے کھلم کھلا یہ معلوم ہو جائے کہ آپ باوجود ادعائے آزاد خیالی کے کسی ایک مخصوص جماعت سے تعلق رکھنے والے نہایت سخت قسم کے متعصب انسان ہیں۔ اگر وہ اپنا مضمون واپس لینا چاہتے ہیں تو اپنا پتہ براہ راست منیجر نگار کو لکھ بھیجیں۔

تاریخ صحافت پر ایک سرسری نظر

اب سے سوا سو سال پہلے ہندوستان میں صحافت و پریس کی جو حالت تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے :۔

لارڈ منٹو ہندوستان کے وائسرائے اور نواب سکندر جاہ بہادر فرمانروائے دکن تھے اُس زمانے کے رزیڈنٹ سیڈن ہام نے ولایت سے ایک ہوا بھرنے کا پمپ، ایک چھاپنے کی مشین اور ایک جنگی جہاز منگوا کر نواب سکندر جاہ بہادر کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کیا۔ مگر حکومت برطانیہ کو اعتراض ہوا کہ پریس جیسی مشین بادشاہ وقت کو کیوں سپرد کی گئی۔ رزیڈنٹ نے اس کا یہ جواب پیش کیا کہ حیدر آباد میں اس مشین کے رکھنے کے متعلق حکومت برطانیہ کو اگر کوئی تشویش ہوئی تو مشین توڑ کر ناکارہ کر دی جائے گی یہ تھا اُس زمانہ میں مطبع کا خوف ——— سترویں صدی کے وسط میں ایک انگریز نے بلا اجازت اخبار نکالا تھا تو اس کو حکومت نے موت کی سزا دی تھی۔ ہندوستان میں بھی سنہ ۱۷۶۸ء اور سنہ ۱۸۳۵ء کے درمیان بعض اڈیٹروں کو جلاوطن کیا گیا اور اسی اُصول کے ماتحت اہل برطانیہ کو ابتدا میں یہ گوارا نہ تھا کہ ہندوستان میں اخبارات جاری ہوں خاصکر دیسی اخبارات کی اشاعت اور ترقی سے اُنھیں کوئی خوشی نہ تھی۔

اخبارات کی ابتداء کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلا اخبار "اکٹا ڈرنا" نامی رومتہ الکبریٰ سے نکلا سنہ ۹۱ ق م میں روزنامچہ کے طور پر اس اخبار کی نقلیں دفاتر میں رکھی جاتی تھیں، کیونکہ فن طباعت اس وقت تک عام نہ ہوا تھا۔ طباعت کا موجد ننتنگ نامی چینی کا زرگر تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی لکڑی کی تختیوں پر حروف کھود کر کاغذ پر دبا تا تھا اور اس طریقہ سے طبع کیا ہوا ایک اخبار (سنہ ۶۱۸ء ق-م) میں دارالحکومت پیکنگ سے جاری ہوا تھا اس لئے سب سے پہلا اخبار یہی تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر اب یہ بات تسلیم کی جاتی کہ فن طباعت سنہ ۱۴۵۴ء میں رائج ہوا۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ ترقی یافتہ شکل میں سنہ ۱۴۵۴ء سے طباعت کا رواج ہوا لیکن باوجود اس کے اخبارات طبع نہ ہوتے تھے بلکہ کتابت ہو کر دست بدست دئے جاتے تھے چنانچہ دریافت امریکہ (سنہ ۱۴۹۳ء) کی خبر کولمبس کے جس خط میں درج تھی، اس کی عدہ نقلیں بد

[ب]ار لوگوں میں تقسیم ہوئیں۔[۱]

[یور]پ میں اخبارات کا آغاز مطبع کی سہولت پیدا ہونے کے بعد سب سے پہلے ۱۶۰۹ء میں جرمنی میں اخبار شائع ہوا۔ خیال کیا جاتا تھا کہ ۱۵۸۸ء میں سب سے پہلا اخبار انگلستان [میں] نکلا، مگر بعد کو تحقیقات سے ثابت ہوا کہ ۱۶۲۲ء میں پہلا پرچہ نکلا تھا۔ یہ پرچے کتابچے (پمفلٹ) کی شکل

[۱] ذیل کی جدول سے ممالک عالم میں اخبار نویسی کی ابتدا ظاہر ہوتی ہے۔

نام ملک	نام اخبار	سن اجراء
۱۔ چین	پیکن گزٹ	۹۰۰ء
۲۔ اٹلی	گزیٹیا	۱۵۰۰ء
۳۔ جرمنی	مشہور فرانکفورٹر جرنل	۱۶۱۵ء - ۱۶۰۹ء
۴۔ برطانیہ	ویکلی نیوز	۱۶۲۲ء
۵۔ فرانس	گزٹ دی فرانس	۱۶۳۱ء
۶۔ ڈنمارک		۱۶۶۳ء
۷۔ ناروے		۱۶۷۳ء
۸۔ سویڈن		۱۶۸۰ء
۹۔ امریکہ		۱۶۸۹ء
۱۰۔ روس		۱۷۰۳ء
۱۱۔ اسپین		۱۷۲۶ء
۱۱۔ ہندوستان	ہکی گزٹ	۱۷۸۱ء
۱۲۔ ترکی		۱۷۹۵ء
۱۳۔ مصر		۱۸۲۸ء
۱۵۔ ایران		۱۸۵۱ء
۱۶۔ ٹیونس		۱۸۶۲ء
۱۷۔ مالٹا		۱۸۶۹ء
۱۸۔ مراکش		۱۹۰۵ء

[۲] ۱۸۸۲ء میں دنیا کے تمام روزانہ اخبارات کی تعداد حسب ذیل تھی:-

نام ملک	تعداد اخبارات
۱۔ یورپ	۲۴۰۳
۲۔ ایشیا	۱۵۴
۳۔ افریقہ	۲۵
۴۔ شمالی امریکہ	۱۱۳۶
۵۔ جنوبی امریکہ	۲۰۸
۶۔ آسٹریلیا	۹۴
جملہ	۴۰۲۰

(یونیورسل ڈائرکٹری آف دی ورلڈ مطبوعہ ۱۸۸۲ء)

۴۴

میں عام طور سے ہفتہ میں ایک بار شائع ہوتے تھے۔

انگلستان میں، دار المغرب کی مانند مطابع بھی اولاً شاہی ملک سمجھے جاتے تھے اور بادشاہ کی اجازت حاصل کئے بغیر مطبع قائم کرنے اور کتابیں شائع کرنے پر سزا دیجاتی تھی۔

یہ اختیار شاہی، ۱۶۴۲ء میں پارلیمنٹ کو تفویض کیا گیا اور ۱۶۴۳ء میں پارلیمنٹ نے قانونِ مطابع نافذ کیا

---

۴۰ ۱۸۹۰ء میں کل اخبارات (۲۱۰۰۰) تھے۔ اور ۱۹۰۰ء کے ختم پر اخبارات کی تعداد بہ تفریق ممالک عالم یہ تھی:۔

ملک	تعداد	ملک	تعداد
برطانیہ و آئرلینڈ	۲۹۰۲	سیریا	۶
امریکہ	۱۵۹۰۴	ہندوستان	۹۰۰
فرانس	۲۴۰۰	سیون	۱۰
جرمنی	۳۲۷۸	سیام	۵
آسٹریا	۳۹۳	ڈنمارک	۱۴۵
ہنگری	۱۷	آئس لینڈ	۳
سویڈن	۲۱۳	ناروے	۱۳۲
بلغراد	۱۵	بلجیم	۲۹۰
مانٹی نگرو	۲	ہالینڈ	۳۱۲
روم	۲۲	ہکسمبرگ	۱۲
ایران	۳	روس	۲۸۰
جاپان	۱۵۰	اسپین	۳۳۸
جزائر شرق الہند	۳۰۹	پرتگال	۷۹
جنوبی افریقہ	۱۰۹	سوئٹزرلینڈ	۶۰۰
مغربی افریقہ	۱۰	یونان	۴۷
وسط افریقہ	۷۶	رومانیہ	۴۷
مصر	۲۱	سرویا	۲۴
کینیڈا	۷۴۲	کوئنس لینڈ	۱۰۹
جنوبی امریکہ	۳۴۰	جنوبی آسٹریلیا	۴۴
اٹلی	۲۵۱	وکٹوریہ	۳۱۰
مغربی آسٹریلیا	۱۸	تسمانیہ	۱۸
اوٹاگو	۲۸	ہاکس بے	۱۱
اسٹریٹ سیٹل منٹس	۱۲	کوچین چینا	۴
جزائر غرب الہند	۱۲۹	نیو ساؤتھ ویلز	۲۲۲
کینٹربری	۲۳	سٹرری	۳۶

جملہ ۳۱۰۲۲

(انسائکلوپیڈیا برٹانکا)

۱۶۴۱ء سے ۱۶۴۳ء تک یعنے پندرہ سال کے اندر انگلستان میں تین سو (۳۰۰) اخبارات جاری ہوئے جن میں صرف (۳۳) اخبار ایک سال سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔

اسی زمانہ میں (۱۶۲۵ء) جان ڈنگ نام نے پارلیمنٹ اسکوٹ کے نام سے ایک اخبار جاری کیا جس میں وہ خبروں کو اپنی رائے کے ساتھ شائع کرتا تھا اور اس لئے سب سے پہلا اخبار یہی ہے جس نے ایڈیٹوریل لکھنے کی اختراع کی۔ اس کی تنقید سے سیاسی حلقوں میں اس کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے۔ اور اس کو قید بھگتنا پڑی لیکن اس نے اخبار نویسی ترک نہیں کی اور جیل سے رہا ہونے کے بعد ایک اخبار اور (ماڈریٹ ان ٹیلی جنس) کے نام سے ۱۶۶۳ء میں جاری کیا۔

روزانہ اخبار انگلستان میں سب سے پہلے ۱۶۶۰ء میں جاری ہوا۔ آلیور ولمان نے ایک روزنامہ جاری کیا مگر یہ پرچہ صرف دو روز چلا۔ اس کا نام (پرفکٹ ڈرنل) تھا۔ اس میں پارلیمنٹ کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ ۱۶۶۵ء میں لنڈن گزٹ نامی اخبار سرکاری حمایت میں جاری ہوا۔ یہ سرکاری احکام قانون، قواعد وغیرہ کے علاوہ حکومت کی خبروں کو عوام میں پہونچایا کرتا اور ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا۔ یہ اسوقت تک جاری ہے۔

دیگر ممالک میں اب اس قسم کے سرکاری گزٹ عام ہو گئے ہیں۔ دنیا کی اکثر حکومتوں نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ اپنے کاروبار اور اغراض و مقاصد سے وقتاً فوقتاً رعایا کو مطلع رکھنا مناسب ہے۔ معلومات عامہ کے دفاتر کا وجود بھی اسی اصول کا منت کش ہے۔ ۱۷۰۰ء کے بعد ایڈیسن۔ رچرڈ اسٹیل جیسے فاضل اشخاص نے اخبار نویسی اختیار کی اور لوگوں میں علمی و معاشرتی مقالوں کا ذوق پیدا کیا۔

حکومت کی جانب سے ۱۷۱۲ء میں اخباروں پر ٹیکس عائد کیا گیا۔ متعدد اخبار نویسوں کے خلاف دعوے دائر کئے گئے۔ ۱۷۶۲ء میں "نارتھ برٹین" کے اڈیٹر جان ولکس پر بغاوت کا الزام عاید کیا گیا۔ عوام میں اس سے ہمدردی پیدا ہوئی اور اس کے اخبار کی اشاعت بڑھنے لگی۔ ۱۷۷۰ء میں جونیس ایک زبردست نامہ نگار تھا جو اسوقت کے سیاسی معاملات پر سخت تنقیدی مضامین "پبلک اڈوائزر" میں شائع کیا کرتا تھا۔

اس اخبار سے پبلک میں اخبار بینی کا مذاق پیدا ہوا۔ انگلستان اور فرانس کے مابین وقتاً فوقتاً جنگوں کے برپا ہونے اور ہندوستان میں انگریزوں کی آمدرفت کے باعث اہل انگلستان میں دیگر ممالک کی خبروں کو معلوم کرنے کا شوق بڑھتا گیا۔

۱۸۵۱ء میں اخباروں کی تعداد یہ تھی:۔

لنڈن	۱۵۹	اسکاٹ لینڈ	۱۱۰
انگلستان	۲۲۴	آئرلینڈ	۱۰۲

۱۸۶۱ء میں اخباروں پر جو قیود عائد تھے اُٹھا لئے گئے۔

۱۸۵۵ء میں ٹیکس بھی منسوخ ہوگیا۔ اس وقت سے ابتک انگلستان کی اخبار نویسی میں بغیر کسی مزاحمت کے نمایاں ترقی ہو رہی ہے۔

انگلستان کے چند مشہور اخبارات

انگلستان موجودہ روزناموں میں "مارننگ پوسٹ" سب سے قدیم ہے، جو ۱۷۷۲ء میں جاری ہوا۔

لنڈن ٹائمز ۱۷۸۵ء میں نکلا۔ یہ انگلستان کا زبردست ادارہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے نامہ نگار دنیا کے تمام ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے مقالے نہایت گرانقدر، وزنی اور موثر ہوتے ہیں۔ یہ دنیا کا نہایت باوقعت اخبار ہے۔

تیسرا مشہور روزنامہ "ڈیلی میل" یہ ۱۸۹۶ء میں جاری ہوا۔ اس کے مدیر نے پندرہ ہزار پونڈ کے سرمایہ سے اس کا آغاز کیا۔ ۱۹۲۱ء میں اس کا سرمایہ اکیس لاکھ پونڈ ہوا۔ یہ اخبار ایسوشیٹڈ نیوز پیپر کمپنی کی ملکیت ہے۔

ڈیلی میل کا مطبع بہت بڑا ہے اس میں متعدد مشینیں کام کرتی ہیں اور اخبار کی تقسیم کے لئے سیکڑوں موٹر کام کرتے ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں اس کی روزانہ اشاعت (۱۲۰۲۲۹۴) تھی۔ آج اسکی اشاعت بیس لاکھ بتائی جاتی ہے۔

لندن کے روزناموں میں "مانچسٹر گارڈین" بھی مشہور ہے۔ اس کے مضامین سنجیدہ ہوتے ہیں۔

"پنچ" ایک مشہور ظریفانہ اخبار ہے۔ اس میں مشہور اشخاص کی تصویروں کو مختلف کارٹونوں میں ظاہر کیا جاتا ہے اور ان کے طرزِ عمل اور حرکات و سکنات پر مزاقیہ تنقید کی جاتی ہے۔ واقعات، قصے کہانی کی صورت میں شائع کئے جاتے ہیں۔ اس اخبار کا مذاق نہایت مہذب ہوتا ہے۔

لندن میں سب سے پہلا باتصویر اخبار "ڈیلی گرافک" نکلا۔ عورتوں کے واسطے ۱۹۰۳ء میں مخصوص اخبار "ڈیلی مرر" شایع ہوا۔

مذکورۂ بالا اخبارات کے علاوہ انگلستان کے مقبوضات میں متعدد اخبارات مختلف مقاصد و اغراض کے ساتھ مختلف فنون و علوم پر شائع ہوتے ہیں۔

یہ تمام اخبارات کافی فائدہ کے ساتھ چل رہے ہیں اور بہت کم اخبار ایسے ہیں جو گھاٹے میں رہتے ہوں۔ کسی اخبار کو نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے تو اس کو دوسرے اخبار کے ساتھ ضم کر دیا جاتا اور مشترکہ قوت اس کو نقصان سے محفوظ کر دیتی ہے۔

فرانس کے اخبارات

پیرس کا اخبار لاکٹی جرنل کے دفتر میں ایک ہزار ملازم ہیں۔ دو لاکھ روپیہ کا

کاغذ ماہانہ صرف ہوتا ہے۔ بارہ لاکھ پرچے چھپتے ہیں۔ اور پچیس ہزار ایجنسیاں کھلی ہوئی ہیں۔

دوسرا اخبار "طان" ہے جو بارہ لاکھ روپیہ سالانہ صرف تاروں پر صرف کرتا ہے۔ اس کے دفتر میں (۴۰۰) ملازم ہیں اور اس کے (۱۰۰) اڈیٹر ہیں جو سب کے سب جید عالم و فاضل ہیں ۔ ان میں سے کسی کا مشاہرہ چار ہزار روپیہ ماہانہ سے کم نہیں۔ نامہ نگاروں کو ایک ایک مضمون کا معاوضہ بعض وقت (۵۰۰) روپیہ تک دیا جاتا ہے اور اس کی اشاعت کے واسطے اسپشل لوکل ٹرین سے کام لیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں اخبار کی ابتدا صحیح طور پر نہیں بتایا جاسکتا کہ ہندوستان میں سب سے پہلا اخبار کب، کس شہر اور کس کے زیر ادارت شائع ہوا، لیکن اسقدر مسلم ہے کہ ۱۷۴۴ء میں گورنمنٹ گزٹ نکلا جس میں سرکاری خبریں چھپتی تھیں، اور وارن ہیسٹنگز کے زمانہ میں ہکی نامی شخص نے ۱۷۸۰ء میں اپنے نام سے ہکی گزٹ شائع کیا۔ اسی کو سب سے پہلا اخبار تصور کیا جاتا ہے۔ اسوقت کے اخباروں میں کلکتہ کا ایک قدیم اخبار انگلش مین تھا جو (۱۰۰) سال تک جاری رہ کر گزشتہ سال بند ہوگیا۔ ۱۸۳۲ء تک ہندوستان میں صرف چھ انگریزی اور پانچ دیسی اخبارات شائع ہوتے تھے۔ لیکن ۱۸۶۰ء تک ان کی تعداد (۴۴) تک پہونچ گئی، ملکیوں کے زیر ادارت انگریزی زبان کا پہلا اخبار (انڈین مرر) ۱۸۶۳ء میں کلکتہ سے جاری ہوا۔

مشہور انگریزی "امرت بازار پتریکا" ۱۸۶۶ء میں نکلا۔ اور بنگالی نام کا انگریزی اخبار ۱۸۶۸ء میں اور بنگالی زبان کا "انند بازار" ۱۸۶۸ء میں جاری ہوا۔ بمبئی میں ۱۸۵۱ء میں گجراتی زبان کا پہلا اخبار زیر ادارت دادا بھائی نوروزجی شائع ہوا۔ پونا کا مرہٹی "مانا یران" ۱۸۴۷ء میں جاری ہوا۔ اُردو کا سب سے پہلا اخبار ۱۸۱۰ء میں کلکتہ سے مولوی اکرام علی صاحب نے جاری کیا۔ ۱۸۳۶ء میں مولوی محمد باقر نے اُردو اخبار نکالا۔ اور ۱۸۳۳ء میں سید الاخبار شائع ہوا۔ مرزاپور سے خیر خواہ ہند نامی سب سے پہلا رسالہ ۱۸۳۳ء میں ایک پادری صاحب کی ادارت میں نکلا۔ ۱۸۰۸ء میں بمقام کلاؤ گی کناڑی اخبار شائع ہوا۔ ۱۸۰۸ء میں دھارواڑ میں تین اور بلگام میں تین اخبار نکلے۔ میسور میں پہلا مطبع ۱۸۴۰ء میں گیارٹ نامی پادری نے قایم کیا۔ ۱۸۱۶ء سے سرکاری گزٹ شائع ہونے لگا۔

اس کے علاوہ میسور سے اسٹار۔ اندا تانت پتر (کناڑی) اخبارات کے علاوہ ڈیلی پوسٹ اور ایوننگ میل نامی انگریزی اخبار ایک مدت سے شائع ہو رہے ہیں۔

تلنگی زبان کے مشہور اخبار (۱) "اندھرا پتریکا" تلنگی زبان کا یہ سب سے زیادہ مشہور اور مقبول اخبار ہے۔ اس نے تلنگی زبان کی احیا میں بڑا حصہ لیا ہے

اور یہ لٹریچر میں جدید تحریکات کا حامی ہے۔

(۲) آندھرا پرشاد پتریکا - بڑا ممتاز اخبار ہے۔

(۳) بھارتی - تحقیقی مقالے شائع کرتا ہے۔

(۴) ساہتی - نظمیں بہت زیادہ شائع کرتا ہے - جدید طرز کی حمایت کرتا ہے۔

(۵) شاردا - قدیم اور جدید خیال کے لوگوں میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

(۶) سرسوتی اور نجواتی - یہ دونوں غیر مطبوعہ تصانیف بہ اقساط شائع کرتے ہیں لیکن نجواتی بند ہوگیا ہے۔

جنگ عظیم کے بعد سے ہندوستان کے اخباروں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ جس کا اندازہ ذیل کے اعداد سے ہوگا۔

(۱)	سنہ ۱۹۱۹ء	۸۸۳	(۶)	سنہ ۱۹۲۳ء	۱۳۶۳
(۲)	سنہ ۱۹۱۹ء	۹۴۱	(۷)	سنہ ۱۹۲۴ء	۱۴۰۱
(۳)	سنہ ۱۹۲۰ء	۱۰۱۷	(۸)	سنہ ۱۹۲۵ء	۱۴۷۸
(۴)	سنہ ۱۹۲۱ء	۱۰۹۴	(۹)	سنہ ۱۹۲۶ء	۱۴۸۵
(۵)	سنہ ۱۹۲۲ء	۱۲۸۲	(۱۰)	سنہ ۱۹۲۷ء	۱۵۲۵

ماہوار رسالے ان کے علاوہ ہیں - یہ تعداد صرف اخبارات کی ہے۔

دکن میں صحافت کا آغاز دار الطبع سنہ ۱۸۶۹ء میں قائم ہوا - سنہ ۱۸۳۹ء میں پوسٹ آفس رزیڈنسی میں تھا - سنہ ۱۸۶۹ء سے افضل گنج میں قائم ہوا - اور ریل سنہ ۱۸۶۴ء میں جاری ہوئی - ٹپہ اور ریل کے وجود سے دکن میں اخبارات شائع کرنے کی سہولت پیدا ہوئی۔ سب سے پہلے سنہ ۱۸۶۱ء میں رسالہ طبابت کا اجرا عمل میں آیا - اس کے بعد خورشید دکن سنہ ۱۸۷۵ء میں جاری ہوا - سنہ ۱۸۷۸ء میں شفق اور نظام الاخبار نکلے - عہد عثمانی سے پہلے مستقل طور پر صرف ایک پرچہ مشیر دکن روزانہ شائع ہوتا تھا مگر اب اس کے علاوہ رہبر دکن، صبح دکن، صحیفہ، منشور، پیام روزانہ اور الاعظم - نظام گزٹ، رعیت ہفتہ وار نکلتے ہیں - الاعظم حال میں بند ہوگیا ہے باقی سب اخبار ملک کی مفید خدمت انجام دے رہے ہیں - رہبر دکن سب سے زیادہ اشاعت رکھتا ہے۔

امریکہ کے اخبارات امریکہ میں اخباروں کی اشاعت روز افزوں ترقی پر ہے - سنہ ۱۹۱۴ء میں اس ملک میں اخبارات ۲۰ کروڑ ۵۰ لاکھ کی تعداد میں شائع ہوتے تھے - اکثر روزنامے بڑے سائز کے ۲۴ صفحوں پر ہوتے ہیں - علاوہ اس کے یکشنبہ کی خصوصی اشاعت ایکسو صفحے

پر محیط ہوتی ہے۔

انگلستان اور امریکہ میں اخبارات تعلیم کے زبردست ذرائع تصور کئے جاتے ہیں۔ امریکہ کے اکثر اخبارات سرکاری عہدہ داروں کی بے عنوانیوں پر سخت تنقید کر کے ان کو ادائے فرائض کی جانب متوجہ کرتے ہیں۔

برطانیہ کے اخبار نویسوں کی انجمن

برطانوی اخبار نویسوں نے ایک انسٹی ٹیوشن قائم کر لی ہے، جس کے زیر اثر وہ سالانہ کانفرنس منعقد کرتے ہیں اور اُس کے انعقاد کے لئے بڑا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس انجمن کے ارکان برطانیہ کے مشہور اخبار نویس ہیں۔ انجمن کی رکنیت کے لئے بہت سخت شرائط ہیں تاہم اس کے ارکان کی تعداد دو ہزار سے زائد ہے۔ یہ انجمن اخبار نویسوں کی بہبودی اور خوشحالی پیش نظر رکھتی ہے۔ اخبار نویسوں میں جب کوئی فرد مشکلات میں گھر جاتا ہے تو انجمن اس کی مدد کرتی ہے۔ جب کوئی اخبار نویس اپنے خاندان کو مفلسی میں چھوڑ کر مر جاتا ہے تو اس خاندان کی مدد کے واسطے انجمن کا سرمایہ کام آتا ہے۔ جو اخبار نویس مدت تک کام کر کے تھک جاتے ہیں، ان کی تفریح طبع اور آرام و راحت کے سامان بہم پہونچائے جاتے ہیں۔ اخبار نویسوں کے لئے مالک اور مالکوں کے لئے اخبار نویس فراہم کئے جاتے ہیں ایک ذیلی مجلس اخبار نویسوں کی قائم ہے اور ایک ماہوار رسالہ نکالتی ہے اس انجمن کے جلسوں میں انگلستان کے وزیر اعظم اور ارکان کابینہ وغیرہ شریک ہو کر اخبار نویسوں کے ساتھ یکجہتی اور ہمدردی ظاہر کرتے ہیں اور انجمن کی ترقی کے ذرائع مہیا کرتے ہیں۔

اخبار کے اثرات

یہ کہنا بجا ہو گا کہ موجودہ زمانہ میں عوام کی بیداری، اور ذمہ دار حکومت کے حصول کی تحریک میں اخباروں کا بہت زیادہ حصہ ہے۔ جلسوں میں تقریریں سننے والوں کی تعداد کم ہوتی ہے لیکن اخبار پڑھنے والے بکثرت ہوتے ہیں۔ جلسے اور مباحثے شہروں تک محدود ہیں۔ برخلاف اس کے اخبار قصبات اور دیہات تک پہونچتے ہیں۔ جلسے سال میں چند ہی منعقد ہو سکتے ہیں، مگر اخبارات ہر ہفتہ اور ہر روز دیکھے جا سکتے ہیں۔ علاوہ بریں جلسوں کی تقریروں کو فراہم کرنا، ان کو سمجھانا اور ان کو ان اشخاص تک پہونچانا جو جلسوں میں نہیں تھے، یہ سب کام اخبارات انجام دیتے ہیں۔ اس لئے ہم بلا شک و شبہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ پبلک معاملات کو سلجھانے کا اخبار ایک زبردست اور موثر ذریعہ ہے۔

اب یہ توقع بیجا نہیں ہے کہ برٹش انڈیا کی حکومت رفتہ رفتہ عوام کے ہاتھوں میں آجائے گی۔ اور جمہوریہ حکومت کا اخبار ایک اہم جزو بن جائے گا۔ اور پبلک کا حقیقی ترجمان ہو گا۔ انگلستان میں اخبار کو سلطنت کا چوتھا رکن کہا جاتا ہے۔ اخبار ملک کی روزانہ زندگی کا آئینہ ہے۔ اس لئے عوام کی قابلیت اور موزونیت کو جانچنے کے واسطے اخباروں کو دیکھنا کافی ہو گا۔

دیسی اخبارات اور ملک کے اعلیٰ طبقوں کی بے التفاقی انگلینڈ۔ امریکہ۔ فرانس۔ جرمنی اور جاپان۔ اخبارات کو جو درجۂ قبول اور شہرت حاصل ہے محتاج بیان نہیں۔ ان اخبارات کا مقابلہ ہمارے ملک کے اخبارات نہیں کر سکتے۔

ہندوستان کے انگریزی اخباروں میں تین چار کے سوا کسی اخبار کی حالت اچھی نہیں۔ اکثر انگریزی اخباروں کی حالت بہت سقیم ہے۔ اس بے التفاقی کو دور کرنے کی کوشش کرنا ہمارا پہلا فرض ہے، یہ کام ہمارے ذاتی فائدے کے لئے نہیں بلکہ ملک کے مفاد کے لئے ضروری ہے۔ انگریزی اخبارات کو جو وقعت دیجاتی ہے اس کی نصف اہمیت بھی ملکی اخبارات کو دی جائے تو دیسی صحافت چمک اُٹھے۔

اخبار کی ظاہری خوبصورتی اگر اخبار کی کتابت، طباعت اور ظاہری شکل وصورت اچھی نہو تو وہ زیادہ خریدار فراہم نہیں کرسکتا۔ عوام کا یہ رجحان نہیں ہے کہ وہ اخبار بینی کو بطور ایک فرض کے انجام دیں۔ اخبار بینی کا شغل اس لئے ہوتا ہے کہ تردد رفع ہو یا تفریح طبع کی جائے یا بعض خبریں معلوم کی جائیں۔ ایسی حالت میں بھدے کاغذ پر اخبار طبع کرنا گویا پبلک کو مکدر کرنا اور نقصان کو دعوت دینا ہے۔

" اخبار کی کتابت۔ طباعت اور صحت کا، کوشش اور تردد کے ساتھ، خیال رکھنا اور نیز تاریخ معینہ اور وقت مقررہ پر شائع کرنا ضروری ہے "

اخبار کا مواد اخبار کے مواد کو ہم چار اجزا میں تقسیم کر سکتے ہیں :-
(۱) خبریں (۲) بحث ورائے (۳) تعلیمی مقصد (۴) اشتہارات۔

خبریں :- ہمارے اخبارات اس معاملہ میں انگریزی اخبارات کے تبع ہیں۔ خبروں کے انتخاب اور ترتیب میں ایک سلیقہ، ایک تسلسل درکار ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ عوام کے روزمرہ کاروبار کے لئے ضروری معلومات فراہم ہوں۔ خبریں جب تک معتبر ذرائع سے نہ پہنچیں اس وقت تک ان کا شائع کرنا مناسب نہیں، ہر خبر کا پورا ثبوت موجود ہونا ضروری ہے۔

حکومت کی تبدیلیاں، علمی ترقیاں، معاشرتی مجلسیں، اُن کی رودادیں، مشہور لوگوں کے حالات، تجارتی تغیرات، ایجادات واختراعات وغیرہ کا اندراج اخبارات میں ہونا چاہئے۔ اگر یہ مواد اپنے ہی ملک سے متعلق ہو تو اس کے لئے زیادہ اہمیت دینی ہوگی۔ منگھڑت خبروں اور بے سروپا واقعات کا شائع کرنا کارآمد نہ ہوگا! اس سے اخبار کی غرض پوری ہونا ممکن نہیں۔ اخبار کو انگریزی میں نیوز پیپر کہتے ہیں یعنی خبر ہی اُسکا اہم جز ہے۔ نیوز انگریزی لفظ ہے اور مرکب ہے News سے۔ N سے مراد North شمال، E سے مراد East مشرق، W سے مراد West مغرب، S سے مراد South جنوب ہے یعنے چاروں سمت سے جو خبر

آتی ہیں ان کے مجموعہ کا نام نیوز پیپر یا اخبار ہے۔

خبریں بالواسطہ ہوں یا بلاواسطہ ضروری ہے کہ وہ انسانی زندگی سے وابستہ ہوں۔ روزانہ اخبار کو کم ازکم ایک صفحہ اور ہفتہ وار اخبار کو کم ازکم دو تین صفحے ملک کی خبروں کے لئے مخصوص کرنا چاہئے، اور ان خبروں کی ترتیب اس طرح ہونا چاہئے کہ مقامی حالات پہلے پھر ملک کے حالات اور آخر میں غیر ممالک کے واقعات درج ہوں۔ خبریں اہمیت کے لحاظ سے منتخب کرکے شائع کرنے سے قارئین اخبار کو فائدہ پہونچتا ہے۔

مختصر نویسی ہر دیسی زبان میں مختصر نویسی کا رواج ہونا چاہئے۔ آج کل بڑے بڑے مقامات میں جلسے اور تقریریں ہوا کرتی ہیں۔ ان تقریروں کو شائع کیا جاتا ہے، لیکن مقرر کے لہجہ سے پیدا شدہ جذبات مفقود ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ فن مختصر نویسی کو ترقی دیجائے۔

اخبار نویس کو چاہئے کہ " وہ اپنے طرز تحریر کو سادہ اور معقول رکھے۔ اس میں جامعیت اختیار کرے۔ اور جو کچھ لکھے بہت سوچ سمجھ کر لکھے "۔

اخبار نویسوں کے طبقہ میں کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جو یہ دعوے کرے کہ جو خود کر رہا ہے ٹھیک ہے اور جو خود جانتا ہے وہ صحیح ہے اس کے علم میں کوئی نقص نہیں ہے۔ انسان آخر انسان ہے۔ ہماری آنکھیں ایسی نہیں کہ فوق الفطرت نظام کو دیکھ سکیں۔ آج جو چیز ہم کو صحیح معلوم ہوتی ہے وہ ممکن ہے کہ کل غلط ثابت ہو۔ دنیوی حالات کے متعلق یہ کہنا کہ ہمارا علم صحیح ہے، غلط ہے۔ ہماری قوت محدود ہے۔ ہمارا علم محدود ہے۔ ہماری نظر بھی محدود ہے۔ ممکن ہے کہ ہم سے غلطیاں ہوں تاہم ہم میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ دنیا کے حالات کے متعلق اپنی رائے اس طرح ظاہر کریں کہ دوسروں کو ناگوار نہ ہو، اور یہی کامیاب اخبار نویسی کی دلیل ہے۔

اخبار پبلک کا وکیل ہے جمہوری حکومت میں اخبار کو پبلک کا باطن کہا جا سکتا ہے۔ باطن کا سب سے اہم فعل یہ ہے کہ غور و خوض کرے۔ بادشاہ کے لئے جس طرح وزیر کی ضرورت ہے، اسی طرح پبلک کے حق میں بطور وکیل کے اخبار کی حاجت ہے، یعنے وہ حکومت کے معاملات پر تفصیل سے بحث کرے۔ اور ذمہ داریوں کو سمجھے۔ زمانۂ قدیم میں وزراء بادشاہ کے ساتھ امور سلطنت پر بحث کرکے اپنا مشورہ دیتے تھے۔ اور تصفیہ بادشاہ پر چھوڑ دیتے تھے۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں اخبار کا فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ عوام میں رائے صائب کے اظہار کی قابلیت پیدا کردے۔ لیکن ہمارے اخبار نویس اپنی رائے کو قطعی، بے عیب اور صحیح تصور کرتے ہیں، وہ یہ نہیں خیال کرتے کہ ممکن ہے دنیا میں ایسے قابل لوگ اور ہوں جن کو وہ نہیں جانتے اور یہ بھی ممکن ہے کہ دوسروں کی رائے صداقت پر مبنی ہو۔ جب تک معاملہ کے تمام پہلو اخبار نویس کی نظر میں نہ ہوں اسوقت تک اس پر رائے دینے میں جلدی اور جرات نہ کرنی چاہئے۔

برٹش انڈیا کے عہدہ داران اخبارات کی رائے پر اعتراض کرتے ہیں اُن کا کہنا یہ ہے کہ جب وہ مسائل کے ہر پہلو پر غور کرتے ہیں، انصاف اور ناانصافی میں امتیاز کرتے ہیں تو اس کے باوجود عوام کے نمایندے کیوں صدائے احتجاج بلند کرتے اور اخبارات کیوں چیخ پکار کرتے ہیں۔

آزادی خیال اگر عوام کو مناسب حد تک آزادی خیال اور غور وفکر کا موقع نہ دیا جائے تو ڈر ہے کہ ان کا جوہر قابل زائل ہو جائے۔ اخباروں کو لازم نہیں ہے کہ اپنی ہی رائے پر مصر رہیں اور عوام کو اپنی عقل کے استعمال کا موقع نہ دیں۔ ماں کی یہ خواہش رہتی ہے کہ بچہ دودھ کو ہضم کرے۔ وہ نوالہ کو خود اپنے منھ میں چبا کر اپنے بچہ کے منھ میں نہیں ڈالتی۔ بلکہ اس کے منھ میں نوالہ رکھ دیتی ہے اور اسے چبا لینے اور ہضم کر لینے کا موقع دیتی ہے۔ اخبار نویس کو چاہئے کہ ملک کے واقعات، خبروں کی شکل میں پبلک تک پہونچاتا رہے۔ حالات کے متعلق افتتاحیہ مقالے لکھے اور ایسی تنقید کرے جو دلائل پر مبنی ہو مسائل حاضرہ کے محاسن و نقائص بتلائے۔ کسی غلط بیان پر قائم نہ رہے، نہ کسی امر پر ضد کرے۔ ملکی ضروریات کا اشارہ کرنا بلکہ عوام کو ان کے مطالبہ کا موقع دینا اخبار نویسی کا راز ہے۔ اخبار نویس کا منصب یہ نہیں کہ اصول کا تعین کرے بلکہ یہ ہے کہ اصول تک پہونچنے کا ذریعہ بتائے۔ اس لئے اخبار کے مباحثی اجزا میں پہلا جو اہم جزا ایڈیٹوریل ہے اس میں جذبات سے کام نہ لے بلکہ سنجیدہ تبصرہ کرے۔

نکتہ چینی فطرتاً ہم میں آزاد خیالی کا فقدان ہے۔ مقدس صحیفوں کی عقیدت، بزرگوں کی ارادت، بادشاہوں کی وفاداری عزیز واقارب کی وابستگی، رسوم کی پابندی ہمارے ضمیر میں داخل ہے۔ اس لئے پبلک کو آزادخیالی کی تعلیم دینا بازیچۂ اطفال نہیں۔ علاوہ بریں موجودہ زمانہ میں نئے نئے گروہ، نئے نئے خیال کے حامی پیدا ہو رہے ہیں۔ ایسے وقت میں اخبارات ہی کے ذریعہ سے پبلک میں بیداری پیدا ہو سکتی ہے۔ عوام کچھ بھی کہیں لیکن دلیل کے ساتھ کہیں۔ رائے عامہ ناجائز دباؤ سے متاثر نہ ہو، بلکہ غور وخوض پر مبنی ہو۔ اس لئے اخبار نویسوں کا فرض ہے کہ پبلک کو اس کا طریقہ بتلائیں۔ اخبار نویس کو ایسی نکتہ چینی نہ کرنی چاہئے جس سے نفرت پھیلے، کیونکہ ایسے اخبار کے ساتھ کوئی حکومت ضبط وخاموشی اختیار نہیں کر سکتی جو راعی اور رعایا کے درمیان منافرت کا تخم بوئے۔

یورپ اور امریکہ کی اخبار نویسی کا زبردست عیب نکتہ چینی سے مراد نری خشک بحث نہیں ہے بلکہ اس سے غرض یہ ہے کہ نوابعض کی باریکیاں تلاش کی جائیں یہ کہنا آسان ہے کہ "سچ کہو اور نیکی کرو"، لیکن حق اور نیکی کی تلاش محال ہے۔ وہ اکثر پوشیدہ رہتے ہیں۔ ان کو ڈھونڈنے کے لئے صرف ایک ہی روشنی ہے، وہ ہماری عقل کی روشنی ہے۔ بحث تجسس، نقد و تبصرہ اس کی شعاعیں ہیں۔ انسانی کاروبار میں ایسا نہیں ہوتا کہ ایک طرف صداقت اور دوسری طرف کذب ہو۔ یا ایک جانب انصاف اور دوسری جانب ظلم بلکہ دنیا میں دونوں چیزیں ملی جلی ہیں۔ اسی آمیزش کو الگ کرنا اور صداقت کو

ڈھونڈنا تنقید کی اصلی غایت ہے ۔ پبلک کا آزادیِ خیال سے آگاہ ہونا ضروری ہے ۔ اس کی ذمہ داری اخبارات پر ہے ۔ جمہوریہ حکومت سے یہ مراد نہیں ہے کہ اس حکومت کا کوئی دشمن نہیں ۔ بیرونی دشمنوں کو ایک طرف رہنے دیجئے ۔ اندرونی دشمنوں کی کیا کمی ہے ۔ یہی دشمن پبلک میں باغیانہ خیالات پھیلاتے ہیں ۔ سراسر مغالطے پیدا کرتے ہیں ۔ پیچیدہ مسائل میں پھنساتے ہیں ۔ غصہ کی آگ کو بھڑکاتے ہیں اور جذبات میں تلاطم پیدا کر دیتے ہیں ملک کے لئے پبلک کی حکومت کی ضرورت ہے نہ کہ اخبار نویسوں کی حکومت ۔ اخبار ایک مقدس اور اہم چیز سہی لیکن اس سے بھی مقدس پبلک ہے ۔ پبلک مفاد کا اخبار صرف ایک آلہ ہے ۔ آلہ کا کام نہیں کہ ملک میں خود فراموشی پیدا کرے ۔ اس قسم کی بداطواریاں امریکہ اور یورپ میں دیکھی جاتی ہیں ۔

اخبار کے افکار و مباحث کے ضمن میں دوسری اہم شئے مراسلت ہے ۔ ہمارے ملک میں یہ طریقہ ابھی اتنا ترقی پذیر نہیں ہوا ہے ۔ اس حصہ میں ایسے مضامین شائع ہونے چاہئیں جو اخبار نویس کے خیال میں نہ آئے ہوں ، اور جو پبلک کی تکالیف اور ضروریات اور دیگر معاشرتی مسائل پر رائے زنی کریں ۔ انگلستان کے مشہور اخبارات کا یہ حصہ نہایت دلچسپ ہوتا ہے ۔ رہبرانِ قوم کی امداد کے بغیر اس کا تحریر میں لایا جانا ناممکن ہے ۔ اس لئے اخبار نویسوں کا یہ فرض ہے کہ اکابرِ قوم کو لکھنے کی ترغیب دیں اور اُن سے اچھوتے مضامین حاصل کرنے کی کوشش کریں ۔

فرضی مضمون نگار جہاں تک ممکن ہو اخبارات میں مضمون نگاروں کو اپنا نام ظاہر کرنا چاہئے ، کیونکہ ان کے مضامین ذمہ دارانہ حیثیت رکھتے ہیں جس سے دوسروں کو بھی اس طرح لکھنے کا حوصلہ ہوتا ہے ۔ بے نام مضامین کی وقعت کم ہوتی ہے ۔ البتہ خاص خاص موقعوں پر اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ نام نہ لکھا جائے ۔ بقول ایک نامور گمنام نویس کے نام نہ ظاہر کرنے کا طریقہ اس اصول پر مبنی ہے کہ صدہا باتیں دوسروں تک گمنام گوئی کے ذریعہ پہونچتی ہیں اور ان میں سے بعض اس قدر قیمتی اور ضروری اور بروقت ہوتی ہیں کہ ان کی وجہ سے بڑے بڑے اور سچے واقعات پر روشنی پڑتی ہے ۔

حال میں اکثر نامہ نگاروں نے فرضی نام سے مذاقیہ مضامین کو اخبارات میں لکھنا شروع کیا ہے ۔ مذاق ہر شخص کو مرغوب ہے ۔ مذاق ایسا ہونا چاہئے جو ذوق پر گراں نہ ہو ۔ انگریز نامہ نگاروں میں یہ چیز فطری ہو گئی ہے ۔ اس لئے ان کے مذاقیہ مضمون سے کسی کی عزت میں فرق نہیں آتا ۔ لیکن ہمارے ہاں اس قسم کا مذاق مشکل سے ملتا ہے ۔ اس معاملہ میں ہم کو بہت احتیاط کام میں لانی چاہئے ۔ اخبار کو اولاً وقار کی ضرورت ہے جس کا مدار مضامین کی سنجیدگی اور صداقت پر ہے ۔ متانت اور صداقت کے ساتھ اگر مذاق کیا جائے تو مضائقہ نہیں ورنہ صرف مذاق ہی مذاق بدمزاقی کی دلیل ہوگی ۔

تنقید کی غرض حکومت کے اغراض و مقاصد پر غور کرنا اور اس کے نظم و نسق کی غلطیاں حکومت کو بتانا اخبار کا فرض ہے۔ لیکن اس میں اخبار کو اپنے حدود کے اندر رہنا ضروری ہے۔ ذاتی خصومت، خودغرضی، جانبداری اگر یہ چیزیں اخبار کے مطمح نظر ہوں تو اس سے اخبار کا وقار باقی نہ رہیگا۔ اڈیٹر کے قلم سے جس قدر وزنی، مدلل اور برمحل الفاظ نکلیں، اسی قدر اس کے اخبار کا اثر دیرپا اور مستقل ہوگا۔ نکتہ چینی سے دوسروں کو صدمہ پہونچانا بہت آسان ہے، لیکن یہ دشوار ہے کہ نکتہ چینی سے اس کی گرفت میں آیا ہوا شخص اسکی صداقت سے انکار نہ کرسکے۔ ہماری تنقید کے شکار گو اس وقت قہر و غضب ظاہر کریں لیکن اگر بعد کو اس تنقید کی قدر اور عزت کریں تو اس وقت نکتہ چینی کا مقصد پورا ہوگا۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ ہمارے مضامین میں سچائی اور غیر جانبداری ہو۔ نیز حکومت کی نسبت جو کچھ لکھا جائے اس میں ادب اور تعظیم کو نصب العین بنایا جائے۔ حکومت یا پبلک کی نکتہ چینی میں خیرخواہی اور سنجیدگی کو ہاتھ سے نہ دیا جائے۔

مضامین کا انتخاب مضامین کے انتخاب میں اہم و غیر اہم کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ عام طور سے معمولی مسائل پر بار بار لکھنا مفید نہیں۔ انسانی جماعت کو لاکھ بے عیب بنانے کی کوشش کیجئے، پھر بھی اس کے اندر چند نقائص ضرور باقی رہ جائیں گے۔ لوگوں کی اصلاح کے خیال میں دوسرے اہم معاملات کو نظرانداز کرنے کا اندیشہ ہے۔ اخبار والوں کو یہ نہ چاہئے کہ خواہ مخواہ معمولی مسئلہ کو بار بار چھیڑیں اس معاملہ میں برطانیہ کے اخبار نویس خاص دلچسپی لے رہے ہیں اور غور کر رہے ہیں کہ اخباری دنیا سے اس مرض کو کس طرح رفع کیا جائے۔

محنت رائیگاں نہیں ہوتی حکومت کے کاروبار کو جانچنا، ضروری اصلاحات کو ساتھ ساتھ پیش کرنا اخبار کا اہم فرض ہے، ہمارے اخبارات میں یہ جز ابھی متانت کو نہیں پہونچا ہے۔ مضامین میں اشتعال انگیز جذبات اور رنگین عبارت کے عوض صرف واقعات کو احتساب و تمثیلات سے واضح کرنا مفید ہے۔ مضمون نگار کو چاہئے کہ پہلے سرکاری اغراض و مقاصد کا غور سے مطالعہ کرلے اور اس کے بعد سرکاری کاروبار پر قلم اٹھائے۔

تعلیمی مضامین قوم کی بڑی خدمت ہوگی اگر ملک کے علماء، سائنس داں اور ماہران فن و نیز مختلف پیشہ کے تجربہ کار افراد تعلیمی اغراض کے مدنظر اخبارات میں مضامین لکھتے رہیں۔ انگریزی اخبار میں اکثر ایسے مضمون نظر آتے ہیں۔ جن لوگوں میں ادب و علوم و فنون کا ذوق مفقود ہوتا ہے وہ سیاسی امور کو جاننے کے قابل نہیں ہوتے۔ ابتک ہمارے اخبارات پبلک کو خواب غفلت سے بیدار کرتے رہے۔ اب ضرورت ہے کہ پبلک میں معاملہ فہمی کی قابلیت بڑھائی جائے، ورنہ پبلک کی بیداری نتیجہ خیز نہ ہوگی۔

تجربہ کار لوگ نامہ نگاری اختیار کریں

کیا اچھا ہو اگر ہمارے ملک کے سرکاری عہدہ دار جو ملازمت سے فراغت حاصل کرکے وظیفہ حاصل کر رہے ہیں، قوم کو اپنے تجربہ سے مفید معلومات بہم پہونچائیں، مجھے یہ معلوم ہے کہ یہ کام آسان نہیں کیونکہ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی وظیفہ یاب آرام سے پاؤں پھیلائے بیٹھنے اور فراغت سے وقت گزارنے کے بجائے اس مشغلہ میں محنت کریگا۔ لیکن ہم کو چاہئے کہ ایسے لوگوں کے پاس پہونچکر نہایت ادب سے ان پر ظاہر کردیں کہ ان کی اس قسم کی زندگی نقصان دہ ہے اور اس وقت ملک کے لئے ان کی خدمات درکار ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ لوگ ہماری درخواست قبول کرلیں گے اور اپنے تجربہ سے ہم کو فائدہ پہونچائیں گے۔ اس لئے ہمارے اخبار نویس اس جانب توجہ کریں اور ملک میں جو لوگ اچھے کام کرنے والے ہیں اُن کی قدر کریں۔

رہبرانِ قوم، مشہور وکلا، مجلس بلدیہ کے ارکان، علماء و حکما، مختلف انجمنوں کے معتمدین کا مضمون نگاری کرنا بہت نفع بخش ہوتا ہے۔ ہمارے قائدین جس طرح بڑے بڑے جلسوں میں بار ہا تقریریں کرتے ہیں اسی طرح کم از کم سال میں سات آٹھ مرتبہ مضامین لکھا کریں تو اس سے ان کا بھی فایدہ ہے، اخبار کا بھی اور عوام کا بھی، مغربی ممالک میں ایسے لوگ بکثرت مضمون لکھتے ہیں اور ملک و قوم کو فایدہ پہونچاتے ہیں۔

بسمارک کو اخبار نویسی میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ گلاڈسٹن زبردست نامہ نگار تھا۔ ان کے علاوہ ٹمپل، ڈف، امیتور، لائل، کالون، گریفن، ہنٹر، ڈگلس، وغیرہ انگلستان کے ان مایہ ناز افراد سے ہیں جنھوں نے وظیفہ حسن خدمت لینے کے بعد اپنی تمام عمر نامہ نگاری میں بسر کی اور حب وطن کا ثبوت دیا۔

اخبار کی قوت

یہی نہیں کہ اخبارات عوام کے لئے کچھ کر سکتے ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ ان کو کچھ کرنے سے روک سکتے ہیں ان کو کچھ کرنے پر ابھار سکتے ہیں۔ اکثر بے ضابطگیاں اور ناانصافیاں مسدود کر سکتے ہیں بعض ملزمین ایک طرف عدالت اور پولیس کی تفتیش سے اور دوسری طرف بدنامی کے ڈر سے بدکاری سے باز آتے ہیں۔ اس طرح اخباری اشاعت کے ڈر سے اکثر عہدہ دار اور زبردست اشخاص اپنے ناروا افعال سے رک جاتے ہیں۔ اس لئے سب سے بڑا فرض اخبار کا یہ ہے کہ جن کی برائیوں سے ملک اور سوسائٹی کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو، ان پر آزادانہ نکتہ چینی کرے۔

اخبار پبلک کی ملک ہے

ملک کے ہر فرد کو یہ احساس ہونا چاہئے کہ اخبار اپنا ہے۔ اور اس کی خدمت اخبار کے واسطے لازم ہے۔ اس کا نیک و بد اپنا نیک و بد ہے۔ اس کا نفع و نقصان اپنا سود و زیاں ہے۔ اس خیال کے تحت میں اس کو استطاعت ہو تو، اخبار کا خریدار بننا، اخبار کی اشاعت بڑھانا اور اگر استعداد ہو تو وقتاً فوقتاً اس میں اپنے خیالات ظاہر کرنا چاہئے۔ اس کے بغیر اخبار کی حالت

درست نہیں ہو سکتی، اور نہ قوم کی خدمت خاطر خواہ انجام پا سکتی ہے۔

علمی مسائل اور قومی مباحث

ہمارے اخبارات میں مضامین کا تنوع مفقود ہے۔ عام طور سے تار برقیاں یا سیاسی معاملات درج ہوتے ہیں۔ ادب و تاریخ کے مقالے بہت کم نظر آتے ہیں۔ علمی مضامین، معاشی مسائل اور مغربی تہذیب کی بہترین خصوصیات پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ معاشی وسائل پر التفات نہیں کیا جاتا اور معاشرتی مسائل بہت کم معرض تحریر میں آتے ہیں۔ ہمارے مذہبی تعصبات اور مذہبی ادارے تمام ملک میں فساد کا بیج بو رہے ہیں۔ کیا اخبارات کا یہ کام نہیں ہے کہ عوام کی توجہ اس جانب منعطف کر کے ان میں پاکیزہ خیالات پیدا کریں، اور اس خصوص میں انگریزی اخبارات کی تقلید کریں۔ مختلف موضوعات پر خیال آرائی کر کے ہمارے اخبارات پبلک کے لئے نہایت دلچسپ اور منفعت بخش ہو سکتے ہیں۔ ملایانہ اور طالبعلمانہ بحث میں پڑنے کی حاجت نہیں اور نہ مذہبی مباحث میں دخل دینے کی ضرورت۔

نئے نئے اور اصطلاحی الفاظ کا وضع کرنا

یہ زمانہ ایجادات و اختراعات کا ہے جن کی تشریح کے لئے خاص خاص الفاظ ہماری زبان میں نہیں پائے جاتے۔ اسلئے ضرورت ہے کہ نئے نئے الفاظ وضع کئے جائیں۔ نئی نئی اصطلاحات بنائی جائیں۔ اخبارات میں جو لفظ استعمال کئے جاتے ہیں، رفتہ رفتہ زباں زد ہو جاتے ہیں، اس لئے ہمارے اخبارات اس خصوص میں نہایت احتیاط سے قدم اُٹھائیں۔ یہ الفاظ ایسے ہوں کہ مفہوم بھی اُن سے ادا ہو، اور ان کے رواج میں دشواری بھی نہ ہو، تمام اخبارات کو مفہوم کے لئے ایک ہی لفظ استعمال کرنا چاہئے، مگر ایسا نہیں ہوتا۔ عمل کی یکسانی کے واسطے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دکن میں دارالترجمہ نے جو نئے الفاظ اور اصطلاحات وضع کئے ہیں، اُن سے ہندوستان کے تمام اُردو اخبارات کو روشناس کرایا جائے تاکہ اخبارات کے ذریعہ سے وہ الفاظ و اصطلاحات متداول ہو جائیں۔ دوسرا ضروری امر یہ ہے کہ اسلوب بیان سادہ اور سریع الفہم ہو۔ عوام کی ذہنیت اس قسم کی نہیں کہ اخبار پڑھتے وقت مطلب سمجھنے کے لئے وقت صرف کریں اور الفاظ کے معنیٰ کے لئے لغات دیکھنے بیٹھیں۔

اشتہارات

تجارتی اشتہارات کے متعلق میں کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتا، کیونکہ ہمارے اخبارات میں اشتہارات کا حصہ کچھ زیادہ اہم نہیں۔ جب تک اخبارات کی اشاعت زیادہ تعداد میں نہ ہو، اس وقت تک اشتہارات زیادہ مہیا نہیں ہو سکتے۔ و نیز اشتہارات شائع ہوئے بغیر اخبار کو فایدہ نہیں ہو سکتا۔ اور بغیر فایدے کے اخبار کی توسیع اشاعت ممکن نہیں۔ یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ اس وقت اشتہارات بے لطفی و بدمزگی پیدا کرنے والی تصاویر و الفاظ سے پُر ہوتے ہیں اور

ناپاک امراض سے متعلق ہوتے ہیں۔ جو عورتوں اور بچوں کے دیکھنے کے قابل نہیں ہوتے بعض اشتہارات ناکمل اور ایسے مبہم الفاظ میں ہوتے ہیں کہ قارئین کے دلوں میں ان کے پڑھنے سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ ایسے اشتہارات کو شائع نہ کرنے سے گو مالی نقصان ہوتا ہے، لیکن نقصان کو گوارا کرنا اخبارات کے لئے مشکل نہیں ہے اہلِ مغرب نے اشتہار کو فن بنالیا ہے، اور اشتہار اس حسن کے ساتھ شائع کرتے ہیں کہ پبلک کو خواہ مخواہ اس شئے کے خریدنے کی ترغیب ہوتی ہے جس کی نسبت اشتہار دیا گیا ہے۔ مغرب میں اشتہار کو جس قدر عروج حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ڈیلی میل کے پہلے صفحہ پر اشتہارات کی اُجرت ایک دفعہ کے واسطے ... لگتی ہے۔

حکومت کے مراعات حکومت اخبارات کو جو رعایتیں عطا کر سکتی ہے اس سے بحث کرنے کی اسوقت چنداں ضرورت نہیں۔ ہمارے ملک کے گاؤں گاؤں میں ٹپہ کی سہولتیں پیدا کی جانی چاہئے۔ اخبار نویسوں کو آمدرفت کی سہولت کے مدنظر ریلوے کی رعایتیں بھی ہونا قرین انصاف ہے کیا خوب ہو اگر تجارتی ادارے اور مرکزی حکومتیں اپنے اپنے رپورٹوں کے ترجمے کراکے اخبار نویسوں کو وقت پر بہم پہونچانے کا انتظام کریں۔ و نیز دیگر نیم سرکاری ادارے اپنی سالانہ رپورٹیں اخبار نویسوں کو بھیجا کریں۔

اخبار نویسی کا شوق اکثر نوجوانوں کو اخبارات جاری کرنے کا شوق ہے۔ نوجوانوں کو یہ خبط رہتا ہے کہ حکومت کی ناانصافی کا قلع قمع کردیں گے، عہدہ داروں کی قوت کو توڑ دیں گے۔ بڑے بڑے تقریر کرنے والوں کی اپنے قلم کے زور سے سرکوبی کریں گے۔ لیکن بیچارے یہ نہیں جانتے کہ ایسے خیالات وہم ہی وہم ہیں۔ اگر کوئی نوجوان یہ پیشہ اختیار کرنے کے لئے میری رائے طلب کرے تو میں اس کو منع کردونگا کیونکہ پیشہ بہت مشکل ہے۔ اس کے لئے ظاہری و باطنی دولت درکار ہے۔ اور اس دولت کے بغیر اخبار نویسی اختیار کرنا عقلمندی کی دلیل نہیں۔

اخبار نویسی کی ضروریات یہ پیشہ ایک حیثیت سے تجارتی ہے اور دوسری حیثیت سے ایک مقدس فرض اس قسم کی دونوں سہولتیں ایک شخص میں شاید ہی جمع ہوتی ہوں۔ مغربی ممالک میں اخبار کے لئے ایک شخص سرمایہ مہیا کرتا ہے، دوسرا مضامین لکھتا ہے۔ تجارتی انتظام الگ ہوتا ہے اور ضروری مضامین کا اہتمام الگ۔ اس لئے وہاں اخبارون کی ترقی کے لئے گنجایش ہے۔ وہاں سرمایہ مشترکہ کی کمپنیاں قائم ہیں، جو بڑی سہولتوں کا باعث ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں سرمایہ مشترکہ کا قحط ہے۔ باہمی اتحاد و اعتماد کے ساتھ سرمایہ دار کام کرنے کی جانب جب تک آمادہ نہ ہوں، اسوقت تک مشترک سرمایہ کی

کمپنیاں یہاں قائم نہیں ہوسکتیں۔

یہ کہنا سراسر لغو ہے کہ کم سرمایہ سے بھی اخبارات بڑے پیمانہ پر چلائے جاسکتے ہیں۔ تجارت کی مانند اخبار کو بھی چلانا سرمایہ کی کمی و بیشی پر منحصر ہے۔ یہ کہیں نہیں دیکھا گیا کم سرمایہ سے کوئی اخبار مشہور و مفید ثابت ہوا ہو۔ ہمارے ملک میں متعدد اخبارات ہیں لیکن ان کی اشاعت محدود ہے۔ بہتر ہے کہ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے دس پانچ اخبارات کو چلانے کے بجائے بڑے پیمانہ پر ایک ہی اخبار مصور اور ضخیم نکالا جائے۔

ایک دو مفید مشورے اخباری پیشہ میں محنت کرنے کی خواہش رکھنے والوں کو اس سے روکنا بھی مناسب نہیں۔ وکیل و مدرس و حکیم کے مانند اخبار نویس کو بھی مختلف علوم کا مطالعہ اور اپنے معلومات بڑھانا ضروری ہے۔ صرف خواہش ادارت یا لکھنے پڑھنے کی مہارت کافی نہیں۔ علم المعیشت خصوصیت کے ساتھ جاننا لازم ہے، کیونکہ دنیا میں اس کا رواج دن بدن بڑھ رہا ہے۔ نقل و حمل کے ذرائع وسیع ہوجانے سے مختلف ممالک ایک ہوگئے ہیں۔ تجارت و مشتری کی ترقی سے مختلف ممالک کے اقتصادی حالات ایک دوسرے سے وابستہ ہوکر روز بروز نئے اور بہت ہی پیچیدہ مسایل پیدا کررہے ہیں۔ اس قسم کے مسائل کو سمجھنے کے لئے وسیع مطالعہ ناگزیر ہے۔ اخبار نویس کو قدیم اور جدید کتب کا مطالعہ جاری رکھنا چاہیئے، اور اسکے ساتھ ساتھ اہل الرائے اصحاب سے مل کر حالات حاضرہ پر بحث کرنا چاہیئے۔ اپنی رائے سے جو اشخاص اتفاق نہ کریں ان کی زیادہ قدر کرنی چاہیئے، اور ان سے زیادہ مباحثہ کرنا چاہیئے۔ بحث اسی وقت قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے جبکہ وہ بے لوث اور منصفانہ ہو، اور جبکہ عقل سلیم کے قریں ہو۔ اخبار نویسوں کو چاہیئے کہ مسائل کے تمام پہلوؤں کو جانچ کر اہم و غیر اہم میں، ممکن اور غیر ممکن میں تمیز کریں اور عادلانہ تصفیہ کرنے کی کوشش کریں۔

ہر شخص چاہتا ہے کہ ملک کی ترقی سے عوام کو فائدہ پہونچے۔ اس سے مدارس کے طلبہ تک آگاہ ہیں لیکن ملک کے کیا معنی ہیں؟ ملک کی ترقی کیوں ضروری ہے؟ کس طرح یہ ممکن ہے اور کس حال میں ناممکن ہے؟۔ عوام کے فوائد کس امر میں مضمر ہیں، اور وہ فواید کس قسم کے ہیں؟ کیا ترقی ہمارے ملک تک محدود رہے یا دوسرے ممالک کی ترقی کے ساتھ وابستہ ہو؟ ایسے صدہا سوالات ہیں جن کا جواب دینے یا نتیجہ نکالنے کے لئے اخبار نویس کو ایک آزاد و فلسفیانہ خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس قسم کے تصفیہ کا تصور اپنے دل میں کرنے کے لئے بھی زندگی کے مختلف شعبوں کی کماحقہ، واقفیت لازمی ہے۔ سلطنتوں کی بقا و فنا اور قوموں کا زوال و عروج اور ان کے وجوہ کو انسانی تجربہ کی کسوٹی پر کسنا ضروری ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اخبار نویس بھی مثل دوسرے انسانوں کی دنیا کے عام اصول کا پابند ہے۔ ایک مہذب شخص میں جو نیک خصلتیں درکار ہیں، وہی اخبار نویس میں بھی

مطلوب ہیں۔ اس کے اندر صداقت۔ محنت۔ غیر جانبداری، مظلومین کی امداد اور مستحقین کی تائید کا جذبہ پایا جانا ازبس ضروری ہے۔

محنت کی زندگی

اخبار نویس کو خواہ وہ فرض کے طور پر اس کام کو اختیار کرے یا پیشے کی حیثیت سے ہر حالت میں ملک کا بہی خواہ اور بنی نوع انسان کا شیفتہ ہونا لازمی ہے اس کے لئے اس کو سخت محنت و مشقت برداشت کرنی چاہیئے۔ اخبار نویس کو ایک سپاہی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ پولیس کا جوان شب بیداری کرتا ہے، اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ گاؤں یا شہر کے باشندے بلا خوف و خطر سو جائیں سپاہی میدان میں اس لئے لڑتا ہے کہ ملک پر غیروں کا قبضہ نہ ہونے پائے۔ اسی طرح اخبار نویس کو ہر وقت فکر مند رہنا چاہیئے کہ ابنائے ملک خوشحال زندگی بسر کریں اور ملک کے حقوق غصب نہ ہوں اور امن و اطمینان کے ساتھ رہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اخبار نویس کی زندگی کس قدر مشکل ہے۔ ہمارے ملک میں اس پیشہ کے لئے ضروری سہولتیں موجود نہیں ہیں۔ کافی سرمایہ میسر نہیں ہوتا، کتابیں فراہم نہیں ہوتیں۔ خاطر خواہ پبلک کی سرپرستی حاصل نہیں ہوتی۔ اس لئے کسی نوجوان کو اس پیشے کے لئے کمر باندھنا چاہیئے تا وقتیکہ وہ مصائب جھیلنے پر تیار نہ ہو جائے۔ اچھا صحیفہ نگار ملک کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ ہے، لیکن جو شخص صحیح راستہ سے بھٹکا ہوا ہوگا وہ ملک کی بدنامی کا باعث ہوگا۔

اخبار نویس کو کسی فرد یا جماعت کے زیر اثر نہ رہنا چاہیئے

امریکہ اور یورپ میں بیشتر اخبارات تجارت کی غرض سے جاری ہوتے ہیں۔ وہاں کے تجار، امراء اور دیگر سرمایہ دار اسینیٹ کے اراکین کو ہموار کر کے سیاسی قوت حاصل کرتے ہیں۔ اور اس کے ذریعہ سے دولت و عزت پانے کی خاطر اخبارات کا سہارا لیتے ہیں۔ اپنے اغراض کی تکمیل کے لئے اخباروں کو سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ اشتہارات وغیرہ کے ذریعہ مالی امداد بہم پہونچاتے ہیں، اخبار کے مالک یا لکھنے والے کو اپنا بنا لیتے ہیں۔ اس سے لکھنے والے کی آزادی سلب ہو جاتی ہے اور اس کے پیشہ پر دھبہ لگ جاتا ہے۔ ہمارے اخبارات ایسے افراد کے دام تزویر میں نہ آئیں تو اچھا ہے۔ سرمایہ دار اور مشہور افراد ملک بھی اخبار کی آزادی میں رکاوٹیں پیدا کر دیتے ہیں، اس لئے اخبار نویس کو ہمیشہ آزاد خیال ہونا چاہیئے۔

ہندو مسلم میں اتحاد

ہندوستان میں اکثر ہندو مسلم فساد برپا ہوتے رہتے ہیں۔ سمجھا جاتا ہے کہ اس فساد کے بانی دیسی زبان کے اخبارات ہیں۔ اخبار نویس کے جذبات اخبار کے ذریعہ منظر عام پر آتے ہیں۔ اخبار پڑھنے والوں میں بھی وہی جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ہمارے اخبار نویس اس قسم کے جذبات سے محترز رہیں۔ عوام میں نفاق پیدا کرنے کی کبھی کوشش نہ کریں۔ ہماری

صحافت کا مسلک عوام کا اتحاد ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس کو پیدا کرنے یا مٹانے کی قوت اخبار میں موجود ہوتی ہے۔

صحافت میں مغربی تقلید

اصل میں اخبار نویسی کا پیشہ ہمارے ملک کے لئے نیا ہے۔ انگلستان سے یہاں آیا ہے۔ وہاں کے اخبارات ٹائمز، ڈیلی میل، مانچسٹر گارڈین، مارننگ پوسٹ وغیرہ کا انتظام، اشاعت کی پابندی، مضامین کا تنوع، زبان کی فصاحت، طباعت کی خوبصورتی، ان تمام اُمور میں ہم کو ان کی تقلید ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اخبار کو چلانا معمولی کام نہیں۔ اخبار کی کامیابی کے لئے زبردست مطالعہ، کافی سرمایہ اور ملک کی خیرخواہی لازمی ہے۔ گو ہمارے ملک میں اکثر یہ تینوں اجزاء ایک جگہ جمع نہیں ہوتے، تاہم ان کی تکمیل کے لئے کافی کوشش کی گنجائش ہے۔ اس جانب عوام کی بیداری اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔ عالموں کی امداد درکار ہے۔ ہمارے ملک کے سرمایہ دار فیاض ہوتے ہیں۔ مدرسوں، مسجدوں، مندروں، دھرم سالوں کی تعمیر و ترمیم کے کار خیر میں کافی دلچسپی لیتے ہیں۔ اگر ان کا رجحان اخبار نویسوں کی حالت کی طرف ہو جائے تو یہاں کی صحافت بھی کافی ترقی کر سکتی ہے۔ مغربی ممالک میں ہر محنت کا معقول معاوضہ ملتا ہے۔ ملکی خادم اور پارلیمنٹ کے ارکان یکساں محنتانہ حاصل کرتے ہیں۔ اخبار نویس کو بھی اسی طرح صلہ ملتا ہے۔ اخبار نویس اپنے قلم کے ذریعہ سے روزی حاصل کرتا ہے۔ سابق وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ اخبار نویسی سے سالانہ لاکھوں روپیہ پیدا کرتے رہتے ہے۔ وزیر اعظم میکڈانلڈ کو بھی اسی طرح کثیر آمدنی ہوتی رہی۔ کاش ہمارے اخبارات بھی ایسے ہوتے کہ معقول معاوضے دیکر مشہور اہل قلم حضرات سے مضامین لکھواتے۔ اس خصوص میں بمبئی کے مشہور اخبار نویس مالا باری کی تحریر پڑھنے اور غور کرنے کے لائق ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "میری ادارت میں انڈین اسپکٹیٹر نکلتا رہا مگر اس میں مجھے ہمیشہ خسارہ رہا۔ نقصانِ صحت اور تضیع وقت کے علاوہ جس قدر مالی گھاٹا مجھے اُٹھانا پڑا ہے۔ اس کی یاد جب کبھی دل میں تازہ ہوتی ہے تو میری پریشانی خاطر بڑھ جاتی ہے۔ اخبار کی حالت بیمار اور کمزور بچے کی سی تھی۔ اس کے نامہ نگاروں میں اکثر بلا معاوضہ کام کرنے والے اور کمتر معاوضہ لینے والے تھے۔ انگریز نامہ نگاروں کو ۸ ر فی کالم اُجرت دیجاتی تھی۔ ایک غریب کرنل نے فوجی اصلاح پر متعدد آرٹیکل لکھے۔ جب میں نے ۱۲ کالم کے مضمون کے لئے چھ روپیہ بطور نذرانہ بھیجے اور یہ لکھا کہ اس سے آپ کے سگریٹ کے ڈبے کا خرچ نکل آئیگا۔ تو اس نے مجھے جواب میں لکھا کہ "ہاں اس سے میری پنج سالہ بے ماں کی بچی کا چند روز کے لئے دودھ روٹی کا خرچ چل جائیگا" اس سے میرے دل کو اس قدر صدمہ پہونچا کہ میں نے فوراً اپنی دو چاندی کی گھڑیاں جو شادی کے پہلے کی میرے پاس موجود تھیں فروخت کر کے انکی قیمت اپنے غریب پرانے نامہ نگار کے پاس بھیجدی۔ اور ایک خط سر اسٹوارٹ کمانڈر انچیف کو اس مطلب کا لکھا کہ وہ کرنل موصوف کو کچھ مالی امداد دلائیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کرنل موصوف کی لڑکی کو تعلیم کے واسطے بھیجدیا گیا۔"

کاش مالا باری کی سی ہمدردی سب اخبار نویسوں میں پیدا ہو جائے۔

عبدالرزاق (حیدر آباد)

۲۴ر اگست ۷۲ھ ۱۵ء

یعنی

تاریخ مذہب کا وہ تاریک دن جس کی نظیر چنگیز و ہلاکو بھی پیش نہ کر سکے

اگست کی چوبیس تاریخ ہے اور مطلع سخت غبار آلود۔ آسمان پر سیاہ بادلوں کے ٹکڑے آہستہ آہستہ جمع ہو رہے ہیں، اور تاریکی بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ دوپہر کے بعد آفتاب نے پھر اپنی صورت نہیں دکھائی، شام ہوتی ہے اور چاند طلوع ہوتا ہے لیکن حد درجہ سوگوار و غمگین، تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی بادلوں میں اپنا چہرہ چھپا لیتا ہے اور تارے بھی زمین والوں کی طرف سے اپنا منہ موڑ کر غائب ہو جاتے ہیں۔ ہوا میں تیزی شروع ہوتی ہے اور بڑھتے بڑھتے اس میں ایک کراہ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ زمین کانپنے لگتی ہے، آسمان تھرا اُٹھتا ہے اور کائنات کی فضا صرف ان چیخوں سے معمور نظر آتی ہے جو قتلگاہ سان بارتلومیو سے بلند ہوئی تھیں۔

مسلسل ۳۹۲ سال سے اگست کی یہ تاریخ ہر سال یہی منظر پیش کر رہی ہے اور قیامت تک یہی پیش کرتی رہیگی۔ آپ شاید محسوس نہ کرتے ہوں گے، لیکن آیئے مختصراً اس داستان کو سُن لیجئے، ممکن ہے کہ اس کے بعد میری طرح اس تاریخ کا یہ سوگوار منظر آپ کے دل میں بھی ہمیشہ کے لئے منقوش ہو جائے۔

یہ اس زمانہ کی بات ہے جب یوروپ میں، پروٹسٹنٹ مذہب آہستہ آہستہ ترقی پا رہا ہے اور کیتھولک مذہب کی طرف سے لوگ متنفر ہو رہے ہیں۔ یعنی یہ اسوقت کا ذکر ہے جب مذہب کی قدامت پرستی، عقلیت پسندی اختیار کرتی جاتی تھی۔ یوں تو یوروپ کے تمام ممالک میں اس جدید مسلک کی اشاعت ہو رہی تھی لیکن فرانس کی زمین اس کے لئے زیادہ موزوں ثابت ہوئی اور وہاں اس نے بہت جلد کافی جماعت پیدا کر لی تھی۔ تاہم چونکہ بعض امراء اب تک اس قدیم کیتھولک مذہب پر قائم تھے اس لئے فضا حد درجہ مکدر تھی اور لوگوں کے دل ایک دوسرے کے

خلاف حسد وکینہ سے لبریز نظر آتے تھے۔

شاہ فرانس ہنری ثانی کا انتقال ہو چکا ہے اور اپنے پیچھے اپنی بیوہ ملکہ کاترین کو چھوڑ گیا ہے اور اپنے بیٹے شارل کو کاترین حد درجہ خود سر، مغرور وسنگدل عورت ہے جس نے اپنے چاروں طرف ملک کے قوی نوجوانوں کو جمع کرکے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور اس کو جس طرف چاہتی ہے حرکت دیتی ہے۔ ہرچند ہنری کے بعد اس کا بیٹا شارل ہی تخت نشین ہوا تھا لیکن کاترین نے اس کو اس درجہ لہو ولعب میں ڈال دیا تھا کہ اسے مطلق خبر نہ تھی کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور خود ہی جو چاہتی تھی کرتی تھی۔

یہ وہ وقت تھا جو پروٹسٹنٹ مذہب وہاں غیر معمولی ترقی کر رہا تھا اور بڑے بڑے امرار ونبلار اس کو اختیار کر چکے تھے تاہم چونکہ کیتھولک مذہب کے پیرو بھی کم نہ تھے اور بعض امرار ہنوز اس قدیم مسلک پر قایم تھے اس لئے ایک عجیب قسم کی خوفناک فضا ملک میں پیدا ہوگئی تھی اور نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس تصادم کا نتیجہ کیا ہوگا۔

کیتھولک مذہب کا سب سے بڑا حامی ڈیوک دی جینز تھا جو ملکہ کے نہایت مقرب حاشیہ نشینوں میں سے تھا اور کسی وقت اس سے علٰحدہ نہ ہوتا تھا۔ اول تو ملکہ خود کیتھولک مذہب رکھتی تھی، دوسرے دی جینز کی معیت، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پروٹسٹنٹ جماعت کی سخت مخالف ہوگئی اور ایسی آتش انتقام اس کے دل میں بھڑک اٹھی کہ وہ ہر وقت بے چین رہنے لگی۔ پھر چونکہ پروٹسٹنٹ امرار کی بھی جماعت کافی تھی اور اس میں کولینی اور دی کونڈا ایسے صاحب اقتدار امرا بھی شامل تھے اس لئے وہ کھلم کھلا مخالفت بھی نہ کر سکتی تھی اور دونوں جماعتوں کے ساتھ بظاہر یکساں سلوک مناسب خیال کرتی تھی۔۔۔ لیکن حقیقتاً وہ انگاروں پر لوٹ رہی تھی اور ہر وقت اسی فکر میں لگی رہتی تھی کہ پروٹسٹنٹ کافروں سے کیونکر ملک کو پاک کرے۔

اسی دوران میں ہنری دی ناقار نے جو پروٹسٹنٹ جماعت کا سب سے بڑا سردار تھا ملکہ کاترین کی بیٹی کے لئے پیغام بھیجا اور اس نے پسند کرکے ۱۸ اگست ۱۵۷۲ء تاریخ عقد مقرر کردی۔

کاترین چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی کی یہ شادی اس اہتمام سے ہو کہ تاریخ میں اس کی نظیر نہ ملے اور حقیقت یہ ہے کہ تاریخ ان واقعات کا اعادہ کر ہی نہیں سکتی جو اس شادی کے پردے میں ظاہر ہوئے۔ محافل نشاط کے انتظامات ہو رہے تھے، دعوتوں اور تفریحوں کے پروگرام طیار ہو رہے تھے اور درپردہ وہ سب کچھ بھی ہو رہا تھا جس نے اگست کی ۲۴ ہر تاریخ کو ابدالآباد کے لئے غیر فانی بنا دیا۔

کاترین نے اپنے تمام مقرب امرا، اور ارکان حرب کو پوشیدہ طور پر طلب کیا اور پروٹسٹنٹ جماعت سے انتقام لینے کی اسکیم پیش کی، جس کو سنکر سب کے دل کانپ گئے اور اس کے بیٹے شارل نے تو صاف انکار کر دیا لیکن کاترین

کی چالیں ایسی نہ تھیں کہ شارل کا انکار یا اصرار کا پس و پیش قائم رہتا۔ آخر کار سب کو اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا اور نکاح کے بعد تیسری رات یعنی اگست کی ۲۴ تاریخ اس کام کے لئے تجویز کی گئی۔

۲۴ اگست کو کاترین کے ساتھیوں نے کام شروع کر دیا یعنی غروب آفتاب سے قبل شہر کے ان تمام مکانات پر جن میں پروٹسٹنٹ رہتے تھے مخصوص نشانات بنا دئے تاکہ کیتھولک جماعت کے مکانات سے وہ نمایاں طور پر الگ پہچان لئے جائیں۔

---

۲۴ اگست کی رات ہے اور پیرس بقعۂ نور ہو رہا ہے تمام پروٹسٹنٹ شرفا و امرا شاہی دعوت میں شریک ہیں۔ اور ہر چہار طرف ہنگامۂ رقص و سرود برپا ہے۔

دفعتاً ملکہ کاترین کوئی عذر کر کے چلی جاتی ہے اور اندر کے ہال میں خفیہ طور پر اپنے ساتھیوں کو طلب کر کے پوچھتی ہے کہ "کیا تم سب طیار ہو" اس کے بعد وہ ڈیوک دی جینیز سے مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ "میں چند منٹ کے بعد پیرس کی گلیوں کی سیر کرنے کے لئے اپنے قصر سے باہر نکلوں گی اور میں چاہتی ہوں کہ میری یہ چہل قدمی ایسی جوئے خوں میں ہو جہاں میں کم از کم گھٹنے تک تو غرق ہو جاؤں"۔

یہ سنکر سب نے سر اطاعت خم کر دیا اور وہ یہ کہکر کہ "ہاں اب وقت آگیا ہے طیار ہو جاؤ"، مسکراتی ہوئی پھر اس محفل طرب میں آگئی جہاں سے وہ گئی تھی۔

نصف شب ہو چکی ہے اور بزم رقص و سرود انتہائی نقطۂ تکمیل تک پہونچ گئی ہے کہ دفعتاً گرجاؤں سے ناقوس کی آواز بلند ہوتی ہے۔ یہ علامت تھی اس بات کی کہ خدا اور مذہب کے نام پر اب خونریزی شروع کر دینا چاہئے۔ یہ آوازیں ہنوز فضا میں گونجتی ہوتی ہیں کہ قتل عام شروع ہو جاتا ہے۔ بزم شادی میں شریک ہونے والے تمام پروٹسٹنٹ امرا دفعتاً محصور کر لئے جاتے ہیں اور جو محفل اس سے پہلے صرف نغمہ و رقص اور ہنگامۂ نوشانوش کے لئے وقف تھی، اب وہاں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی، سر کٹ کٹ کر فرش پر گر رہے تھے، گردنوں سے خون کے فوارے جاری تھے، لاشے ہر چہار طرف تڑپ رہے تھے اور ہر جام بلوریں بجائے شراب کے اب لہو سے لبریز نظر آتا تھا۔ ٹھیک اسی ساعت میں جب قصر شاہی کے اندر یہ خونی کھیل کھیلا جا رہا تھا، شہر کے ہر گوشہ سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اور کیتھولک جماعت پروٹسٹنٹ آبادی کے قتل عام میں مصروف تھی۔ نہ بچہ کی تمیز تھی نہ عورت کی، نہ بیمار پر رحم تھا نہ ضعیف پر۔ مذہب کا غول آشام دیو تا پھرا ہوا تھا، اور انسانی جانوں کی قربانیوں پر قربانیاں طلب کر رہا تھا، وہ پیاسا تھا، خوں کا پیاسا تھا اور کسی طرح اس کی پیاس

نہ بجھتی تھی، معصوم بچے ماؤں کی گود سے چھین چھین کر آگ میں ڈالے جا رہے تھے اور اُن کے نرم نرم گوشت کے جلنے سے جو بو پھیل رہی تھی اس کو سونگھ سونگھ کر یہ دیوتا خوش ہو رہا تھا، حسین عورتوں کو برہنہ کر کرکے ان کا جسم نیزوں سے چھلنی کیا جاتا تھا اور اُن کی چیخ سن سن کر یہ خونخوار دیوتا ناچ رہا تھا۔

یہی وقت تھا اور یہی اس کا خونیں منظر کا ترین، اپنے مرکب شاہانہ کے ساتھ مسکراتی ہوئی قصر سے باہر نکلی تاکہ وہ لاشوں کو تڑپتے دیکھے اور خوش ہو، مکانوں کو جلتے ہوئے دیکھے اور مسرور ہو۔ وہ خراماں خراماں چلی جا رہی تھی کہ راستہ میں ایک لاش سے ٹھوکر کھا کر گری اور اس کے گھٹنے خون آلود ہو گئے۔ لوگوں نے اسے فوراً سنبھالا اور وہ پھر آگے روانہ ہو گئی۔ کچھ دور چلکر اسے ایک کیتھولک سردار ملا جو خون آلود تلوار لئے ہوئے سر سے پاؤں تک لہو میں شرابور تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑی اور بولی کہ "شکار کی خبریں سناؤ" اس نے کہا کہ "اب تلواریں نیام میں ہیں اور لاشے میدان میں"۔

اس نے اٹھلاتے ہوئے کہا کہ "میری تمنا تو یہ تھی کہ گلیوں میں کم از کم گھٹنے گھٹنے تو خون نظر آتا"، سردار نے ملکہ کے خون آلود گھٹنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ "ملکۂ عالم کی یہ خواہش تو پوری ہو گئی"۔

وہ یہ سنکر بے اختیار ہنس پڑی اور رات بھر ہنستی رہی یہاں تک کہ جب ۲۵ اگست کا آفتاب طلوع ہوا تو وہ جاگ رہی تھی اور پروٹسٹنٹ جماعت کا ایک ایک فرد موت کی آغوش میں ہمیشہ کے لئے سو چکا تھا۔

مجموعۂ استفسار و جواب ہر دو جلد

ریڈیو کا ماضی، حال اور مستقبل

کہا جاتا ہے (اور جھوٹ سچ کہنے والے کی گردن پر ہے) کہ جس وقت مارکونی کی عمر ۱۹ سال کی تھی اور وہ جامعہ بولونا میں تعلیم پا رہا تھا اُسے ایک لڑکی سے محبت ہوگئی اور اُس نے اس خوف سے کہ کوئی اور باہمی گفتگو کو نہ سن لے، ایک ایسے طریقۂ پیام رسانی پر غور کرنا شروع کیا جو رقیبوں کی دسترس سے باہر ہو۔ جب اُس سے دریافت کیا گیا تو اُس نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ "ہاں میں بعض ایسے لوگوں سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں جن سے سوائے اس طریقہ کے کوئی اور صورت گفتگو کی ہے ہی نہیں"۔

اٹلی کے مشہور فیلسوف شاعر ڈانٹی کی غیر فانی عاشقانہ شاعری کا سبب اُس کی محبوبہ بیٹرس بتائی جاتی ہے۔ الغرض اس میں کلام نہیں کہ محبت و حُسن کا یہ احسان دُنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی کہ اُس نے ایک کو فلسفۂ شعر و حکمت کا دیوتا بنا دیا اور دوسرے کو وہ ذہن رسا عطا کر دیا کہ آج ہم بغیر تار کی مدد کے ہزاروں میل کے فاصلہ پر ایک دوسرے سے بات چیت کر سکتے ہیں، اور آنِ واحد میں تمام دنیا کی خبریں گھر بیٹھے آرام سے سن سکتے ہیں۔

۱۲ دسمبر ۱۹۰۱ء سب سے پہلی تاریخ تھی جب مارکونی نے انگلستان سے لاسلکی اشارات یا بے تار کے پیام امریکہ روانہ کئے۔ دنیا دفعتاً چونک پڑی، اخبارات میں ہلچل مچ گئی، بعض نے اس کا دبی زبان سے اعتراف کیا، اور بعض نے اسے چانڈو خانہ کی گپ سمجھکر خوب ہنسی اُڑائی، چنانچہ اڈیسن نے بھی اس کو جھوٹ ہی سمجھا اور وسے ووڈ ٹ نے بھی اس کے قبول کرنے میں پس و پیش کیا حالانکہ وہ خود لاسلکی کے مسائل پر غور کر رہا تھا۔

اسکے بعد مارکونی نے ایک مختصر سا رسالہ اپنے نظریہ کی تائید میں شائع کیا اور آخر کار رفتہ رفتہ ہر منکر اسکی ایجاد کی صحت پر ایمان لے آیا۔

یہ بات اب سے تقریباً ۳۴-۳۵ سال اُس طرف کی ہے۔ لیکن اس دوران میں اس ایجاد نے کتنی ترقی کی؟ اس کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ امریکہ کی وزارت تجارتی نے جو اعداد پیش کئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ روزانہ تمام دنیا میں ۵۰ کروڑ سے زیادہ انسان لاسلکی اسٹیشنوں کے پیغامات سنتے اور اُن سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ ٹیلی فون سے باتیں کرنا، تصویریں ادھر سے اُدھر بھیجنا، ہزاروں میل دور کی چیز کو

گھر بیٹھے دیکھ لینا، برقی قوت کو جہاں جی میں آئے پہونچا دینا، اور یہ سب کچھ بغیر تار کی مدد کے کرنا، مارکونی کی ایجاد کا معجزہ ہے جس پر انسانی تمدن کی خدا معلوم کتنی ترقیاں آیندہ ہونے والی ہے ہیں اور کیسے کیسے عجائب غرائب اس سے ظاہر ہونے والے ہیں۔

سب سے پہلے لاسلکی پیغامات اُن اشارات کی صورت میں بھیجے جاتے تھے جو تار برقی میں رائج تھے یعنی صرف "کھٹ کھٹ، کھٹاکھٹ" کے مقررہ اشاروں سے پیام روانہ کئے جاتے تھے، لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ آواز کو بھی اسی طرح منتقل کر سکتے ہیں اور اس تحقیق کے بعد ہی لاسلکی ٹیلیفون رائج ہوگیا جس کے لئے بڑے بڑے اسٹیشن طیار کئے گئے اور جہاں سے روزانہ خبریں، قصے، کہانیاں، گانا، رونا سبھی کچھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہتا ہے۔ ایسے اسٹیشنوں کو براڈ کاسٹنگ اسٹیشن کہتے ہیں جس کا ترجمہ حیدرآباد میں "نشرگاہ" کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں ایسے اسٹیشن متعدد ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ قوی اسٹیشن دہلی کا ہے، اس کے بعد بمبئی کا اور پھر کلکتہ کا جہاں سے روزانہ صبح و شام ہماری تفریح اور وسعت معلومات کا سامان فراہم کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں ابھی اس کا رواج عام نہیں ہوا اور نہ لاسلکی پیغام رسانی کی زیادہ ترقی یافتہ صورتیں یہاں نظر آتی ہیں، لیکن یورپ و امریکہ میں تو لاسلکی زندگی کا جزو ہو کر رہ گئی ہے اور حیات انسانی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس سے اس کا تعلق نہ ہو۔ لوگ ناپیداکنار سمندر کا سفر کر رہے ہیں اور اپنے وطن کے اعزہ واحباب سے گفتگو بھی کرتے جاتے ہیں، ہوائی جہازوں میں بیٹھے ہزاروں فٹ کی بلندی پر اُڑے چلے جا رہے ہیں اور اپنے دفتر کے کلرکوں، گھر کے خادموں کو ہدایات بھی کرتے جاتے ہیں۔ یہ سب اسی لاسلکی کا کرشمہ ہے جس نے زمان و مکان کے مفہوم کو بالکل بدل دیا ہے، یعنی نہ وقت کی تنگی و وسعت کا سوال اب رہا ہے جو پہلے پایا جاتا تھا اور نہ مقام کی دوری و نزدیکی کوئی چیز رہ گئی ہے۔

لاسلکی پیام رسانی میں جب کامیابی ہوگئی تو مارکونی نے غور کیا کہ کسی طرح تصویروں کو بھی منتقل کرنا چاہئے چنانچہ اُس نے اس میں بھی کامیابی حاصل کی اور اب مغرب میں آواز کے علاوہ تصویریں، اعداد و شمار، تحریر اور نقشے وغیرہ سب جوں کے توں منتقل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص جرم کر کے بھاگے تو اُس کی تصویر یورپ بھر میں ایک ایک بندرگاہ پر ایک ایک اسٹیشن پر لاسلکی کے ذریعہ سے بھیجی جا سکتی ہے اور اگر وہ کوئی تحریر چھوڑ گیا تو وہ بھی بجنسہٖ ہر جگہ منتشر کی جا سکتی ہے۔ گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اب مادی چیزیں بھی اِدھر سے اُدھر لاسلکی کے ذریعہ سے منتقل ہو سکتی ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ توجہ اب اس کوشش میں صرف کی جا رہی ہے کہ قوت بینائی کو بھی لا

کے ذریعہ سے منتقل کیا جائے، اس کا نام انگریزی میں Television ہے یعنی دور سے دیکھ لینا، لیکن بہ نظر اختصار اگر "لاسلکی آنکھ" کہیں تو غالباً نادرست نہ ہوگا، لیکن اس میں بھی بڑی حد تک کامیابی ہوگئی ہے اور ہر چند ہندوستان میں تو نہیں لیکن امریکہ و یورپ میں ٹیلی فون کے ساتھ یہ "لاسلکی آنکھ" بھی لگا دی گئی ہے جس کے ذریعہ سے ہم کو بات کرنے والے کی صورت اور اُس کے حرکات و سکنات بھی نظر آنے لگتے ہیں۔

فرض کیجئے کہ انگلستان میں ملک معظم کی تاجپوشی کی رسم ادا ہو رہی ہے، ڈربی میں گھوڑ دوڑ کا اجتماع ہے، امریکہ میں گھونسہ بازی کا مقابلہ ہو رہا ہے، ہندوستان میں گاما پہلوان زبسکو سے کشتی لڑ رہا ہے، برٹش چینل میں کیمبرج اور آکسفورڈ کے درمیان کشتی کی دوڑ کا مقابلہ ہے، اور یہ ممکن نہیں کہ ان تمام مناظر کو ہم انسانی آنکھ سے بغیر اُس جگہ گئے ہوئے دیکھ سکیں، لیکن اگر ہمارے پاس ایسا ریڈیو موجود ہے جس میں لاسلکی آنکھ لگی ہوئی ہے تو ہم ان مناظر کو دیکھ بھی سکیں گے، اور وہاں کی آوازیں بھی سن سکیں گے۔ یورپ و امریکہ میں اس کا رواج بہت بڑھ گیا ہے لیکن ابھی تک یہ لاسلکی آنکھ اتنی ارزاں نہیں ہوئی کہ ہر شخص اُسے اپنے پاس رکھ سکے۔ لیکن اس کی کوشش برابر جاری ہے اور یقیناً ایک وقت ایسا آئے گا کہ ایک معمولی مزدور بھی اس سے فایدہ اُٹھا سکے گا۔ دوسری کوشش جو یقیناً بہت زیادہ کارآمد ثابت ہوگی یہ ہو رہی ہے کہ لاسلکی سے بجلی کی قوت کو بھی منتقل کر سکیں یعنی موٹروں اسٹیشنوں، اور بحری و ہوائی جہاز کو بھی دور ہی سے بجلی کی قوت بہم پہنچائی جائے اور وہ چلنے لگیں۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ پٹرول گیس یا کوئلہ وغیرہ سے قوت پیدا کرنے کیلئے جو آلات جہازوں، موٹروں وغیرہ میں لگائے جاتے ہیں وہ ہٹا دئے جائیں اور اُن کو لاسلکی اسٹیشنوں سے براہ راست قوت پہونچا کر حرکت میں لے آیا جائے۔ چنانچہ امریکہ کے ایک سائنس داں نے ایسا آلہ تیار کر لیا ہے جو آواز سے متاثر ہو کر گردش میں آجاتا ہے اور وہ زمانہ دور نہیں ہے جب ہم کو موٹروں کے لئے پٹرول کی ضرورت نہ ہوگی اور دہلی کے اسٹیشن سے لاسلکی قوت کہربائی حاصل کر کے ہم موٹر کو حرکت میں لا سکیں گے —— اس سلسلہ میں یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ لاسلکی اسٹیشنوں سے جو برقی موجیں آوازوں کو اپنے ساتھ لیکر چلتی ہیں وہ دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک کو Long کہتے ہیں اور دوسری کو Short اول الذکر کا ترجمہ طویل یا لمبی موجیں کیا جاتا ہے اور دوسری کا چھوٹی موجیں، حالانکہ صحیح ترجمہ اونچی اور نیچی موجیں ہے کیونکہ موجوں کی رفتار کی لمبائی یا چھٹائی کی ناپ ان کی بلندی سے متعلق ہے۔ یعنی جو موجیں فضا میں زیادہ بلند جا جا کر واپس آئیں گی انھیں لانگ ویو (Long) کہیں گے اور جو زیادہ اوپر نہ جائیں گی اُنھیں شارٹ ویو (Short) کہیں گے۔ امریکہ و یورپ میں پہلے اونچی موجوں کے اسٹیشن زیادہ تھے۔ بڑے اسٹیشنوں میں ان موجوں کی اونچائی تین ہزار میٹر سے بھی زیادہ ہوتی تھی اور چھوٹے اسٹیشنوں میں ۲۰۰ میٹر سے لیکر ۶۰۰ میٹر تک۔ لیکن ایسے اسٹیشنوں کی تیاری میں بہت صرف آتا تھا اس لئے ۱۹۱۶ء میں مارکونی نے غور کرنا شروع کیا کہ کیا

نیچی موجوں سے کام نہیں لیا جا سکتا اور اس میں اسکو بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ کیونکہ ان موجوں کے پیدا کرنے کیلئے جو قوت بجلی کی صرف ہوتی ہے وہ بہت کم ہوتی ہے اور نتیجہ بھی بہتر نکلتا ہے۔ چنانچہ اب یورپ و امریکہ میں نیچی موجوں سے بھی آوازیں منتقل کی جاتی ہیں اور دور دراز مقامات کے لئے تو یہی موجیں زیادہ کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ دہلی کا اسٹیشن اونچی موجوں کا ہے اور غالباً وہ اپنی آوازیں یورپ وغیرہ دور کے مقامات تک نہیں پہونچا سکتا۔ یہ اسٹیشن نیچی موجوں سے کیوں کام نہیں لیتا اس کا حال ہم کو نہیں معلوم، اس کے ڈائرکٹر صاحب اس مسئلہ پر شاید کوئی روشنی ڈال سکیں۔

یہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ لاسلکی طریقہ سے نہ صرف آواز بلکہ تصویریں بھی منتقل ہو سکتی ہیں، اور لوگوں کی تحریریں بھی چنانچہ اس اصول کی بنا پر اب یہ سوچا جا رہا ہے کہ کیوں نہ لوگوں کے پیغامات بجنسہٖ منتقل کر دئے جایا کریں۔ اس وقت تو یہ ہوتا ہے کہ آپ اپنا پیغام انگریزی حروف میں لکھ کر تار گھر میں دیتے ہیں اور وہ مخصوص اشاروں کے ذریعہ سے کھٹ کھٹ کرکے روانہ کرتا ہے اور اگر ٹیلی فون سے کہنا ہوتا ہے تو انگریزی زبان میں اُسے ادا کرتا ہے، لیکن اب یہ فیصلہ ہونے والا ہے کہ جس شخص کا جو پیام جس صورت اور جس زبان میں بجنسہٖ وہی منتقل کر دیا جائے یہاں تک کہ اس طرح ہم رسالے کے رسالے اور کتاب کی کتاب دوسری جگہ منتقل کر سکتے ہیں۔ اس میں ایک آسانی تو یہ ہے کہ وقت بہت کم صرف ہوگا اور دوسرے یہ کہ اُجرت بہت کم ہو جائیگی۔ اسوقت تو انگلستان و امریکہ کے درمیان ایک منٹ تک لاسلکی ٹیلیفون پر بات کرنے کی اُجرت ایک اشرفی ہے، لیکن اگر اس کوشش میں کامیابی ہوگئی تو یہ گرانی باقی نہ رہے گی کیونکہ اس صورت میں معاوضہ الفاظ یا وقت کے حساب سے نہ لیا جائے گا بلکہ ناپ کے لحاظ سے لیا جائیگا یعنی یہ کہ ایک پیغام نے کتنی جگہ لی، ایک رسالہ یا اخبار یا کتاب نے کتنے مربع انچ یا سنٹی میٹر جگہ گھیری۔

وہ حضرات جنھوں نے ریڈیو لاسلکی طریق پیام رسانی پر غور کیا ہے اُن سے یہ حقیقت مخفی نہ ہوگی کہ جس قوت کے ساتھ اسٹیشن کسی آواز کو منتقل کرتا ہے وہ فضا میں پہونچکر کمزور ہو جاتی ہے اور اُس کا اکثر حصہ مفقود ہو جاتا ہے، چنانچہ یہی سبب ہے کہ دہلی کے اندر جتنی صاف آواز وہاں کے اسٹیشن سے آتی ہے اتنی لکھنؤ میں نہیں آتی اور جتنی لکھنؤ میں آتی ہے، کلکتہ میں نہ آتی ہوگی۔ اس مسئلہ کی طرف بھی ماہرین پوری طرح توجہ کر رہے ہیں اور تجربات میں مصروف ہیں۔ یقین ہے کہ بہت جلد اس کا بھی انسداد ہو جائے گا اور فضا کی جو دوسری آوازیں ریڈیو سے سنائی دیتی ہیں وہ بہت کم ہو جائیں گی۔

اس حد تک تو ہم نے صرف لاسلکی کی ایجاد اور اُس کی آیندہ ترقی کے امکانات پر اظہار خیال کیا ہے لیکن آیندہ کسی وقت ہم یہ بھی بتائیں گے کہ اس سے پبلک کو کیا کیا فائدے اور کس کس طرح پہونچائے جا سکتے ہیں، اور براڈکاسٹنگ اسٹیشنوں کو اپنے پروگرام میں کیا ایسی تبدیلیاں کرنی چاہئیں کہ تفریح و افادہ دونوں مدعا پوری طرح حاصل ہو جائیں۔

قرض

بابو راجگوپال سنگھ۔ جگدیپ سنگھ! کیا ہوا؟ آج گاؤں میں جا کر حکم سنا دیا یا نہیں؟
جگدیپ سنگھ۔ ہاں سرکار! میں نے حکم سنا دیا ہے اور رعایا سب کی سب حضور کی خوشی میں شریک ہونیکو تیار ہے۔ لیکن رام جنم سنگھ ابتک راضی نہیں ہوا اور بات دراصل یہ ہے کہ وہ گاؤں میں سب سے زیادہ غریب ہے کھانے کو تو جڑتا نہیں قرض کہاں سے لگا ئیگا۔
بابو راجگوپال سنگھ۔ میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔ سب کو اپنے حصہ کی رقم ادا کرنی پڑے گی اور اسے سب لوگ قرض کیوں سمجھتے ہیں۔ کیا تم نے یہ نہیں کہا کہ لگان میں یہ رقم وضع ہوتی رہے گی۔ سوچو تو جگدیپ سنگھ! اتنے بڑے گھر کی بات ہے۔ اگر میری طرف سے کوئی کمی ہوگئی تو کیسی جگ ہنسائی ہوگی۔ سچ تو یہ ہے کہ میرا منہ اس گھرانے میں شادی کا نہ تھا۔ یہ تو جو کچھ ہوا اسے لڑکی کا سوبھاگ سمجھو۔ پچاس ہزار تلک کی رقم کوئی معمولی چیز نہیں۔ میں کیا سامان کر سکتا ہوں وہ تو ایشور پورا کرے سیٹھ بھگوان داس کا کہ اس نے تمسک پر چالیس ہزار دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ اسوقت تو عزت بچ جائے گی۔ آیندہ کچھ نہ کچھ سامان ہو رہیگا۔ اور ہے وہ سچا آدمی وقت پر دھوکا نہ دیگا۔ پھر باقی روپیوں کی کیا سبیل ہوتی اگر یہ لوگ وقت پر کام نہ آئے تو کس کام کے۔ میں آگ لگا کر سارے گاؤں کو پھونک نہ دوں گا؟
جگدیپ سنگھ۔ سرکار بات تو بالکل سچ ہے۔ لیکن رام جنم سنگھ ایک تو مفلس ہے بھی دوسرے بات کا وہ پکا ہے۔ مجھے تو امید نہیں کہ وہ یہ قرض دے سکے۔
بابو صاحب۔ کیا کہا؟ اس کی ساری ہٹ دھرمی رہجائے گی۔ سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا۔ میں بھی دیکھتا ہوں کہ وہ کیسے ادا نہیں کرتا۔ اس کا دیوتا ادا کریگا۔ میں بھی آخر زمیندار کا بچہ ہوں۔ اگر اس سے روپیے نہ اگلوائے تو نام نہیں۔ اس بستی میں رہنا مشکل کر دوں گا اور بھیک منگوا چھوڑ دوں گا۔
بابو صاحب کو انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں دیکھ کر جگدیپ سنگھ نے زیادہ چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور خاموش وہاں سے ٹل گیا۔

(۲)

بابو راجگوپال سنگھ موضع جگدیش پور کے تھے تو متوسط درجہ کے زمیندار لیکن ظاہری شان و شوکت ہمیشہ ایسی

یکھنے والے انھیں لکھ پتی ہی سمجھتے تھے اور سچ یہ ہے کہ اسی ظاہری ٹیپ ٹاپ کی بدولت وہ اپنی لڑکی کی
ھوٹا ناگپور کے ایک دانی ریاست کے لڑکے سے کرنے میں کامیاب ہوئے۔ صورت یہ ہوئی کہ گرمی کے موسم
ں کی مسوری میں ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی۔ کچھ روز دعوتوں کا سلسلہ رہا اور پھر بعض احباب کے ذریعہ
اجگوپال سنگھ نے یہ گفتگو چھیڑ دی اور بات پختہ ہوگئی۔

بو راجگوپال سنگھ سخت جابر زمیندار تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کے احکام کی تعمیل میں کوتاہی کرسکے۔ رعایا
ری طرح بیگار لیتے اور اگر کوئی جان چراتا تو اس کی اچھی طرح خبر لیتے۔ سنا گیا ہے کہ ایک بار دو تین چمار دن نے
ی کا عذر کرکے کھیت میں کام کرنے سے انکار کر دیا تھا اور جب زیادہ بات بڑھی تو سپاہی کو پیٹا بھی۔ اُسوقت
احب خاموش رہے لیکن جب کچھ زمانہ گزر گیا اور کسی کو یاد بھی نہ رہا تو موقع سے ان چماروں کو اپنے یہاں بلوا کر
ھنکوا دیا۔ حقیقت کی خبر نہیں لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ تینوں کے تینوں یک بیک غائب ہوگئے اور پھر انکا
سی کو پتہ نہ چل سکا۔ ممکن ہے گاؤں والے شبہ کی بنا پر ایسا کہتے ہوں، بہرحال بابو صاحب کے نام سے بستی
ھراتا تھا اور جب ان کا سپاہی کسی کے مکان پر پہونچ جاتا تو وہ گھبرا جاتا

بو صاحب کی اقتصادی حالت ایسی بری نہ تھی کہ اگر وہ انجام پر نظر رکھتے اور کفایت شعاری سے کام لیتے تو
شادی کے وقت قرض کی ضرورت پڑتی۔ لیکن اول تو وہ فضول خرچ بہت تھے، دوسرے راجہ کے گھر میں
ی تھی۔ شادی کی تمام نمائشیں اسی اعتبار سے ہونی چاہئے تھیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ کیا کچھ سامان کی
نہ رہی ہوگی۔ ایک زمیندار، ایک دولتمند اپنی غیر ضروری تمناؤں کی ناکامی بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ وہ
ی ہوئی امیدوں پر اپنی محکوم دنیا کی ہر چیز قربان کردینے کو تیار ہوجاتا ہے۔ بابو صاحب بھی زمیندار ہی تھے ...
ختیارات دوسرے زمینداروں سے کسی طرح کم وسیع نہ تھے — قرض کے لئے انھوں نے سیٹھ بھگوانداس
سک پر چالیس ہزار کا انتظام کرلیا باقی روپیوں کے لئے اپنے اسامیوں کو مجبور کیا۔ ہر کسان پر حسب حیثیت
سے لیکر پچاس تک کی رقم باندھ دی اور شرط یہ ہوئی کہ آیندہ چند سال کے اندر یہ رقم لگان میں محسوب ہو جائیگی۔
سامی اچھی طرح جانتے تھے کہ اس وعدہ کی کیا حقیقت ہے، کیونکہ جو روپئے لئے جا رہے تھے ان کی کوئی
ی تھی نہیں کہ اس کے بل بوتے پر آیندہ وصولی کی امید ہوسکے۔ سب کچھ بابو صاحب کی عنایتوں پر منحصر تھا
جود اس کے کسی میں ہمت نہ تھی کہ انکار کرے خواہ یہ قرض انھیں قرض ہی لیکر کیوں نہ دینا پڑے — ایک
ا جنم ہی ایسا تھا جو بالکل تہیدست تھا۔ اسے قرض ملنے کی بھی امید نہ تھی — صرف دو بیگہ کے کاشتکار کو قرض
۔ اور اگر مل بھی جائے تو ادا کہاں سے کرے گا، مشکل سے بال بچوں کے ساتھ روکھا سوکھا کھا کر پڑا رہتا تھا
ں واقف تھا کہ چھ مہینے پہلے اس نے اپنی لڑکی دیومتی کی شادی گاؤں بھر سے کنیا دان مانگ کر کی تھی۔

وہ کہاں سے زمیندار کی اس خوشی میں شریک ہو سکتا تھا۔ اس نے جگدیپ سنگھ کے سامنے اپنی معذوری تو ظاہر کر دی تھی لیکن اسے اطمینان نہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کس کا حکم ہے۔ وہ بہت مایوس تھا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ خود ہی سرکار میں حاضر ہو کر اپنا درد دکھ کہہ سنائے۔ وہ سمجھتا تھا کہ میری حالت خود بابو صاحب سے پوشیدہ نہیں۔ میرا خاندان برابر اس سرکار کا وفادار رہا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ بابو شنبھو دیال سنگھ (بابو صاحب کے باپ) کو راستہ میں چوروں نے گھیر لیا تھا۔ اتفاقاً پتاجی ادھر جا نکلے اور اپنی جان جوکھوں میں ڈالکر انھیں بچا لیا۔ اسی کے انعام میں یہ دو بیگہ کھیت ملے تھے اور پتاجی وہاں ملازم بھی رکھ لئے گئے۔ بابو راجگوپال سنگھ اُسوقت بچے نہ تھے۔ انھیں ہمارے واقعات معلوم ہیں۔ یہ باتیں ایسی نہیں کہ بھول جائیں۔ کیسے ممکن ہے کہ وہ میرا خیال نہ کریں۔ وہ ضرور مجھے اس بار سے نجات دیدیں گے۔

(۳)

صبح کا وقت ہے۔ فطرت نے سارے عالم میں شادابی و تازگی کی ایک لہر دوڑ رہی ہے۔ اور کائنات پھر اسی کشمکش میں مبتلا ہو جانے کے لئے انگڑائی لے چکی ہے جس سے تھک کر ایک عارضی سکون پر مجبور ہو گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے آفتاب کی ساری تجلی پاشیاں محض اسی ایک مقصد کے لئے وضع ہوئی ہیں کہ وہ کائنات کو شعاع اُمید سے منور کرتی رہیں۔ اور حقیقتاً یہی وہ شئے ہے جس پر دنیا کی رونق منحصر ہے۔

رام جنم غریب ضرور پیدا ہوا تھا لیکن فطرت کی تمام فیاضیوں سے مستفید ہونے کا حق اسے بھی تھا۔ قدرت اس کے لئے بخیل نہ تھی۔ اس کے دل میں بھی امید و تمنا کے جذبات پیدا اور فنا ہوتے تھے۔ اس نے اگر ایک انسان سے یہ توقع قائم کر لی تھی کہ اس کی مجبوریاں، اس کی تہیدستیاں دل میں رحم و لطف کا شائبہ پیدا کر سکیں گی تو کوئی خلاف عقل بات نہ تھی۔ یہ اور بات ہے کہ ایک طبقہ کی خود غرضیوں اور نفسانیت نے غریبوں کا یہ حق بھی غصب کر لیا ہے کہ اپنی مصیبتوں کا گلہ کر سکے، ظلم و ستم کے خلاف فریاد کر سکے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ایک انسان کی بقائے حیات منحصر ہے دوسرے انسان کو غذا بنا لینے پر۔ پھر ذی اختیار ہستیاں اپنی مسرتوں اور شادکامیوں پر غریبوں کو بے اختیار و بے چارہ انسانوں کو قربان کر دینے سے کیوں دریغ کرنے لگیں۔ غریب کو صرف اس لئے زندہ رہنا چاہئے کہ وہ امیروں کی عیش و نشاط کے لئے سامان فراہم کر سکے ورنہ اس کی زندگی کی کوئی وجہ ہو ہی نہیں سکتی۔

رام جنم کے دل میں امید و بیم کا دریا موجزن تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا سر نیچا کئے پشت کی جانب ہاتھ پر ہاتھ باندھے زمیندار کے مکان کی طرف جا رہا تھا۔ اسے تمام شب نیند نہیں آئی تھی اور اس لئے انتہائی ضبط کے باوجود وہ اپنے گھر سے بہت سویرے ہی نکل کھڑا ہوا۔ آفتاب نکل چکا تھا لیکن امیروں کی صبح اتنے سویرے کیوں ہونے لگی۔ انھیں قدرت نے صرف سکون و عیش کے لئے وضع کیا ہے۔ کام ان کے لئے دوسرے کرتے ہیں

بھر صبح کی یہ چند ساعتیں اگر ضائع ہو بھی گئیں تو ان کا کیا بگڑ جائے گا۔ ان کے محاصل میں کونسی کمی آجائیگی۔ قدرت کی عنایات سے انھیں زیادہ سے زیادہ لطف حاصل کرنا چاہیئے۔ رام جنم کو کئی گھنٹے انتظار کرتے گزر گئے تب کہیں جاکر بابو صاحب کی خدمت میں شرف باریابی حاصل ہوسکا۔

بابو صاحب نے جسوقت رام جنم پر نظر ڈالی رام جنم کانپ رہا تھا۔ اس نے کوشش کی کہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ جائے لیکن وہ اسدرجہ گھبرا گیا تھا کہ ایک لفظ بھی زبان سے نہ کہہ سکا۔ ادھر بابو صاحب اسے دیکھتے ہی غصہ سے بھبوت ہوگئے۔ کڑک کر بولے۔

"رام جنم سنتا ہوں تجھے اب میرے حکم کی بھی پرواہ نہیں رہی؟

رام جنم ۔ کو۔۔۔ن ۔۔۔ کہتا ۔۔۔ ہے ۔۔۔ سرکا ۔۔۔ ر

بابو صاحب ۔ کل میرے آدمی کو تو نے کیا جواب دیا تھا۔

رام جنم ۔ کو۔۔۔ چھ تو ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ مالک ۔ صرف ۔۔۔ روپیوں کا عذر ہے۔ یہ پچاسؓ کی رقم تو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی کہاں سے لاؤں گا۔

بابو صاحب ۔ نمکحرام کہیں کا۔ تجھے شرم نہیں آتی ہمارے ہی دئے ہوئے کھیت پر اُچھل رہا ہے اور آج مجھے ہی چڑانے آیا ہے۔

رام جنم ۔ سچ ہے سرکار! کون نہیں جانتا ہے کہ آپ ہی کی عنایتوں سے بال بچوں کی پرورش کر رہا ہوں پھر آپ سے بڑھ کر یہ مجال کون جان سکتا ہے۔ خود خیال کیجئے اتنی بڑی رقم میرے پاس کہاں سے آئی کوئی قرض دینے والا بھی تو نہیں۔ آپ مجھ پر رحم نہیں کریں گے تو کون کرے گا۔

بابو صاحب ۔ اپنی پنڈتئی رہنے دے۔ میں تیری چالیں خوب سمجھتا ہوں۔ مجھے ان باتوں کی کوئی پرواہ نہیں کہ تیری مثال قائم کرکے سارے گاؤں کو خراب نہیں کرسکتا۔ یاد رکھ روپئے کبھی چھوڑے نہیں جا سکتے جہاں سے جی چاہے دے۔ اور یہ کیا کہتا ہے کہ قرض کہاں سے ادا کروں گا۔ میں نے تو کہدیا ہے کہ ہر سال لگان سے رقم وضع ہوتی رہے گی اور وہی روپے قرض خواہ کو دیدینا۔

رام جنم ۔ سرکار! یہ سب تو ٹھیک ہے۔ لیکن مجھے دینے والا کون ہے۔ کوئی ایک پیسہ نہیں دیگا سرکار!

بابو صاحب ۔ تو تیرا مطلب یہ ہے کہ تو روپئے دینے کو کسی طرح تیار نہیں۔

رام جنم جواب دینا چاہتا تھا لیکن اتفاقاً اس کی نظر اوپر اُٹھی —— اور پھر سہم کر رہ گیا۔ بابو صاحب کڑک کے "رام جنم! بول! چپ کیوں کھڑا ہوگیا۔ تجھے اقرار کرنا پڑے گا۔ بول کیا کہتا ہے۔" رام جنم خاموش ہی تھا۔ وہ کیا جواب دیتا۔ انکار کی اجازت نہیں اور روپیوں کا سامان محال۔ معلوم نہیں بابو صاحب نے اسکی

خاموشی کی تاویل کس طرح کی۔ غریب کی گفتگو بھی ناگوار ہوتی ہے اور خموشی بھی شوخی و شرارت سے تعبیر کی جاتی ہے۔ بابو صاحب یہ کیونکر برداشت کر لیتے کہ ایک کسان ایک خس و خاشاک سے بھی کم درجہ کا انسان ان کی خواہشات کا جواب خاموشی سے دے۔ بابو صاحب چیخ اٹھے۔ جگدیپ سنگھ! جگدیپ سنگھ!!

جگدیپ سنگھ۔ "حاضر ہوا سرکار!" کہتے ہوئے آگے بڑھے۔

بابو صاحب۔ دیکھو آج یہ میرے سامنے بھی سیکڑی دکھانے آیا ہے۔ میرے منہ پر روپیوں سے انکار کرنے آیا ہے۔ اسے ابھی میرے سامنے باندھکر پچیس جوتے لگاؤ۔ دیکھتا ہوں کہاں تک یہ اپنی ہٹ پر قائم رہتا ہے۔

رام جنم نے سب کچھ سنا اور خاموش نتنا رہا۔ بے بس تھا۔ کمزور تھا۔ اس کا خون کھول رہا تھا، دل و جگر جل رہے تھے۔ آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔ لیکن زبان کھولنے کی اجازت نہ تھی۔ راجپوت تھا۔ جان پر کھیل جاتا کوئی بات نہ تھی۔ لیکن وہ نتیجہ پر غور کرنے کے لئے مجبور تھا۔ وہ بال بچوں کے لئے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اس کی بیوی کی کون خبر لیگا۔ اسے پوچھنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی سامان نہیں ہے۔ یہ تمام تصویریں اس کے سامنے نہایت تیزی سے آ آکر گزرنے لگیں۔ اس کا سارا جوش و خروش سرد پڑنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

شریف سے شریف نفس بھی جب دیکھتا ہے کہ جان و آبرو کی حفاظت میں اس کی تمام کاوشیں کلیتہً بیکار ہو کر رہ گئی ہیں اور جان دے دینا بھی ان کے بس کی بات نہیں رہی تو پھر وہ فریب سے کام لینا شروع کر دیتا ہے خود اس کی طبیعت گوارا کرے یا نہ کرے لیکن مصلحتیں اسے مجبور کر دیتی ہیں۔ رام جنم چاہتا تو اپنی جان پر کھیل کر بابو صاحب سے اپنی بے عزتی کا عوض لے لیتا۔ خود اس کا دلی جوش بار بار اس پر آمادہ کر دیتا تھا۔ لیکن اسے خاندان کا خیال تھا اس لئے زندہ رہنا چاہتا تھا وہ روتا ہوا بابو صاحب کے قدموں پر گر پڑا۔

"سرکار! معاف کیجئے۔ جہاں سے بنے گا روپئے لا حاضر کروں گا۔ تھوڑی مہلت دیجئے۔"

بابو صاحب یہی چاہتے تھے۔ اپنے مطلب کی بات سنکر خوش ہو گئے۔ انھیں فریب کا شبہ بھی نہیں ہوا۔ کیوں ہوتا وہ جب چاہتے رام جنم کو پکڑوا کر سزا دے سکتے تھے۔

اجازت لیکر رام جنم مکان واپس آیا۔ لیکن اس حال میں کہ چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ بیوی نے یہ حال دیکھا تو پریشان ہو گئی۔ بار بار پوچھ رہی تھی لیکن رام جنم صرف آنسوؤں اور سسکیوں سے جواب دیتا رہا۔ "مصیبت میں کسی کے ہمدردی کے الفاظ معلوم نہیں کیوں جذبات میں ایسی تحریک پیدا کر دیتے ہیں جیسے زخم کو چھیڑ دینا، کہہ سکتے ہیں۔ رام جنم کے زخم کو نشتر لگ گیا تھا۔ پھوٹ بہا دیر تک درو سے بلبلاتا رہا اور جب اسے سکون ہوا تو بیوی زیادہ بیتاب ہو گئی۔

رام جنم۔ "منی! آج تو کسی طرح بچکر نکل آیا۔ لیکن کیا معلوم پھر کیا حشر ہو۔ اب تو دنیا اندھیر معلوم ہوتی ہے راجپوت

ہوکر اتنی بے عزتی سہی نہیں جاتی۔ جان دیدینا کچھ مشکل نہیں۔ لیکن عزت کی بربادی ہرگز مجھ سے نہیں ہوسکتی۔ اور یہاں میری عزت ہی کا سوال ہے۔ یہی چیز مجھ سے چھینی جارہی ہے۔ بابو صاحب کو جانتی ہو اپنی ہٹ کے کیسے پکے ہیں؟ وہ مجھے کبھی نہیں چھوڑ سکتے اور روپیوں کا انتظار کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ اب تو اور کوئی صورت معلوم نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ یہاں سے کہیں بھاگ جاؤں۔

منی۔ کہاں جاؤ گے؟ اور ہم لوگوں کو کس پر چھوڑ دو گے۔ رام اسیس (رام جنم کا دو برس کا چھوٹا بچہ) کو کون پالے گا اور یہ کس کس کا منہ تکتا پھرے گا۔

رام جنم۔ نہیں منی! میں تم سب کو ساتھ لیکر جانا چاہتا ہوں۔ اس بستی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دوں گا۔ مجھ سے ایسا پاپ کیسے ہوسکے گا کہ خود تو مصیبت سے نکل جاؤں اور تم لوگوں کو اس میں چھوڑ جاؤں۔ تم ہی لوگوں کے لئے تو یہ ساری گالیاں برداشت کیں ورنہ کیا آج بابو صاحب سے اپنی ذلت کا بدلہ لئے بغیر واپس آتا؟

منی۔ پھر کہاں کا ارادہ ہے؟ غیر جگہ کس طرح گزرے گی۔ وہاں ہمیں کون پوچھیگا۔ یہ تو جنم استھان ہے برے بھلے گزر ہوجاتی ہے، پرائے لوگوں کو ہم پر کیوں ترس آنے لگا۔

رام جنم۔ اب کچھ ہو منی! میں ارادہ کرچکا ہوں۔ اگر کوئی سامان نہ ہوسکے گا تو فاقہ سے تڑپ تڑپ کر جان دیدوں گا۔ یہ سب کچھ گوارہ کرلوں گا لیکن بے عزتی کی زندگی تو مجھ سے بسر نہیں ہوسکتی۔ اور پھر یہیں کون بڑا سکھ نصیب ہے۔ دوسری جگہ بھی وہی ایشور ہے جو یہاں ہے وہاں بھی کھانے کو دے سکتا ہے۔ کم از کم اتنا تو ہوگا کہ وہاں مجھے کوئی جوتے مارنے کی دھمکی تو نہیں دے سکتا۔ آج ہی تیار ہوجاؤ۔ رات کی تاریکی میں ہم لوگ یہاں سے نکل جائیں تو اچھا ہے۔

شوہر کی باتیں سنکر منی زیادہ بدحواس ہوگئی۔ اس کا دل گھر چھوڑنے کو نہیں چاہتا تھا۔ جہاں زندگی کا بیشتر حصہ گزار چکی تھی وہاں اسے مرنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ سوچ رہی تھی لیکن کوئی اور صورت اس کی سمجھ میں نہ آئی آخرکار اُٹھی اور روانگی کی تیاریاں کرنے لگی۔ گھر میں تھوڑا سا جوار کا آٹا تھا اس کی روٹیاں پکائی گئیں۔ سالن اور سبزی کی جگہ مرچ اور لہسن کے بھرتے نے لی۔ دو سیر ستو ایک پوٹلی میں باندھ لیا گیا جو ٹوٹے پھوٹے کھانے کے برتن تھے وہ الگ گٹھری میں باندھ لئے گئے پرانے اور کثیف کپڑوں کی بھی ایک گٹھری ہوئی اور پھر ان دو تین الگ الگ گٹھریوں کو ایک ساتھ ایک بوسیدہ دری میں لپیٹ کر باندھ لیا گیا۔ اس طرح ایک پورے خاندان کے جملہ لوازم حیات صرف ایک گٹھری میں تبدیل ہوکر رہ گئے۔

شب کی تاریک فضا اگر ایک طرف جرم و معصیت کا دروازہ کھول دیتی ہے تو دوسری طرف بہتیرے مظلوم اور شریف نفوس کی عزت و جان کے لئے پردہ پوشی بھی ثابت ہوتی ہے۔ رام جنم نے بھی ایسی ہی مناسب گھڑی میں

گھر اور گاؤں پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور رخصت ہوگیا۔ آگے بڑھ کر اس نے منی سے کہا چلو منی! ہم لوگ اپنے کھیت پر سے ہوتے ہوئے چلیں۔ آخری بار ان درختوں سے بھی رخصت ہولیں جنکی پرورش اپنے خون کو پانی کرکرکے کرتے رہے ہیں۔

منی گود میں رام اسیس کو اٹھائے ہوئے تھی اور رام جنم گٹھری سر پر رکھے ہوئے تھا۔ اسی طرح یہ دو آدمیوں کا قافلہ بہار شریف ہوتا ہوا گیا پہونچا۔ گیا سے ڈہبھی روڈ اور پھر وہاں سے اس سڑک پر آگیا جسے شیر شاہ نے اپنے مختصر دور حکومت میں تعمیر کرایا تھا۔ وہاں سے ان لوگوں نے کلکتہ کا رخ کیا۔

روزانہ سفر اسی طرح جاری تھا۔ جہاں شام ہوتی وہیں صبح کی جاتی۔ اکثر راتیں درختوں کے نیچے بسر ہوتیں منی رام اسیس کو سینے سے لگا کر پڑ رہتی۔ رام جنم کو انتہائی تکان کے باوجود بھی شب کی زیادہ گھڑیاں اپنی قسمت پر آنسو بہاتے گزر جاتیں۔

مصیبت تنہا نہیں آتی، یہ ایک حقیقت ہے اور ایسی صورت میں انسان کا مجبور محض ہوجانا ایسی جاں گسل حقیقت ہے جس کی اہمیت کو فطرت کا ظلم کہکر بھی پوری طرح ظاہر نہیں کرسکتے۔ رام جنم آوارہ گردی اور جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ کبھی منزل تک پہونچ سکیگا۔ دل وجگر یوں نہیں کیا کم زخم خوردہ تھے کہ قدرت نے ایک اور زخم تازہ پیدا کردیا۔ ایک روز نیند میں رام اسیس ماں کی آغوش سے الگ ہوگیا۔ اتفاقاً ایک سانپ نکلا اور ڈس گیا۔ رام جنم بے دست و پا تھا۔ کوئی چارہ نہ تھا۔ بچہ دم توڑ رہا تھا اور ماں باپ بے بسی کے عالم میں دیکھ رہے تھے۔ رام جنم کیا کرسکتا تھا۔ وہ جگہ آبادی سے کوسوں دور تھی۔ بالآخر اپنے جگر کے ٹکڑے کو ایک کثیف اور پھٹے ہوئے کپڑے کے ٹکڑے میں لپیٹ کر اسی جگہ ایک گڑھے میں ڈال دیا۔

اسی طرح مصیبت کے دن اور تکلیف کی راتیں بسر کرتے ہوئے رام جنم اور منی کلکتہ پہونچے۔ انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کہاں ٹھیریں۔ آخر کسی سے پوچھکر ایک مارواڑی کے دھرم شالہ میں جا ٹھیرے۔ رام جنم کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ یہاں غریبوں کو کھانا بھی مفت دیا جاتا ہے۔

تقریباً ایک ہفتہ اس نے خاموشی سے گزار دیا۔ لیکن اب اسے فکر ہونے لگی کہ اپنے لئے وجہ معاش تلاش کرے۔ مفت کی روٹیوں پر کب تک بسر کریگا۔ بہت دوڑ دھوپ کی لیکن سب بیکار۔ اسے ہر طرف سے مایوسی ہوگئی۔ آخر اس کے ذہن میں ایک بات آئی۔ منی کے روپے کے کڑے، جو اس کے جسم کے آخری زیور تھے فروخت کردئے اور ان روپیوں سے پھلوں کی تجارت شروع کردی۔ دوکانداروں سے پھل خریدتا اور پھیری کرکے بیچ لاتا۔ شدہ شدہ اس کی ایمانداری سے دوکاندار بھی واقف ہوتے گئے اور اب اسے نقد اور ادھار سب ملنے لگا۔ اب وہ زیادہ مقدار میں پھل خریدتا اور فروخت کرتا۔ اسے اتنا نفع ہونے لگا کہ اس میں سے کچھ پیسے پس انداز بھی کرلیتا

رام جنم نے ایک کوٹھری کرایہ پر لے رکھی تھی اور اب وہ بے فکر زندگی بسر کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ جب اسکے پاس کچھ روپئے جمع ہو گئے تو وہ ایک دوکان کرایہ پر لے کر بیٹھ گیا۔

(۴)

زمانہ بقدر دس سال آگے بڑھ چکا ہے اور اس عرصہ میں خدا جانے کتنے انقلابات دنیا میں رونما ہوئے، بابو راجگوپال سنگھ کے یہاں شادی ہو چکی ہے، اور ایسی شادی کہ آس پاس کے رہنے والوں نے کبھی ایسی دھوم دھام نہیں دیکھی تھی۔ رام جنم سنگھ کا تذکرہ کچھ روز تو لوگوں کی زبان پر رہا لیکن کب تک، ممکن ہے لوگوں کے دماغ سے اب بھی اسکی تصویر فنا نہ ہوئی ہو لیکن انھیں کیا ضرورت تھی کہ وہ اس کا تذکرہ کرتے —— ایک غریب کے وجود کو اتنی اہمیت حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔

رام جنم اپنی تجارت میں برابر ترقی کر رہا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں کلکتہ کے پھل کے تاجروں میں عزت کی نظر سے دیکھا جانے لگا اور اب وہ ایک بڑی آڑھت کا مالک ہو گیا آمدنی کافی تھی۔ روپئے خوب جمع ہوتے رہے اگر اسوقت وہ اپنے گاؤں میں ہوتا تو امیر سمجھا جاتا اور بابو صاحب بھی اس کی عزت کرنے پر مجبور ہو جاتے۔

رام جنم جب رات کو آڑھت سے واپس آتا تو اکثر منی کے ساتھ بیٹھکر اپنے گزشتہ ایام پر تبصرہ کرتا۔ گاؤں کے ایک ایک فرد کا نام لے لیکر ان کے متعلق قیاس آرائیاں کرتا۔ کبھی کہتا کلیشور سنگھ یاد ہے منی! اس نے اپنے پوتے کی برہی میں کیسی دھوم دھام کی تھی۔ کتنے برہمن آئے تھے۔ بھائی بندوں کو بھی خوب کھلایا تھا۔ اب تو اس کے کتنے پوتے پوتیاں ہو چکی ہوں گی اب بھی جب بابو صاحب کا نام آتا تو ایک سرد آہ کھینچتا اور آنکھ سے آنسو ٹپک پڑتے ——

منی سمجھاتی کہ کیوں فکر کرتے ہو جو ہونا تھا ہو چکا۔ سوچو تو اگر بابو صاحب ایسا نہ کرتے تو ہم لوگوں کو کبھی اطمینان نصیب ہو سکتا تھا؟ ایشور کو دینا تھا اس لئے بابو صاحب کو اس کا ذریعہ بنا دیا۔ تم اسے ظلم کہتے ہو لیکن اب تو میں اسے ان کا احسان سمجھتی ہوں۔ اور اگر میرا بس چلتا تو اس احسان کا بدلہ اتارتی میرا بہت جی چاہتا ہے کہ اپنے گاؤں میں جا کر لوگوں سے مل آتی۔ زندگی موت کا کیا ٹھکانہ ہے۔ دیومتی کو دیکھے ہوئے کتنے برس گزر گئے۔ اسے بھی سسرال سے بلوا کر دیکھ لیتی۔

رام جنم —— اگر تمھاری یہ خواہش ہے تو کون منع کرتا ہے۔ چلو میرا بھی جی چاہتا ہے۔

رام جنم نے دوسرے ہی روز جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ گاؤں کے ایک ایک فرد کے لئے تحفے خریدے گئے۔ بسکٹ، ناریل کا تیل، اور کھجور تو کثیر مقدار میں تھی۔ کلکتے کے یہ تحفے دیہاتیوں میں بہت مقبول ہیں —— بابو صاحب کے لئے ایک گھڑی اور ایک خوبصورت چھتری خریدی گئی ——

(۵)

رام جنم دس برس کے بعد وطن واپس آرہا تھا۔ راستہ میں گاؤں کی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتا جاتا تھا۔ بابو صاحب کا مکان بھی راستہ ہی میں پڑتا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کی عجیب حالت ہوگئی۔ چاروں طرف وہ سناٹا تھا گھبرا گیا گاؤں میں پہونچا تو ایک ہنگامہ مچ گیا۔ بچے بوڑھے، جوان سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔ عورتیں دروازوں سے جھانک جھانک دیکھ رہی تھیں اور اس کی شان و شوکت کو دیکھ کر تعجب کر رہی تھیں۔ رام جنم نے بابو صاحب کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ساری جائداد ہاتھ سے جاتی رہی اور اب وہ بالکل مفلس ہو کر رہ گئے ہیں سیٹھ بھگوانداس نے روپیوں کی نالش کردی اور پوری جائداد نیلام پر چڑھ گئی۔ بابو صاحب بہت دوڑے دھوپے لیکن کوئی سبیل روپیوں کی نہ ہوسکی۔ اپنے سمدھی سے التجا کی لیکن وہاں سے بھی صاف جواب ملا۔ کلکٹر صاحب نے ایک ماہ کی اور مہلت دی اور اب حالت یہ ہے کہ بابو صاحب ایک ہفتہ سے گھر میں بند ہیں، باہر انھیں کوئی نہیں دیکھتا۔

رام جنم نے سارے واقعات سنے اور دانت کے نیچے انگلی دبا کر رہ گیا۔ اسے متی کے الفاظ یاد آرہے تھے "اگر میرا بس چلتا تو احسان کا بدلہ اتارتی"۔ دوسرے روز علی الصباح اٹھا اور سیدھا پٹنہ پہونچا۔ پوری کی پوری رقم مطلوبہ خزانہ میں داخل کردی۔ سیٹھ بھگوانداس سے بھی ملا۔ پھر ضروری کاغذات لیکر وہاں سے روانہ ہوا کہ گاؤں میں پہونچکر بابو صاحب کے حوالے کردے۔ لیکن جب گاؤں کے کنارے پہونچا تو دیکھا کہ لوگ ایک لاش اٹھائے مرگھٹ کی طرف جارہے ہیں ـــــ ذلت اور رسوائی کے خوف سے بابو صاحب نے خودکشی کرلی تھی۔

الیاس اسلام پوری

"نگار" جنوری ۳۷ء

اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل جدید چیز ہوگا اور مفید ہونے کی حیثیت سے حد درجہ اہم۔ علوم و فنون اور ادب و انشاء کے متعلق اتنے مفید اور دلکش مضامین کا مجموعہ مشکل ہی سے آپ کو کہیں اور نظر آسکتا ہے۔

"ڈرامہ اصحاب کہف"

بھی مکمل اسی میں شائع ہوگا اور علاوہ اس کے اور بھی اکثر مضامین اڈیٹر کے قلم کے ہوں گے ضخامت بھی دو چند ہوگی۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

حیات بعد الموت

"حیات بعد الموت" ابتدائے آفرینش سے ایک ایسا معمہ ہے جس کو حل کرنے کے لئے بنی آدم کے بہترین
ماغ مدت العمر تک پریشان رہے مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ انسان کو اپنی حیات سے بہت محبت ہے اور
س کے تلف ہونے کے خیال سے وہ ایسا پژمردہ اور نڈھال ہو جاتا ہے کہ دیکھکر افسوس بھی ہوتا ہے اور
نسی بھی آتی ہے۔ فطرت کی یہ بھی ستم ظریفی ہے کہ اس نے انسان کو اسی چیز سے حد درجہ محبت کرنا سکھایا جسکی
ئداری پر خود اس کو اعتبار نہیں۔ موت کے صرف خیال سے انسان پریشان ہو جاتا ہے مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟
ت آتی ہے اور ضرور آتی ہے اور مرنے والے کی تمام حسرتوں اور ارمانوں کا چشم زدن میں خاتمہ کر دیتی ہے۔
ب سے پہلے انسان جس نے اپنے محبوب کو مرتے دیکھا ہوگا وہ اس انقلاب پر کتنا متعجب ہوا ہوگا اور اس
لو کا ذکر اس نے کتنی حیرت و حسرت سے کیا ہوگا کہ مرنے والا دفعتاً خاموش ہو گیا ہے حالانکہ اس کی زبان
جود ہے۔ مرنے والا کچھ دیکھ نہیں سکتا حالانکہ اس کی آنکھیں موجود ہیں الغرض وہ سرتاپا مکمل انسان ہے
پھر بھی انسان نہیں۔

اسی طرح پشت در پشت موت اپنا قبضہ جماتی رہی اور یکے بعد دیگرے انسان مرتے رہے۔ موت کے بعد کا معمہ
تور معمہ بنا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ انسان کے درمیان بانیان مذہب آئے اور انھوں نے یہ دیکھ کر کہ انسان موت
بعد کی حالت جاننے کے لئے بیقرار ہے۔ موت کے بعد حیات کا یقین انسان کو کچھ اس شد و مد سے دلایا کہ اسنے
اس کا یقین کر لیا۔ تاریخ عالم کے صفحات شاہد ہیں کہ سادہ لوح انسان نے اس نظریہ پر کس طرح یقین کیا
یات بعد الموت کے مزے چکھنے کے لئے اس حیات قبل از موت کو کیونکر ٹھکرا دیا۔ ایک رات کی بیاہی ہوئی دہن
رمان اور ولولے بھرے ہوئے دل کو پہلو سے جدا کر کے دولہا نے شوق شہادت میں تلوار لی ہے اور انسان
تقدس عورت کو بہانے کی فکر میں خود اپنی گردن گھونٹتا ہے تاکہ مرنے کے بعد حیات دائمی حاصل کرے اور "وہاں"
سرتوں سے لطف اندوز ہو۔

اب آئیے ذرا دیکھیں کہ انسانیت نے عہد طفلی سے لیکر آج تک "حیات بعد الموت" کو کس کس طرح سمجھانے
شش کی ہے۔ انسان کا جسم مرنے کے بعد چونکہ سڑ جاتا ہے اور اس کی ہیئت اس قابل نہیں رہتی کہ کوئ

آدمی اس صورت میں جینا پسند کرے اس لئے جوہر حیات یا روح کو وجود میں لانا پڑا یعنی جسم کے ماسوا بھی انسان کے اندر ایسا جوہر موجود ہے جو روح ہے اور اس میں حیات ہے۔ روح بھی لطائف زندگی سے اسی طرح محفوظ ہو سکتی ہے جس طرح ایک گوشت پوست والا انسان۔ مذہب نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ہمارا کبھی نہ فنا ہونے والا جوہر یعنی روح مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے اور یہ ایک نہ ایک دن ہمارے مردہ اجسام میں پھر آکر پیوست ہو جائے گا اور ہمیں زندہ کر دے گا۔ اس نظریہ کے لئے ضرورت پڑی کہ انسان کے جسم کو مرنے کے بعد برباد نہ کیا جائے بلکہ محفوظ رکھا جائے مردہ جسم کو محفوظ رکھنے کے لئے صدیوں تک انسان نے انتھک کوششیں کیں اور اس علم کو انتہائے کمال تک پہونچا دیا جس کی مثال ہم مصری ممی شدہ لاشوں میں پاتے ہیں۔ اہرام مصری میں لاش کے ساتھ ساتھ ہم تمام ان ضروریات زندگی کی چیزوں کو پاتے ہیں جن کی ضرورت انسان کو دفعتاً جی اُٹھنے کے بعد پڑ سکتی ہے مثلاً کھانا، بستر، کپڑا، زیور وغیرہ۔ اہرام مصری کے یہ لوازم گویا مذہب کے اس نظریہ کا بہترین ثبوت ہیں کہ مرا ہوا انسان ایک روز زندہ ہوگا اور وہ پھر ہماری طرح زندگی بسر کریگا۔ پارسیوں کا اپنی لاشوں کو ایک محفوظ مقام میں رکھ چھوڑنا بھی اسی خیال سے ہے کہ ایک روز روح آئے گی اور مردہ جسم میں داخل ہو کر مرے ہوئے انسان کو جلا دے گی۔

انسانی دماغ کچھ اور بڑھا اور مذکورۂ بالا نظریہ اس کو مہمل سا معلوم ہونے لگا۔ اس میں سزا و جزا کی گنجائش نہ تھی یعنی مرنے کے بعد جو انسان جس حیثیت میں مرا تھا پھر زندہ ہونے کے بعد اس کی وہی حیثیت قائم رہتی تھی اسلئے اس دفعہ مذہب نے یہ نظریہ پیش کیا کہ مرنے کے بعد روح زندہ تو ضرور رہتی ہے مگر یہ لازم نہیں کہ وہ اپنے سابق جسم ہی میں واپس آئے۔ اگر وہ گنا ہگار ہے تو اس کی روح گدھے، گھوڑے وغیرہ کے جسم میں لوٹ کر آئے گی اور اگر نیک ہے تو بادشاہ یا سپہ سالار کی صورت میں۔ چنانچہ یہ عقیدہ ہندوں میں ابتک پایا جاتا ہے۔ اب چونکہ روح کو جسم کی ضرورت باقی نہ رہی تو مردہ جسم کو جلایا جانے لگا جو لاشہ کو برباد کرنے کی، حفظان صحت کے نقطۂ خیال سے بہترین صورت ہے۔

مذاہب عالم نے حیات بعد الموت کو سمجھانے کی جو کوششیں کی ہیں وہ انسانی کم عقلی کے عجیب و غریب کارنامے ہیں۔ لاشہ کو سجا کر پوجنا، مرنے کے بعد لاشہ کے پاس بیٹھ کر گانا، لاشہ کو گاؤں کے باہر لٹکا دینا اور اس کی گرد جمع ہو کر صبح شام دعائیں مانگنا کہ روٹھی ہوئی روح واپس آجائے، لاشہ کو کھانے کی میز پر بٹھا کر اسکی اُنگلیوں کو نہایت لذیذ کھانوں میں ڈبو دینا اور اس کو دکھا کر کھانا تاکہ گئی ہوئی روح کھانے کی لالچ سے واپس آجائے۔ لاشہ کی صورت کا بت بنا کر پوجنا۔ الغرض اس طرح کی مضحکہ خیز سینکڑوں ترکیبیں مذاہب نے نکالیں جو آج تک اب وحشیانہ سے اوراق کو زیب دیتی ہیں یا ان کو دیکھ کر عقل سلیم کا انسان ہنس دیتا ہے اور اپنی ضعیف الاعتقادی

پر شرمندہ ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا کی یہ سب سے بڑی ٹریجڈی ہے کہ انسان اپنی مرضی کے خلاف ایک نہ ایک دن مرجاتا ہے اور اپنے ساتھ ناتمام حسرتوں کو لیکر ہمیشہ کے لئے ساکت ہوجاتا ہے۔ انسان اپنی اس مجبوری پر چاہے سیکڑوں سال تک خون کے آنسو روتا رہے مگر یہ اختتام یقینی ہے اور اس سے مفر نہیں۔

ابتک میں نے جو کچھ اس مسئلہ پر لکھا ہے وہ علمی حیثیت سے بہت دور صرف مذہب کے مفروضات سے تعلق رکھتا ہے۔ چونکہ ہر انسان کو مرنا ضرور ہے اس لئے اس مسئلہ پر سوچنا اور اپنی سمجھ بھر کسی نقطہ پر آکر اپنی تشفی کرلینا اس کا پیدائشی حق ہے۔ ہمارے ساتھ ساتھ دنیا میں اور بھی ذی حیات چیزیں ہیں جن میں حس حیات اسی حد تک موجود ہے جتنی ہم میں مثلاً حیوانات، نباتات وغیرہ۔ ایک مرغ کو لیجئے، انسان کی طرح حیات و حواس خمسہ اس میں بھی موجود ہیں۔ وہ صنف نازک کی طرف اسی رغبت سے ملتفت ہوتا ہے جس طرح ایک جوان مرد جوان عورت کی طرف۔ وہ بانگ دیتا ہے۔ بلی کی آواز سنکر کٹکٹاتا ہے۔ چاول دیکھ کر کھانے کو دوڑتا ہے اس کے پروں کو چھو دیجئے تو وہ چونک اٹھتا ہے۔ اس کو ذبح کرنے کے لئے پکڑنا چاہئے تو اسی شد و مد سے اپنی جان بچانے کی کوشش کرتا ہے جس طرح ایک انسان مردم خور انسان یا شیر سے اپنی جان بچانے کو بھاگتا ہو ہم اس کو ذبح کرکے کباب کرتے ہیں اور کھاجاتے ہیں۔ کبھی بھول کر ڈکار لیتے وقت مرحوم مرغ کی خوبصورت پروں یا اس کی صبح کی خوش الحانی یا اذان پر دو جملے تعزیت کے بھی نہیں کہتے۔ یہ کیوں؟ چونکہ وہ مرغ ہے۔ انسان نہیں حیات بعد الموت پر اس کو کوئی اختیار نہیں۔ یہ حیات اور لطف حیات تو انسان کی چیز ہے۔ وہ اس دنیا میں بھی لطف اٹھاتا ہے اور مرنے کے بعد بھی ایک دنیا قائم کرکے اس میں زندہ رہنا چاہتا ہے اور وہی لطف اٹھانا چاہتا ہے۔ اگر حیات بعد الموت انسان کے لئے ہے تو دنیا کی تمام ذی روح چیزوں کے لئے بھی ہوگی، اور حیوانات، نباتات وغیرہ بھی مرنے کے بعد زندہ ہوں گے۔ اس لحاظ سے ہر درخت جو کٹ کر فنا ہوچکا ہے وہ پھر اپنی جلی ہوئی لکڑیوں کو ایک جاکر کے زندہ ہوگا اور پھر اسی طرح سرسبز و شاداب ہوگا جیسا کہ جلنے کے قبل تھا صرف یہ خیال کہ جلکر راکھ ہوچکنے والا درخت بھی پھر سرسبز و شاداب ہوگا ایک حیات بعد الموت پر عقیدہ رکھنے والے انسان کے لئے کتنا مضحکہ خیز ہے۔

انسان مجموعہ ہے حواس خمسہ کا، دل کی حرکت اور صدر کے چھوٹنے اور پچکنے کا۔ یہ تمام چیزیں یا عناصر ایک خاص طرح ترکیب پاتی ہیں تو حیات بنتی ہے۔ پھر یہی اجزا کی ترکیب جب پریشان ہوجاتی ہے تو موت آتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ آپریشن کی میز پر مریضوں کو کلوروفارم سنگھاکر بیہوش کردیتے ہیں۔ انسان بے ہوش ہوجاتا ہے مگر اس کے دل اور صدر کام کرتے رہتے ہیں ہیں حالانکہ بادی النظر میں وہ مردہ ہے مگر ایک عالم یہ ہیکہ وہ مرا نہیں بلکہ زندہ ہے۔ گویا ہماری حیات یا جان منحصر ہے صرف اسی چیز پر جس کو دل کی حرکت اور سانس کا لینا

کہتے ہیں۔ میرے ساتھ اکثر یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ مریض آپریشن ٹیبل پر گیا اور اس کے دل کی حرکت بند ہو گئی
میری میز پر زیادہ سے زیادہ ایک منٹ ۵۵ سکنڈ تک ایک انسان اس حالت میں مردہ پڑا رہا ہے یعنی اسکی
سانس رک گئی ہونٹ نیلے ہو گئے، آنکھیں پتھرا گئیں۔ الغرض وہ تمام نشانات ابھر آئے جو مرنے کے بعد ظاہر
ہوتے ہیں۔ بڑی کاوشوں کے بعد جان لوٹی یعنی دل چلنے لگا اور سانس بھی۔ کچھ دیر کے بعد ہوش آیا۔ میں نے
بڑی بے تابی سے پوچھا کہ اس نے اس دوران میں کیا محسوس کیا۔ مریض نے کہا "کچھ بھی نہیں۔ مجھے کوئی خبر
نہیں کہ کیا ہوا۔ میں کہاں ہوں اور کیا ہوں، میرے تمام احساس مفقود تھے۔ میرے وجود کا فقدان تھا۔
گویا میں کچھ تھا ہی نہیں" اس مریض سے اس ایک منٹ ۵۵ سکنڈ کے متعلق پوچھنا ایسا ہی تھا جیسے کسی
مردہ کو قبر سے اٹھا کر وہاں کی حالت دریافت کرنا۔ آپریشن ٹیبل پر مرنے کا واقعہ اکثر ڈاکٹروں کو پیش آیا ہے بلکہ
حال ہی میں ایک شخص کی جان دس منٹ کے بعد لوٹی۔ اس سے بھی سوال کیا گیا تو یہی جواب ملا۔ اس قسم کے
واقعات و نیز اس جوگی کا واقعہ جو چالیس دن تک قبر میں گزار رہا اس بات کی روشن دلیل ہے کہ موت کے
بعد انسان پر وہی کیفیت طاری ہوتی ہے جو روزانہ اس کو حالت خواب میں ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ
نیند میں انسان مرتا نہیں بلکہ جیتا رہتا ہے یعنی نیند میں خواب کا دیکھنا مہمل سا عذر ہے حیات بعد الموت
کے لئے۔ انسان کی نیند جب گہری ہو گی تو وہ کبھی خواب نہ دیکھے گا۔ خواب دیکھنا نیند کے ہلکے ہونے کا ثبوت
ہے اور میری مراد ہلکی نیند سے نہیں بلکہ گہری نیند سے ہے۔ عذر لنگ پیش کرنے والے انسان جو مرنے کے بعد بھی
مرنا نہیں چاہتے آپریشن ٹیبل کی موت کو بستر مرگ کی موت سے جدا بتاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں "چونکہ روح کو
خبر تھی کہ مجھے اس خاکی جسم میں لوٹ کر آنا ہے اس لئے وہ جسم سے قطعی نکلی نہیں بلکہ اسی میں رہی۔ اس لئے
وہ روح موت کے بعد والی دنیا کی کیا خبر لا سکتی ہے جو اس دنیا میں کبھی گئی ہی نہیں" یہ عذر کتنا پوچ ہے
— ان کی دلیل سے روح اور حیات دو چیزیں ہوئیں۔ روح کے وجود کا خود مالک روح کو احساس نہیں۔
روح اور انسان دونوں دو طرح اور دو خیال کی چیزیں ہوئیں یعنی مالک روح کو یہ خبر نہیں کہ یہ کس کی روح
ہے اور روح کو معلوم نہیں کہ میں کس کی ہوں۔ پھر مجھے کوئی یہ بتائے کہ اس حیات کو حیات کیونکر کہا جائے جہاں
جینے والے کو خود یہ خبر نہ ہو کہ میں کون ہوں، میں کیا تھا، میں جی رہا ہوں کہ مر گیا۔ میرے خیال میں زندگی نام ہے
احساس خودی کا، ماحول کی مانوس چیزوں میں رہنے کا اور ان سے لطف اندوز ہونے کا۔ اگر دل اور صدر
کی حرکت کے باوجود ان کیفیات کو کسی انسان سے سلب کر لیجئے تو وہ مردہ ہو جائے گا اگرچہ دیکھنے میں وہ زندہ ہے
اسی عام آب و گل میں مقید ہے۔

مادہ برباد ہونے والی شے نہیں۔ انسان کا جسم بھی مادی ہے۔ مرنے کے بعد وہ تمام قوت جس کو اس نے

اس نے غذا کے ذریعہ سے اپنے جسم میں جمع کیا تھا ضائع نہیں ہوتی بلکہ دوسری صورت اختیار کر لیتی۔ مثلاً اس کے جسم کا سڑ کر نہایت عمدہ کھاد کا تیار ہونا جس سے سیکڑوں طرح کے پھول اور پھل پیدا ہوں۔ ہیں۔ سڑتے وقت متعفن گیسوں کا پیدا ہونا جو فضا میں پھیل کر عالم نباتات میں قوت پیدا کرتے ہیں وغیرہ وغ الغرض قوت دوسری چیزوں میں جذب ہوجاتی ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ زید مع اپنے تمام احساسات علم کے کہ میں زید ہوں پھول یا پھل بن جاتا ہے یعنی ایک خاص گلاب کا پھول یہ کبھی محسوس نہیں کرتا کہ میں ز جسم سے بنا ہوں یا میں وہی زید ہوں جو بکر کا بیٹا تھا، ملیح آباد میں رہتا تھا اور آموں کی تجارت کرتا تھ زید مرنے کے بعد ختم ہوگیا اور اس کے احساسات وغیرہ اس کے ساتھ فنا ہوگئے۔ اس کی کشمکش حیات و ختم ہوگئی۔ اب یہ فطرت کا کام ہے کہ اس کے جسم سے کیوڑہ اگائے یا اس کی ہڈیوں سے فاسفورس بنا۔ جس کا احساس زید کو کبھی بھی نہ ہوگا۔

مشاہدہ اور تجربہ کی روشنی میں حیات بعد الموت کی حقیقت "خواب پریشاں" سے زیادہ نہیں ر مگر انسان جو صدیوں سے "دین وعقبیٰ" جیسے الفاظ سننے کا عادی ہوچکا ہے وہ بھلا کیونکر ماننے لگا۔ کیونکہ جواب میں اس کے مذہبی جوش وخروش کا کوئی معاوضہ نہیں، اس میں اس کی بڑھتی ہوئی حرص کے۔ کوئی توقع موجود نہیں۔ اس میں اسکی موت کی تکلیف وحسرت کا غم کرنے کے لئے دوسری زندگی کا کوئی سا نہیں۔ مگر آہ! انسان کتنا ذلیل اور طامع ہے۔ کیا اس دنیا کی ساٹھ سال کی ریاکاریوں کے بعد بھی اس طبیعت کو تشفی نہیں ہوتی کہ وہ پھر اپنے مکروفریب کے لئے مرنے کے بعد بھی دوسری دنیا چاہتا ہے! موت، قوائے مضمحل کے لئے کبھی نہ ٹوٹنے والی نیند ہے۔ یہ نیند ساٹھ سال کی انتھک اور مسلسل تگ و کے بعد کتنی میٹھی اور گہری ہوگی؟ اس نیند سے بھلا کون جاگنا چاہیگا اور دوبارہ زندگی اور آلام زندگی سے اپنے اعصاب کو پراگندہ کرنا چاہیگا؟ مجھے اس کا یقین ہے کہ اس نیند کا ایک بار مزہ چکھنے کے بعد کوئی ایسا نہ چاہے گا کہ پھر وہ جاگے اور دوڑ دھوپ کرے۔

سقراط نے سچ کہا ہے کہ "موت کی تلخی صرف اس کے خیال میں ہے"

محمد نصیر الدین ایم۔ بی۔ بی۔ ایس (آنرز) مونگیر

گاندھی جی کی نئی بانی

ذیل میں گاندھی جی کا وہ خطبہ درج کیا جاتا ہے جو بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے صدر ہونے کی حیثیت سے انھوں نے ناگپور میں پڑھا تھا۔

اگر قارئین نگار میں سے کوئی صاحب اس کو سمجھ لیں تو اس کی ذمہ داری گاندھی جی کے سر نہیں ہے بلکہ وہی اس کے جوابدہ ہیں کیونکہ لکھنے والے کا مقصود تو یہی تھا کہ کوئی مسلمان اسے صحیح پڑھ بھی نہ سکے، سمجھنے کا کیا ذکر ہے۔

یہ ہے وہ زبان جسے ہندوستان کی مشترکہ زبان سمجھنے پر اصرار کیا جاتا ہے اور یہ ہے وہ لٹریچر جسے "سخن گسترانہ" طور پر غالب کے جواب میں بجائے نظم کے نثر میں پیش کیا جا رہا ہے۔ مرزا نوشہ اگر آج زندہ ہوتے تو وہی پوچھ سکتے تھے کہ "یہ انداز گفتگو کیا ہے"۔ ہم اس کے اعتراف میں سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ بیشک عربی فارسی کے الفاظ قابل ترک ہیں اور یہ "دیو بانی" لایق احترام۔

ہمارے عزیز دوست میاں بشیر احمد بی۔اے اور زبان کو سہل تر بنانے کے سلسلہ میں اسی قسم کا مشورہ دینے والے دوسرے حضرات انشاء کے اس جدید نمونہ کو دیکھ کر غالباً بہت خوش ہوں گے کیونکہ "عربی فارسی الفاظ" ترک کر کے ایک دوسرے سے بات کرنے کی مثال شاید ہی اس سے بہتر کوئی اور مل سکے!

(نیاز)

اس سبھا کا پتی بننے کے لئے جب میں ڈھونڈھتا ہوں تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں۔ ایک میرا ساہتیہ کار نہ ہونا اور اس لئے کم سے کم دوش کا کارن ہونا تھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم جو کچھ ہو میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریں گے اور بھوشیہ میں اپنا سیوا کشیتر بڑھاویں گے۔۔

یدی ہم شری نگر سے لے کر کنیا کماری تک اور کراچی سے لے کر ڈبرو گڑھ تک جو یہ دیش ہے اسے ایک مانتے ہیں

اور اس کے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں تو اس پردیش کے پرتیک بھاگ کے ساہتیہ کار، بھاشا شاستری اِتیادی آپس میں کیوں نہ ملیں اور بھن بھن بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی ایکتا یو گیہ سیوا کیوں نہ کریں۔

گجراتی اپنے پڑوسی مہاراشٹری کی بھاشا جاننے کا بھی پرتین کرتے دیکھنے میں نہیں آتے ہیں۔ ہندی جاننے والے بھی اُردو لیپی سیکھنے کا کشٹ کم اُٹھاتے ہیں۔ اُردو جاننے والے مسلمان کو چت ہی دیوناگری لیپی پڑھنے کا اتھوا ہندی میں پرچلت سنسکرت شبدوں کے ارتھ جاننے کا کشٹ اُٹھاتے ہیں۔ کہیں بھی دیکھیں وستو ستھیتی ایسی دیا جنک ہے۔ کسی کے دوش نکالنے کا یہ ستھان نہیں ہے۔ دوش درشن میں ہمیں کچھ لابھ ہو سکتا نہیں وستو ستھیتی جان کر اسے یتھا سمبھو مٹانے کے لئے ہی ہم اکٹھے ہوئے ہیں۔

وِدوان لوگ ایک دوسرے کے ساہتیہ کا کچھ گیان پاویں۔ اتنے ہی سے ہمیں سنتوش ہونے کا نہیں ہے۔ ہمیں تو دیہاتی ساہتیہ کی بھی درکار ہے اور دیہاتیوں میں آدھونک ساہتیہ کے پرچار کی۔ شرم کی بات ہے کہ چینیا کی پرسادی بھارت ورش کے سارے بھاشا بھاشیوں کو اپرا پیہ ہے ترودیلود۔ کا نام تک شاید ہم سب نہیں جانتے ہوں گے۔ اتر بھارت کی جنتا تو اس سنت لوگ کر سکے ہیں۔ اس بارے میں اس وقت تو تو کارام ہی دوسرا نام میرے خیال میں آتا ہے۔

اگر ہم سارے ہندوستان کے ساہتیہ کے وشال کشیتر میں پردیش کریں تو کیا اس کی کچھ سیما مریادا ہونی چاہئے۔ میری درشٹی میں تو وشیے ہونی چاہئے۔ مجھے پستکوں کی سنکھیا بڑھانے کا موہ کبھی نہیں رہا ہے۔ پرتیک پرانت کی بھاشا میں لکھی اور چھپی پرتیک پستک کا پرچیے دوسری سب بھاشاؤں میں ہونا میں آوشیک نہیں مانتا ہوں۔ ایسا پرتین یدی سمبھو بھی ہو تو اسے میں ہانی کارک سمجھتا ہوں۔ جو ساہتیہ ایکتا کا، نیتی کا، شوریادی گنوں کا، وگیان کا پوشک ہے اس کا پرچار پرتیک پرانت میں ہونا آوشیک اور لابھ دایک ہے۔

آج کل شرنگار یکت اشلیل ساہتیہ کی باڑھ سب پرانتوں میں آرہی ہے۔ کوئی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ایک شرنگار کو چھوڑ کر اور کوئی رس ہے ہی نہیں۔ شرنگار رس کو بڑھانے کے کارن ایسے سجن دوسروں کو "تیاگی" کر ان کی اُپیکشا اور اُپہاس کرتے ہیں۔ جو سب چیزوں کا تیاگ کر بیٹھتے ہیں وے بھی رس کا تو تیاگ نہیں کر پاتے کسی نہ کسی پرکار کے رس سے ہم سب بھرے ہیں۔ دادا بھائی نوروجی نے دیش کے لئے سب کچھ چھوڑا تھا۔ وے تو بڑے رسک تھے۔ دیش سیوا ہی انھوں نے اپنا رس بنا رکھا تھا۔ اسی میں انھیں پرسنتا ملتی تھی۔ چینیا کو ہمیں کیا رس کو ہی نہیں جاننا ہے۔ نرسنگھ مہتا نے اپنے کو بھوگی بتایا ہے۔ یدیپی وے گجرات کے بھگت شرومنی تھے آپکے نہ اکھرے تو میں تو یہاں تک کہوں گا کہ میں شرنگار رس کو تچھ رس سمجھتا ہوں جب اس میں اشلیلتا آتی ہے تب اسے سرتھا تیاجیا مانتا ہوں۔ یدی میری چلے تو میں اس سنستھا میں ایسے رس کو تیاجیہ منوا دوں۔ اسی طرح

قومی بھیدوں کو دھرم اندھتا کو تھا پر جا بیں اتھوا دکیتوں میں وے ندیہ کو جو ساہتیہ بڑھاتا ہے اس کا بھی تیاگ ہونا آوشیک ہے۔

یہ کاریہ کیسے کیا جائے؟ منشی جی اور کاکا صاحب نے ہمارا مارگ ایک حد تک صاف کر رکھا ہے۔ ویاپک ساہتیہ کا پرچار ویاپک بھاشا میں ہی ہو سکتا ہے۔ ایسی بھاشا اپنہ بھاشا کی اپیکشا ہندی ہندوستانی ہی ہے ہندی کو ہندوستانی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس بھاشا میں فارسی محاورے کے شبدوں کا تیاگ نہ کیا جائے۔ انگریزی بھاشا کبھی سب پرانتوں کے لئے واہن (یا مادھیم) نہیں ہو سکتی یدی ہم سچ مچ ہندوستان کے ساہتیہ کی وردھی چاہتے ہیں بھن بھن بھاشاؤں میں جو رتن چھپے پڑے ہیں ان کا پرچار بھارت ورش کے کروڑوں نشیوں میں کرنا چاہتے ہیں تو ہم ہندوستانی کی معرفت ہی کر سکتے ہیں۔ اسی درشٹی سے منشی جی نے پرسدھ لیکھک پریم چندجی کی سہایتا سے ماسک "ہنس" نکالا ہے اسے سمردھ بنانے کی آوشیکتا ہے۔

میں نے تھوڑا ہی سے نکال کر اپنا ابھی پرایہ سنکشیپ میں بتایا ہے۔ سچا ابھی پرایہ تو یہاں جو ساہتیہ اچاریہ آئے ہیں۔ ان کا ہی ہو سکتا ہے۔ یدی آج کی سبھا کو ایک استھائی سنستھا میں پری نت ہوتا ہے تو ساہتیہ اچاریوں کے دوارا ہی ہو سکتی ہے۔

شاعروں اور ادیبوں سے

حضرت محمود بریلوی جو نہایت خوش فکر صاحب قلم ہیں عرصہ سے "اُردو ادب" کی ایک جامع تاریخ مرتب فرما رہے ہیں اور اس کا ایک بڑا حصہ مکمل بھی کر چکے ہیں۔ لیکن عنوانات ذیل ابھی تک زیر ترتیب ہیں:۔

(۱) زمانۂ حال کے شعراء و ادباء۔ (۲) اُردو کی سخنگو و انشا پرداز خواتین۔

اس لئے تمام شاعروں، ادیبوں اور سخنگو خواتین سے درخواست کیجاتی ہے کہ وہ اپنے تمام حالات معہ نمونۂ نظم و نثر صاحب موصوف کے پاس بھیجدیں اور ان کے حلقۂ احباب میں جو حضرات شاعر و ادیب ہیں ان کو بھی اس طرف متوجہ فرمائیں — جناب محمود بریلوی کا پتہ یہ ہے:۔

B. I. T. Block
8/14 Ibrahim Rahmatullah Road
BOMBAY 3

مکتوبات نیاز

مجھے ستا کر خوش ہونے والے!

لکھنؤ کا ایک مشہور شاعر اپنے محبوب کو دلآزاریوں سے باز رکھنے کے لئے ڈراتا ہے کہ "روز محشر قریب ہے اس لئے اگر تم نے عشاق کا خون بہایا تو بڑی مصیبت میں پڑ جاؤ گے کیونکہ اگر تمھارے خنجر نے تمھارے خلاف شہادت نہ دی تو بھی اس کا کیا علاج کہ ـــــ لہو پکاریگا آستیں کا ـــــ"

اگر میں شاعر ہوتا تو ممکن ہے تمھاری ستمرانیوں سے جی چرا کر میں بھی تمھیں خدا و رسول سے ڈرانے کی کوشش کرتا۔ حالانکہ تم ایسے دشمنِ دین و ایماں ہو کہ یوں بھی نہ ڈرتے ـــــ لیکن بدقسمتی سے "عاشقِ غیر شاعر" ہوں اور باوجود اس کے کہ ہمیشہ "ستمِ تازہ" کا شکار رہتا ہوں زبان سے یہی نکلتا ہے کہ

گرچہ میدانم نگاہت فتنۂ است اما مخواب

خیر، یہ تو میں نے اس لئے کہدیا کہ ایسی باتوں سے تم خوش ہوتے ہو، لیکن سچ بتاؤ میری تمھاری یہ لاگ ڈانٹ کب تک قایم رہیگی ـــــ میں اگر تمھاری خاطر سے لاکھ بار دن کو رات کہدیتا ہوں تو کیا حرج ہے اگر ایکبار تم میری بندگی دیرینہ کا لحاظ کر کے دن کو دن کہدو۔

میں نے تمھیں وہاں جانے سے اس لئے باز نہیں رکھا تھا کہ تمھیں تکلیف ہوگی بلکہ صرف اس لئے کہ انھیں ہوگی ـــ اب تم مجھ کو یہ خبر سناتے ہو گویا طعن کرتے ہو کہ جو کچھ میں نے کہا تھا وہ بالکل لغو ولایعنی تھا۔

پہلے تو میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ تمھاری طبیعت میں صرف ضد ہے، خو بُری نہیں لیکن اب پتہ چلا کہ تم بدخو بھی ہو اور بے حس بھی ہو۔ باوجود بیکسی و بیچارگی کے ان کی وسعتِ ظرف کا حال تو مجھے معلوم تھا، لیکن تمھارے متعلق یہ بالکل پہلی مرتبہ علم ہوا ہے کہ صرف دل ہی نہیں بلکہ آنکھیں بھی پتھرائی ہوئی رکھتے ہو۔

اب دیکھتا ہوں کہ اس احسان سے سبکدوش ہونے کے لئے تم کیا کرتے ہو ـــ کروگے کیا ـــــ جانتا ہوں کہ شکریہ کا رسمی خط بھی نہ بھیجو گے ـــ ازلی شقی ٹھہرے نا!

میرے کرمفرما،

آپ مجھے یاد فرمائیں اور میں حاضری میں پس وپیش کروں! یہ آپ نے کیا فرمایا ـ مگر اس کا کیا علاج کہ

بیدست و پا بھی ہوں اور بے زبان بھی۔ یعنی اگر حاضری سے مجبور ہوں تو میں اس کی تفصیل آپ سے کبھی بیان کرنے کا نہیں اور ظاہر ہے کہ بغیر کہے آپ کو کیا معلوم ہو سکتا ہے۔

بہرحال میں نے جو عذر پیش کیا وہ جناب کے سرِ عزیز کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ "بمی و لایعنی" نہ تھا۔ دل کے داغ کہیں چھپائے چھپ سکتے ہیں۔ آپ دور ہیں اس لئے ایسا فرماتے ہیں، یہاں آکر دیکھئے کہ اس لالہ زار کی بہار کا کیا عالم ہے۔

اگر سوال میری موت و زندگی کا ہوتا تو بھی میں اس کی پرواہ نہ کرتا، بیماری یا نقاہت کیا چیز ہے لیکن آپ ہی بتائیے کہ مقطع میں کوئی "سخت گسترانہ" بات آپڑے تو کیا کیا جائے۔ بہرحال ابھی چند دن تک تو حاضری ممکن نہیں، لیکن "تمر درعقرب" کسی نہ کسی دن آخر ختم ہی ہوگا، اس کے بعد ظاہر ہے کہ "داستانِ پر افشانی" سنانے آپ کے حضور نہ آؤں گا تو کیا دیوبند کے کسی مولوی کے پاس جاؤں گا۔ پیرِ درماندہ۔۔۔!

بندہ نواز،

نوازش نامہ ملا۔ پڑھکر بہت لطف آیا۔ کیا کہوں کہ حضرت نے کیا کیا حکمتیں ارزانی فرمائی ہیں۔ عربی کا ایک مشہور مقولہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "حکمت مومن کا کھویا ہوا مال ہے، جہاں ملے اس پر قبضہ کر لو" اس لئے اگر عمل کی توفیق نہ ہوئی تو کیا انھیں سنوں گا بھی نہیں۔ سنوں گا چاہے کلیجہ خون ہی کیوں نہ ہو جائے۔

میرے عزیز دوست، میں نے تو خیر سُن لیا جو آپ نے فرمایا، لیکن آئندہ اس کا خیال رکھئے کہ جو لوگ "مشربِ پروانہ" رکھتے ہیں ان کے سامنے "افسانۂ طور و کلیم" دُہرانا کوئی معقول بات نہیں۔ آپ کو تو بہار پیدا کرنے کے لئے کوثر و سلسبیل، طوبیٰ و فردوس، حور و قصور اور خدا جانے کس کس چیز کا اہتمام کرنا پڑتا ہے اور یہاں تمام کائنات کی رنگینی بہار حاصل کرنے کے لئے اس سے زیادہ کچھ نہیں کرتا کہ

خونے بہ جگر جمع کن و رنگ برول آ

اللہ، اللہ کیجئے، آپ بھی کس خبط میں مبتلا ہیں۔ کام کیجئے اور نتیجہ کو کارساز پر چھوڑئے۔ زندگی ہو یا موت، زمین سے ہمارا تعلق چند گز سے زیادہ کا نہیں، اس سے آگے پاؤں پھیلانا دوسرے کا "حق ہمسائگی" غصب کرنا ہے۔ "زندہ رہنا اور دوسروں کو زندہ رہنے دینا" یہ ہے اصل بنیاد عمران و تمدن کی۔ اس اصول سے ہٹ کر آپ سرمایہ دار بن سکتے ہیں، پیرِ خانقاہ ہو سکتے ہیں، دیوبند اور ندوۃ العلماء کے ناظم و مدرس ہو سکتے ہیں، لیکن انسان بننا مشکل ہے۔

آخرت اگر اس دنیا کے علاوہ کسی اور عالم سے متعلق ہے تو وہ مجہول و غیر معلوم ہے، اس کی فکر میں

دنیا خراب کرنا، عاقبت خراب کرنا ہے ۔ اگر خدا کا وجود محبت کی دنیا سے علٰحدہ ہٹ کر کہیں اور پایا جاتا ہے تو ایسا خدا آپ کو مبارک ہو۔ مجھے تو بیدین ہی مرنے دیجئے۔ "جُرمِ محبت" کی سزا میں مجھے "دوزخ" گوارا ہے لیکن وہ "جنّت" منظور نہیں جو صرف "اشدا علی الکفار" کے لئے مخصوص ہے۔ ایسے سرکہ پیشانی اور خشک عبوس چہرہ رکھنے والے مولویوں کے ساتھ اگر فردوس ملے بھی تو بقول غالب وہ دوزخ میں ڈالدینے کے قابل ہے۔

اگر آپ نے آیندہ اس سے زیادہ کچھ اور کہا، تو اس سے زیادہ کچھ اور سننے کے لئے بھی طیار رہئے — آپ کے خلوص کا قایل ہوں، آپ کی دوست نوازی کا معترف ہوں، اس لئے اب کیا ضرور ہے کہ آپ مجھے اپنی "عقل وہوش" کے متعلق بھی رائے زنی پر مجبور کریں۔

سوئٹزرلینڈ کے وفاق کی چند خصوصیات

(بہ سلسلۂ ماہ جون ۳۶ء)

نظام وفاق کے عناصر

سوئٹزرلینڈ کی وفاقی حکومت چار ذمہ دار عناصر پر مشتمل ہے:-

(۱) قومی اسمبلی جسے اہل سوئٹزرلینڈ کی اصطلاح میں "بندیز درسام ملنگ انزامبلی فیدرائے" کہتے ہیں۔ یہ ملک کی سب سے بڑی نمایندہ جماعت ہے۔

(۲) فیڈرل کونسل (بندسرات کونزلی فیدرائے) جو سات ممبران کی ایک انتظامی جماعت ہے۔

(۳) فیڈرل ٹریبونل (بندیز گریش) اور

(۴) شرکائے کانفیڈریشن جو بلاواسطہ اپنی رائے سے عمل کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اور جنھیں بندوبست حکومت پر قابو ہے۔ اور اسی بندوبست کے ذریعہ گویا تمام حکومت پر قابو ہے۔

ہم ان عناصر پر یکے بعد دیگرے روشنی ڈالیں گے۔

(۱) قومی اسمبلی:-

سوئٹزرلینڈ کے دستور اساسی کے روسے یہ کانفیڈریشن کی سب سے بڑی جماعت ہے۔ اسکے دو جزو ہیں نیشنل کونسل اور کونسل آف سٹیٹ۔ نیشنل کونسل گویا ایوان عام ہے اور کونسل آف سٹیٹ ایوان امراء ہے۔ نیشنل کونسل کے ممبران کو کینٹونوں کے عوام اپنے اپنے صوبوں میں سے انتخاب کرتے رہے ہیں مگر سنہ ۱۹۱۹ء کے بعد سے یہ انتخاب بذریعہ تناسب آبادی ہونے لگا ہے۔ ان ممبران کا انتخاب تین سال کی مدت کے لئے ہوتا ہے۔ دستور اساسی میں اس امر کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ ہر وہ کینٹون اپنا ایک نمایندہ بھیجے گا جس میں ۲۰ بیس ہزار آدمی بستے ہیں اس کے علاوہ یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ نصف کینٹونوں کا بھی ایک ایک نمایندہ قومی اسمبلی میں شامل ہوگا ہر بالغ شہری کو انتخاب میں حصہ لینے کا حق ہے۔ کل ممبران کی مدت بیک وقت ختم ہوتی ہے اور تمام ملک میں انتخابات ایک ہی دن ہوتے ہیں۔ یہ دن اکتوبر کا آخری یکشنبہ مقرر ہے۔ نیشنل اسمبلی کے ہر دو ایوان تین سال تک اپنے اجلاس کرتے ہیں۔ اسمبلی کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ اپنے وجود کو درمیان میں منسوخ کر دے۔ ایکسال میں چار مرتبہ اس کے اجلاس مقرر ہوتے ہیں۔ پہلا اجلاس مارچ میں، دوسرا جون میں، تیسرا ستمبر میں، اور

چوتھا دسمبر میں ہوتا ہے۔ ہر اجتماع کے لئے جداگانہ صدر اور نائب صدر کی قید لازمی ہے۔ ان میں سے کوئی دوسرے اجتماع میں صدر یا نائب صدر منتخب نہیں ہو سکتا۔ ممبران اسمبلی کو جمہور کے خزانے سے پچیس فرانک روزانہ علاوہ سفر خرچ ملتے ہیں۔ ایوان کا اجلاس موسم بہار میں آٹھ بجے صبح اور موسم سرما میں ۹ بجے شروع ہوتا ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ تین ہفتے میں ختم ہو جاتا ہے۔

کونسل آف سٹیٹ میں بیالیس ممبر ہوتے ہیں ہر کینٹون سے دو دو ممبر منتخب ہو کر آتے ہیں۔ ان ممبران کے طریق انتخاب ان کی قابلیت اور ان کی مدت ممبری اور تنخواہ کے سلسلے میں دستور اساسی نے کوئی مخصوص قاعدہ وضع نہیں کیا۔ بلکہ ان امور کا سر انجام ہر کینٹون پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ گو انتخاب وغیرہ کے سلسلے میں بعض طریقے بالعموم رائج ہیں اور مروج ہوتے جاتے ہیں۔ تاہم ان میں یکسانیت نہیں پائی جاتی اور نہ دستور اساسی ایسا ہونا ضروری خیال کرتا ہے۔ اکثر و بیشتر کینٹونوں میں کونسلر عام انتخاب سے لئے جاتے ہیں مگر سات کینٹون ایسے ہیں جن میں لیجسلیچر ہی ان کا انتخاب کرتی ہے۔ پانچ کینٹون اور نصف کینٹون ایک سال کے لئے ایک کونسلر منتخب کرتے ہیں۔ ان کونسلروں کی تنخواہیں وہی ہوتی ہیں جو ممبران نیشنل کونسل کی مقرر ہیں۔ یہ تنخواہیں کینٹونوں کی طرف سے دی جاتی ہیں۔

بعض ضروریات کی تکمیل کے لئے (جیسے کمانڈر انچیف کا انتخاب یا مسائل قانونی کا تصفیہ) دونوں ایوانوں کا مشترکہ اجلاس ہوتا ہے۔ اس اجلاس کی صدارت نیشنل کونسل کا صدر کرتا ہے۔ دونوں ایوانوں کے اختیارات قریب قریب یکساں ہیں۔ جہاں تک دستوری اہمیت کا تعلق ہے۔ نیشنل کونسل زیادہ وقیع سمجھی جاتی ہے اور وہ لوگ جو سیاسی ولولوں سے لبریز ہوتے ہیں۔ بالعموم نیشنل کونسل میں داخل ہو کر اپنی سیاست دانی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

ہر ایوان میں ایک بیورو ہوتا ہے۔ یہ بیورو ایک جماعت ہے جو نیشنل کونسل میں پانچ اور کونسل آف اسٹیٹ میں تین افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ پریزیڈنٹ لازمی طور پر اس جماعت میں شامل ہوتا ہے۔ بیورو کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہ شمار آراء کے وقت ایوان کی مخالف اور موافق آراء کا اندازہ کرے۔

ممبران ایوانوں میں محض جرمنی اطالوی یا فرانسیسی بول سکتے ہیں اور ہر مسودہ قانون انہی تینوں زبانوں میں مشتہر کیا جاتا ہے۔

غالباً یہ بات حیرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ سوئٹزرلینڈ کے ایوانوں میں گرما گرم بحثیں بالکل نہیں ہوتیں کارروائی زیادہ سے زیادہ تاجرانہ طریقوں سے عمل میں لائی جاتی ہے۔ طنزیات اور ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے مواقع بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ مقرروں کی تقاریر میں بہت کم مداخلت کی جاتی ہے۔ تقریریں اس طرح کیجاتی ہیں

معمولی گڑبڑ ہوتی ہے
نیشنل کونسل میں لوگ کھڑے ہوکر بولتے ہیں کونسل آف سٹیٹ میں اپنی نشستوں پر بیٹھے بیٹھے تقریر
تے ہیں۔ تقسیم آراء کے مواقع بھی بہت ہی کم آتے ہیں۔ ایوان میں نشستوں کا انتظام پارٹیوں کے لحاظ سے
ں بلکہ کینٹونوں کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ ایک پارٹی کے افراد ضروری نہیں کہ ایک ہی جگہ بیٹھیں وہ اپنے اپنے
ٹونوں کے ہمراہ بیٹھتے ہیں۔ اسی طرح وزارت یا مخالف پارٹی کے لئے بھی نشستیں مخصوص نہیں ہیں۔
ممبران کے لئے ایوانوں میں حاضری لازمی سمجھی جاتی ہے۔ اگر کوئی ممبر بغیر معقول وجہ بتائے غیر حاضر ہو جائے
وہ بے پرواہ خیال کیا جاتا ہے تا وقتیکہ وہ غیر حاضری کے جواز میں کوئی معقول وجہ پیش نہ کرے۔ اسے اس دن یا
دنوں کی تنخواہ بھی نہیں ملتی۔
سوئٹزرلینڈ کے ایوانہائے حکومت پارٹیوں کے وجود سے خالی نہیں ہیں۔ مگر یہ پارٹیاں انگلینڈ یا فرانس کی
ٹیوں جیسی قوت نہیں رکھتیں کیونکہ ایک طرف تو انتظامی شعبوں میں ایوان، وزراء کو معزول کرنے کے مجاز نہیں
۔ دوسری طرف ان کا کوئی فیصلہ اس وقت تک قانون نہیں بن سکتا جب تک کہ عوام اس پر مہر تصدیق ثبت نہ کر دیں۔
موٹے موٹے اصولوں پر اتفاق رائے کر لینے سے پارٹی وجود میں آجاتی ہے۔ ان معاملات میں جو ان اصولوں
باہر ہوتے ہیں پارٹی کے ہر فرد کو آزادانہ طور پر رائے دینے کا حق ہوتا ہے۔ جب عہدہ داروں وغیرہ کے انتخاب
سوال آتا ہے۔ پارٹی کے افراد سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ کس کس کو منتخب کرنا چاہئے۔
حکومت کا طریق یہ ہے کہ یا تو ایوانوں کے سامنے وہ قانون پیش ہوتے ہیں جن کی ضرورت ایگزیکٹو کے افسر
موس کرتے ہیں یا رائے عامہ کی درخواست پر قوانین وضع کئے جاتے ہیں۔ اول الذکر صورت میں فیڈرل کونسل
نون وضع کرتی ہے۔ اور اس کے ایک یا دو ممبر مسودہ پیش ہوتے وقت ایوان میں موجود ہوتے ہیں۔ تاکہ ہر پیچیدہ
کی تشریح کر سکیں۔ موخر الذکر صورت میں کسی ممبر کی طرف سے ایک تجویز پیش ہو کر پاس ہوتی ہے۔ جس میں فیڈرل
نسل سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ رائے عامہ کو تسلیم کرتے ہوئے۔ فلاں فلاں قسم کا قانون وضع کرنے کی طرف
م اٹھائے۔ مالی مسودات بھی فیڈرل کونسل ہی کے اختیار میں رکھے جاتے ہیں۔

۲) فیڈرل کونسل :-

اب ہم نظام وفاق کے دوسرے عنصر یعنی فیڈرل کونسل کو لیتے ہیں سوئٹزرلینڈ کے وفاقی نظام حکومت کا یہ
ہر گہرے مطالعہ کا مستحق ہے۔ بالعموم ایگزیکٹو ایک فرد واحد کی بجائے ایک جماعت کو سپرد نہیں ہوتا۔ اور ایگزیکٹو
م طور پر پارٹی پالیٹکس سے اتنا بے تعلق بھی نہیں ہوتا جتنا سوئٹزرلینڈ میں ہے۔ فیڈرل کونسل کیبنٹ نہیں
تی (جیسا کہ برطانیہ یا ان ممالک میں دستور ہے جو برطانیہ کی آئینی نقل کرتے ہیں) کیونکہ اسے اسمبلی کی رہبری۔

کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور نہ یہ لیجسلیچر کے اثرات سے آزاد ہے (جیسا کہ امریکہ میں یا امریکہ کے دستور کی پیروی کرنے والے ممالک میں ہے) آئینی اعتبار سے اس کا پارٹی پالیٹکس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

یہ جماعت سات افراد پر مشتمل ہوتی ہے جنھیں اسمبلی تین سال کے لئے منتخب کرتی ہے۔ ان ممبروں میں سے ایک کو اسمبلی ایگزیکٹو کا صدر اور کسی دوسرے کو اس کا نائب صدر بنا دیتی ہے۔ سال آئندہ میں ان دونوں میں سے کوئی اس عہدے پر فائز نہیں ہو سکتا۔ یہ دستور قدیم سے چلا آتا ہے کہ ایک کینٹون میں سے ایک ہی ممبر چنا جا سکتا ہے۔ ایگزیکٹو کونسل کے ممبران اس دوران میں جبکہ وہ ایگزیکٹو میں کام کر رہے ہوں دونوں ایوانوں میں سے کسی ایک ایوان کی کارروائی میں عملی حصہ نہیں لے سکتے اور نہ کوئی عہدہ قبول کر سکتے ہیں۔

ہر ممبر کو ایک ایک انتظامی شعبہ سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ اسکے بندوبست کا پورے طور پر ذمہ دار ہوتا ہے مگر سال میں ایک مرتبہ فیڈرل کونسل کا اجلاس بطور کیبنٹ ہوتا ہے اور ضروری اُمور پر گفتگو کی جاتی ہے۔ کونسل کے تمام فیصلے متفقہ ہوتے ہیں۔ اور وہ طول طویل رپورٹ بھی جو اس کی طرف سے ہر سال اسمبلی کو پیش کی جاتی ہے۔ اتفاق رائے سے مرتب ہوتی ہے۔

کونسل کے ممبران ایوانوں میں آتے ہیں۔ مگر وہ عملاً ایوانوں کی کارروائی میں حصہ نہیں لے سکتے جب کوئی ایسا معاملہ ایوان میں پیش ہوتا ہے جو ایگزیکٹو کونسل کے کسی شعبہ سے متعلق ہوتا ہے تو فیڈرل کونسل کا وہ ممبر جو اس شعبہ کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ صورت حال کی وضاحت کے لئے ایوان میں طلب کر لیا جاتا ہے۔

فیڈرل کونسل کا صدر باقی ممبران پر کوئی آئینی تفوق نہیں رکھتا۔ وہ صرف صدر ہوتا ہے۔ مگر اسے کانفیڈریشن کا صدر سمجھا جاتا ہے اور وہ قوم میں بزرگترین شخصیت شمار ہوتا ہے۔ تمام تقاریب پر اسے صدارت کا اعزاز ملتا ہے اس کی تنخواہ چھبیس ہزار فرانک سالانہ ہوتی ہے۔ باقی ممبران میں سے ہر ایک کو اٹھارہ ہزار فرانک سالانہ ملتے ہیں۔

عام انتظامی معاملات کی نگرانی کرنے کے علاوہ فیڈرل کونسل معاملات خارجہ، فوج اور سول سروس کے بندوبست کی بھی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس کے ذمہ ایک اور اہم فریضہ (جس پر پہلے بھی روشنی ڈالی جا چکی ہے) یہ ہے کہ وہ قوانین کے مسودات تیار کر کے ایوان کے سامنے پیش کرے۔ جب کسی مخصوص غرض کی تکمیل کے لئے کوئی آئینی قدم اُٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے تو کونسل قانون کا مسودہ تیار کرتی ہے۔ اور بالعموم یہ دونوں ایوانوں کو صلاح اور مشورہ بھی دیتی ہے۔ عام پالیسی کی باگ ڈور اسمبلی کے ہاتھوں میں رہتی ہے۔ گو کونسل اپنے علم اور تجربے سے اس کے فیصلوں پر گہرے اثرات ڈالتی ہے۔ بالعموم انتظامی اُمور کونسل کے سپرد ہوتے ہیں۔ جیسے قومی مالیات کا جمع خرچ اور چند دیگر اہم شعبہ جات جیسے ریلوے وغیرہ۔ اسمبلی ان تمام اُمور کی انجام دہی پر

کونسل کی استمداد کرتی ہے نہ صرف فوج کونسل کے حکم پر ہوتی ہے بلکہ قومی خزانے سے جو رقم کینٹونوں کو ملتی ہے اس کے روکنے کا اختیار بھی کونسل کو ہوتا ہے۔ اور وہ امداد بند کر کے کسی باغی کینٹون کو اطاعت پر مجبور کر سکتی ہے۔

فیڈرل کونسل کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ گو وہ ہم آہنگ ہو کر کام کرتی ہے مگر اس میں اختلاف رائے بھی پیدا ہوتا ہے۔ اور اسے برداشت بھی کیا جاتا ہے۔ ممبران کونسل لیجسلیچر میں وقت ضرورت اپنی ایسی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ جو اکثر کونسل کی مجموعی رائے سے مختلف ہوتی ہے۔ مگر اس اختلاف رائے سے کوئی فتنہ پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ امور متنازعہ فیہ کے بارے میں یا تو اس کونسلر کی رائے سے مطابقت کر لی جاتی ہے جو اس معاملہ سے قریبی تعلق رکھتا ہو۔ یا پھر اسمبلی کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کر دیا جاتا ہے۔

قانونی اعتبار سے کونسل اسمبلی کی ملازم ہوتی ہے لیکن عملاً یہ اسمبلی پر بڑا اثر رکھتی ہے۔ اور ایک اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ایک طرف یہ اسمبلی کی پیروی کرتی ہے تو دوسری طرف اس کی رہنما بھی ہے۔ بایں ہمہ کبھی کبھی اسمبلی اس کے فیصلوں کو رد بھی کر دیتی ہے مگر اس سے کونسل کی پوزیشن پر بھی عملاً کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ برابر اپنا آئینی کام کئے چلی جاتی ہے۔

دستوری اعتبار سے کونسل کے وجود کے دو بڑے فائدے ہیں:۔

(۱) یہ ایک ایسی جماعت ہے جو نہ صرف حکمران جماعت یعنی اسمبلی کو صالح مشورہ دیتی ہے بلکہ تجربہ کار اور غیر جانبدار ہونے کی وجہ سے بشرط ضرورت دو مختلف الخیال جماعتوں کے درمیان حَکَم کا کام بھی انجام دیتی ہے۔

(۲) اس کے ذریعہ انتظامی درجہ رکھنے والے دماغ قوم کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔ خواہ وہ اسمبلی سے کتنا ہی اختلاف رائے کیوں نہ رکھتے ہوں۔ کیونکہ کونسل اسمبلی سے جزواً جزواً موافقت رکھتے ہوئے بھی انتظامی امور کو انجام دے سکتی ہے۔

آیندہ صحبت میں ہم نظام وفاق کے دیگر عناصر پر روشنی ڈالیں گے۔

ڈاکٹر سید جعفری بار ایٹ لا

ضرورت ہے

مسئلہ خلافت و امامت

اور

محترم مدیر "نگار" کا محاکمہ

(ہر نام کے قلم سے)

مارچ ہی مارچ سال بھر اور اب جولائی تک چار مہینے اتنا عرصہ ہوا جب اس مسئلہ پر میرا سب سے پہلا مضمون شائع ہوا تھا۔

جو اصحاب یہ خیال رکھتے ہوں کہ میں نے نگار میں مضمون اس توقع پر لکھا تھا کہ مدیر نگار میری رائے سے حرف بحرف موافقت ہی کریں گے وہ بالکل غلطی پر ہیں۔

میں کس طرح یقین دلاؤں کہ مجھے شیعہ و سنی کسی جماعت کے ساتھ کوئی جانبدارانہ تعلق نہیں ہے۔ اگر کسی جماعت کو میری آزادانہ تحقیق شیعی مذہب کے موافق نظر آتی ہو تو اس سے یہ سمجھ لینا کبھی صحیح نہیں تھا کہ میں شیعہ ہی ہوں۔

مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں میں "سطحیت" بہت زیادہ پیدا ہوگئی ہے اور اُن کی نگاہیں کسی مطلب کی گہرائی میں جانے سے انکار کرنے لگی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ سنیوں میں میرے مضمون پر شور برپا ہوا اور اخبارات کی دنیا میں غلغلہ ہوگیا لیکن مدیر نگار کے محاکمہ پر "اطمینانی سکون" چھا گیا۔ گویا وہ سمجھے کہ ڈگری بالکل ہمارے موافق ملی۔

اس کے برخلاف شیعی جماعت اس وقت تک صبر و سکون کے ساتھ نتیجہ کا انتظار کرتی رہی جب تک کہ مسئلہ زیر بحث تھا لیکن ادھر مدیر نگار کا محاکمہ شائع ہوا اور شیعی جماعت میں اضطراب پیدا ہوگیا۔ گویا تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ کوئی مجھ غریب کو کوسنے دے رہا ہے کہ اس نے نگار میں اس بحث کو شایع ہی کیوں کیا۔ کوئی نگار کے محاکمہ کا سختی سے سخت اور مناظرانہ جواب دینے کو آمادہ ہے۔

مگر مجھے اس سب پر مسرت ہے کہ میں نے تحقیقاتی بحث کا ایک دروازہ کھول کر علمی دنیا میں چہل پہل پیدا کردی اور موجودہ صورت حال پر ہنسی آتی ہے کہ نتیجہ اُلٹا کیونکر ہوگیا۔

میرے خیال میں مدیر نگار نے جہاں تک میرے اد یہ بحث کا تعلق ہے فیصلہ بالکل میرے موافق کیا ہے اور اگر میرے مضمون سے شیعی اصحاب متفق تھے تو انھیں فیصلہ کے اس جزو سے بالکل مطمئن ہونا چاہئے تھا اور جہاں سے مدیر نگار کا فیصلہ مخالف نظر آتا ہے وہ ایسا جزو ہے کہ اس پر سنیوں کو بھی اسی حد تک برافروختہ ہونا چاہئے تھا جس حد تک شیعوں کو۔

میرے مضمون کی حیثیت وہ ہرگز نہیں ہوسکتی تھی جو کسی شیعہ عالم کے قلم سے نکلے ہوئے مضمون کی جس میں مسئلہ امامت پر خالص اعتقادی حیثیت سے روشنی ڈالی گئی ہو۔ اسی لئے میرے مضمون میں کلامی دلائل اور عقلی براہین کا پتہ بھی نہیں ہے۔ میں نے توصرف تاریخی حیثیت سے واقعات کی بنا پر یہ دکھلایا تھا کہ حضرت پیغمبر کا منشار یہی تھا کہ حضرت علی اُن کے خلیفہ اور جانشین ہوں۔

اس صورت میں میرے خلاف فیصلہ ہونے کی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ اُن واقعات کو صحیح تسلیم کیا جاتا جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اُن واقعات کا نتیجہ وہ تسلیم نہ کیا جاتا جو میں نے قرار دیا ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ مدیر نگار کا فیصلہ ان دونوں جزوں میں میرے بالکل موافق ہے۔

اُنھوں نے میرے پیش کردہ تمام روایات تاریخی کو تسلیم کیا ہے۔ صرف ایک روایت واقعۂ قرطاس کے متعلق شبہ کیا ہے کہ اس کا تعلق اول تو روایت جناب امیر سے ہے بھی نہیں (کیونکہ اب یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ رسول اللہ کاغذ و قلم منگوا کر کیا لکھوانا چاہتے تھے) اور دوسرے یہ کہ یہ حدیث اہل سنن کے نزدیک قابل لحاظ بھی نہیں ہے، کیونکہ اس کے خاص راویوں میں ایک یحییٰ بن سلیمان ہیں جو غیر ثقہ قرار دئے گئے ہیں، دوسرے راوی قبیصہ ہیں جو بہت غلط گو سمجھے جاتے ہیں، تیسرے یونس بن زید ہیں جن کا حافظہ بھی ضعیف تھا اور جو غلط گو بھی تھے، چوتھے راوی علی بن عبداللہ ہیں جن کا شمار ضعفا میں ہے۔ رہ گئے ایک اور راوی حضرت ابن عباس سو ان کا اسوقت وہاں موجود ہونا ثابت نہیں"

مجھے بہرحال مدیر نگار کی آزاد رائے کا احترام ہے لیکن اتنا کہنا ضروری ہے کہ اُنھوں نے جو کچھ اس روایت میں شکوک ظاہر کئے ہیں وہ عام اہلسنت کی جانب سے پیش نہیں ہوسکتے اس لئے کہ اُن کے قواعد کی بنا پر روایت کا صحیح بخاری کے اندر متعدد طریق سے ہونا ہی اُس کی صحت و وثاقت کے لئے کافی ہے جس کے بعد راویوں کی جانچ پرتال کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ پھر اگر ہر ایک سند میں کوئی ایک راوی مجروح مان لیا جائے تو آخر متن چار الگ الگ راویوں کے طریق سے روایت کا وارد ہونا بھی تو ایک قابل لحاظ چیز ہے اور پھر جبکہ اس روایت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کو غلط طور سے بیان کرنے کی کوئی مخصوص غرض ہوسکے۔ جبکہ اُس کے راویوں میں کوئی ضعیف ہو۔ غیر ثقہ ہو۔ غلط گو ہو مگر "رافضی" کوئی ایک بھی نہیں ہے تاکہ یہ سمجھا جاسکے کہ صرف حضرت عمر پر رسول کی بارگاہ

یں بے ادبی کا الزام لگانے کے لئے یہ روایت ایجاد کی گئی ہے۔ رہ گیا یہ امر کہ رسول آخر لکھنا کیا چاہتے تھے؟ اسکو صراحت کے ساتھ تو میں بیشک نہیں دکھلا سکتا جبکہ وہ لکھا ہی نہیں گیا۔ لیکن میں نے جس ترتیب کے ساتھ اس واقعہ کو اپنے مضمون میں درج کیا ہے اس سے حقیقت کا انکشاف ضرور ہوتا ہے۔ پھر جبکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ پیغمبر اپنی تقریر میں "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" کہکر یہ فقرہ کہہ چکے تھے کہ: "انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی اہل بیتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی" اور اس کے بعد دوات قلم مانگتے وقت آپ فرماتے ہیں:۔ "اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعدہ" اس سے ضرور پتہ چلتا ہے کہ تحریر بھی اسی کے متعلق ہونے والی تھی جس کے متعلق تقریر تھی۔ نیز حضرت عمر کا انکار کہ "ہمارے لئے کتاب خدا کافی ہے اور کوئی ضرورت نہیں" جبکہ مدیر نگار اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ رسول کا منشا یہی تھا کہ حضرت علی خلیفہ ہوں اور نیز یہ کہ دوسرے صحابہ کو یہ منظور نہیں تھا اور یہ بھی کہ دوسرے صحابہ حضرت علی سے رشک رکھتے تھے۔

بہرحال اس روایت سے قطع نظر کرتے ہوئے دوسری تمام روایات کو مدیر نگار نے تسلیم کیا ہے اور آخر میں یہ فیصلہ بھی کر دیا ہے کہ:۔

> "جس حد تک روایات کا تعلق ہے میرے نزدیک حضرات شیعہ اس اعتقاد میں بالکل حق بجانب ہیں کہ رسول اللہ کی دلی خواہش یہی تھی کہ حضرت علی آپ کے بعد جانشین قرار دئے جائیں"

بس۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جہاں تک میرے مضمون کا تعلق تھا بحث یہاں پر ختم ہو گئی۔ حضرت رسول کی دلی خواہش یہی تھی اور حضرت نے صحابہ کے لئے اس خواہش کو پورے طور پر ظاہر بھی کیا، یقیناً اور اگر ظاہر نہیں کیا تو ہم کو اور محترم مدیر نگار کو اس کی خبر کیونکر ہوئی؟

اب یہ کہ آپ کی خواہش صحیح تھی یا غلط اور یہ کہ آپ کی خواہش کا پورا ہونا ممکن تھا یا نہیں؟ یہ تنقیحیں ہیں جو اب قائم کی گئی ہیں اور نیز یہ کہ اگر یہ خواہش پوری نہیں ہوئی تو کیا یہ کوئی مسئلہ ایسا اہم تھا جو فرق مذاہب کا باعث ہو سکے؟۔

یہ چیزیں میری بحث سے خارج ہیں اور یقیناً اب یہ اعتقادی چیزیں ہیں جن پر ایک غیر مسلم شخص کو بحث کرنے کا حق بھی نہیں ہے۔

میں جہاں تک سمجھتا ہوں مسلمانوں کا عقیدہ رسول کی نسبت یہ رہا ہے کہ آپ کا کوئی حکم اور کوئی امر حکم خدا کے خلاف نہیں ہوتا تھا اور یہ کہ آپ کی ہستی غلطی سے بالکل بلند ہے۔

اب اگر مدیر نگار" اس مسئلہ میں اختلاف رکھتے ہیں تو یہ ویسے بہت سے مسائل میں داخل ہے جو عام مسلمانوں میں متفقہ حیثیت رکھتے ہیں لیکن مدیر نگار کو اپنی "حریت رائے" کی بنا پر ان سے اختلاف ہے جیسے

بہشت و دوزخ - ملائکہ - معجزات انبیاء وغیرہ وغیرہ -

غالباً شیعی اصحاب کا بھی یہ خیال ہے کہ مسئلۂ امامت اور نبوت کا چولی دامن کا ساتھ ہے یعنے اگر نبوت میں وہی معیاری حیثیت مسلم رہی جس پر شیعوں کا عقیدہ ہے اور جو ایک حد تک دوسرے مسلمانوں میں بھی متفقہ ہے تو امامت کے مسئلہ کا شیعوں کے حسب دلخواہ طے ہونا ضروری ہے - بے شک اگر اصطلاحی نبوت ہی کے معنی میں تبدیلی ہو جائے اور عقیدۂ رسالت ہی اُس شان پر باقی نہ رہے تو امامت بھی ختم ہے - اور شاید شیعوں کی جانب سے امامت کو "اصول دین" میں داخل کرنے کا بھی یہی منشا ہے یعنے وہ اس کو نبوت کا ایک جزو لاینفک سمجھتے ہیں اور "ایمان بالنبی" کے تحت میں اُس کو ضروری خیال کرتے ہیں -

---

یہ امر کہ مسئلۂ امامت کا تعلق مذہب سے ہونا چاہیئے یا نہیں؟ میرے طے کرنے کا نہیں ہے لیکن جہانتک میری سمجھ میں آتا ہے جبکہ محترم مدیر نگار حضرت پیغمبر کی دو حیثیتیں تسلیم کرتے ہیں ایک معلم مذہب ہونے کی اور دوسرے حاکم و منتظم ہونے کی تو اس مسئلہ کا تعلق مذہب کے ساتھ اُسی وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک جانشینی کو صرف دوسرے جزو کے ساتھ مخصوص قرار دیا جائے جس کے بعد خلیفہ کی حیثیت سوائے بادشاہ کے کچھ نہیں ہو سکتی اور اس کے بعد ظاہر ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہر فرماں روا جس سے انتظام ملک ہو جائے وہ خلیفۂ رسول سمجھا جانا چاہیئے یہاں تک کہ اعلیٰحضرت ملک معظم تاجدار برطانیہ اسوقت سب سے بڑے "خلیفۃ المسلمین" ہیں اسواسطے کہ عالم اسلامی کا زیادہ حصہ اُن کے زیر سلطنت و حمایت ہے اور امن و امان سے زندگی بسر کر رہا ہے لیکن اگر خلافت کا تعلق پہلے جزو سے بھی ہے جیسا کہ اب تک مسلمانوں کا خیال رہا ہے چنانچہ "خلافت" کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ: - "النیابۃ عن النبیؐ فی امور الدین والدنیا" تو اب مذہب کے ساتھ اس کا کھلا کھلا تعلق ہو جاتا ہے -

اگر اس میں یہ مذہبی پیشوائی کی حیثیت قائم نہ رکھی جائے اور حضرات خلفاء کی حیثیت وہی رہ جائے جو اسوقت بادشاہ عراق یا ایران یا حجاز وغیرہ کی ہے تو پھر میں سمجھتا ہوں کہ شیعہ اور سنی کا اختلاف باقی نہیں رہ سکتا - لیکن مشکل یہ ہے کہ حضرات اہلسنت اس کو گوارا نہیں کریں گے - وہ حضرات خلفاء کو مذہبی پیشوا بھی تسلیم کرانا چاہتے ہیں اور یہیں سے شیعہ سنی اختلاف کی بنیاد قائم ہوتی ہے -

یہ استدلال کہ " رسول اللہ کو وحی کے ذریعہ سے کوئی ہدایت اس باب میں نہیں کی گئی اور اگر اس کو واقعی کوئی مذہبی اہمیت حاصل ہوتی تو یقیناً وحی کے ذریعہ سے اس کا فیصلہ کیا جاتا" ممکن ہے کہ درست ہو مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے شیعہ اصحاب وحی کی ہدایت کو اس باب میں قرآن مجید سے بہت شد و مد کے

ساتھ ثابت کرتے ہیں اور علمائے اہلسنت ہی کے روایات سے اس کی تفسیر بھی پیش کرتے ہیں۔
کاش اس مسئلہ پر اب کسی شیعہ عالم کی طرف سے بھی اظہار خیال کیا جائے جسے میرے خیال میں مدیر نگار بخوشی شائع کریں گے تاکہ بحث کے تمام پہلو سامنے آجائیں۔

مجھے بیشک صرف اپنی اتنی ہی ریسرچ کی بنا پر جسے میں نے اپنے گزشتہ مضمون میں پیش کر دیا ہے اور جس پر مجھے خوشی ہے کہ محترم مدیر نگار نے مہر تصدیق بھی ثبت کر دی ہے تھوڑا سا اختلاف محترم مدیر کے اس فیصلہ سے ہے کہ رسول اللہ چاہتے ضرور تھے کہ جناب امیر خلیفہ قرار پائیں مگر آپ نے اس کا اعلان نہیں کیا۔ اور اس کی ذمہ داری خود اپنے اوپر نہیں لی۔
جبکہ ہمارے سامنے ہے یہ واقعہ کہ بعیت عشیرہ میں رسول نے اعلان کیا :- " فایکم یوازرنی علی ہذا الامر علی ان یکون اخی و وصیتی و خلیفتی فیکم " " کون تم میں سے میرا ساتھ دیتا ہے اس شرط پر کہ وہی میرا بھائی میرا ولی عہد اور میرا جانشین قرار پائے " علی اُٹھے اور کہا کہ میں آمادہ ہوں۔ حضرت نے یہ سنکر فرمایا کہ یہ " دیکھو یہ ہے میرا بھائی۔ میرا وصی اور جانشین "۔
اب بتلائیے کہ اگر روح جمہوریت اسی کی مقتضی تھی کہ رسول اس معاملہ کو اپنے ذمہ نہ رکھیں اور عام مسلمانوں پر چھوڑ دیں تو آپ کو خواہ مخواہ یہ سبز باغ دکھا کر اپنی نصرت کا وعدہ لینے کی کیا ضرورت تھی اور یہ معاہدہ کرنے کا حق کونسا تھا؟
اب سوائے اس کے کہ " بزمی صاحب " کی طرح اس کو صرف " حوصلہ افزائی " پر مبنی قرار دیا جائے اور کیا چارہ کار ہے ؟ مگر اس معاملہ میں مدیر نگار فرما چکے ہیں کہ " یہ ایک ایسا دعوے ہے جس پر نہ کوئی ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے اور نہ جسے رسول اللہ سے منسوب کرنا اچھا معلوم ہوتا ہے "۔
یہ ابتدائے رسالت کا قصہ تھا اور انتہائے رسالت میں خطبہ حجۃ الوداع جس میں (محترم مدیر نگار کے الفاظ میں) " رسول اللہ نے اپنے وصال کی خبر دیتے ہوئے کہا کہ " من کنت مولاہ فعلی مولاہ "۔ میں جس کا مولیٰ ہوں علی بھی اس کا مولیٰ ہے " اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میں اپنے بعد دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک کتاب اللہ اور دوسرے میری عترت، میرے اہلبیت اور انھیں دونوں کی پیروی کرنا چاہئے "۔
اب آپ ملاحظہ کیجئے کہ یہ اعلان نہیں تو اور کیا ہے ۔ یہ آخری تقریر ہے جو رسول اللہ نے اتنے بڑے مجمع میں کی۔ اس کے بعد آپ دو مہینہ سے زیادہ زندہ نہیں رہے ۔ اس کے بعد یہ کہنا کہاں تک حق بجانب ہے کہ " رسول اللہ نے جب آپ کے وصال کا وقت قریب آیا تو اس باب میں خاموشی اختیار کر لی "۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد اور زیادہ قریب زمانہ میں بھی رسول نے سکوت نہیں کیا۔ اس وقت جب آپ

ں الموت میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ جبکہ آپ کے وصال میں صرف چند روز باقی تھے اُس موقع پر بھی آپ نے
یر کی اور فرمایا :۔ " اے لوگو بہت قریب ہے وہ وقت کہ میں دُنیا سے اُٹھ جاؤں اور تم سے رخصت ہوں
نے اس سے قبل تم سے سب کچھ کہدیا ہے اور حجت تمام کر دی ہے۔ پس تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں تمہارے
یان خدا کی کتاب اور اپنی عترت اہلبیت کو چھوڑے جاتا ہوں " یہ کہکر حضرت نے جناب امیر کا ہاتھ پکڑا اور اسے
ہر کے فرمایا :۔ " علی قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علی کے ساتھ، یہ دونوں جدا نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ میرے
ں حوض کوثر پر پہونچیں۔ میں ان سے دریافت کروں گا کہ تم نے ان سے میرے بعد کیا سلوک کیا (صواعق محرقہ
ہوعہ مصر صفحہ ۷۵)

دیکھے جائیں یہ الفاظ کہ :۔ " قد قدمت الیکم القول معذرت الیکم "۔ " میں تم سے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا
ں اور حجت تمام کر دی ہے "۔

اس کے بعد پھر بھی کہا جاتا ہے کہ رسول نے اعلان کیوں نہ کر دیا ؟ بیشک اس کے بعد صرف ایک ہی چیز
تھی اور وہ تحریر۔ اُس کا رسول نے بندوبست کرنا چاہا جس کا صحیح بخاری میں واقعۂ قرطاس کی صورت میں
رہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ کیا معلوم حضرت کیا لکھنے والے تھے ؟ بے شک کیا معلوم ! لیکن اگر لکھنے دیا گیا ہوتا آپ کو جو
لکھنا چاہتے تھے تو کیوں کسی کو یہ کہنے کا موقع ملتا کہ آپ خلافت ہی کے لئے لکھنا چاہتے تھے۔

حضرت رسول اکرم کے بار بار وہ الفاظ کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں جن سے تمسک کی صورت میں تم
ہ نہ ہوگے۔ اور پھر آپ کا یہ کہنا کہ " ایسا نوشتہ لکھدوں جس پر عمل کرنے سے تم گمراہ نہو " اور پھر حضرت عمر کا یہ فقرہ
" ہم کو بس کتاب خدا کافی ہے۔ اور کسی بات کی ضرورت نہیں "۔ کیا اس کے یہی معنی پیدا نہیں ہوتے کہ حضرت عمر
پنی فراست کی بنا پر یہ یقین ہوگیا تھا کہ آپ وہی لکھنے والے ہیں جو آپ بہت دفعہ کہہ چکے ہیں جس میں آپ نے
ب خدا کے ساتھ اپنی عترت اور اہلبیت کو ضم کیا ہے اور ان دونوں کی پیروی کو ذریعۂ نجات قرار دیا ہے اور
ں کی بنا پر آپ نے یہ کہا کہ ہمارے لئے تو بس کتاب خدا کافی ہے۔ یعنے کسی دوسرے جز کی ہم کو ضرورت نہیں ہے۔

یقیناً ایک غیر متعلق اور بے غرض انسان مذکورہ صورت حال اور حضرت عمر کے اس فقرہ پر غور کرنے سے
لاسوائے اس نتیجہ کے کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا۔

بے شک واقعۂ قرطاس کے بعد فوراً رسول اللہ کا وصال نہیں ہوا بلکہ ہوش و حواس کے عالم میں اتنا وقت
لا آپ اس کی تکمیل کر سکتے تھے لیکن حضرت عمر نے جن مدبرانہ الفاظ کے ساتھ اختلاف فرمایا تھا (جن کا صحیح بخاری
ں تذکرہ موجود ہے) ان کے بعد کوئی محل آپ کو اپنی خواہش کے پورا کرنے کا باقی نہ رہا تھا

وہ یہ کہ آپ نے فرمایا تھا کہ " رسول پر مرض کا غلبہ ہے جس سے آپ کے ہوش و حواس جا چکے ہیں " بعض روایات میں یہ فقرہ ہے کہ " انّ الرّجل لیھجر " " آپ ہزیان بک رہے ہیں "۔ آپ کے اس فقرہ کا حاضرین پر بھی یہ اثر پڑ گیا تھا کہ بعض لوگ کہتے تھے کہ رسول جو کہتے ہیں ٹھیک ہے۔ قلم دوات حاضر کر دو اور بعض لوگ کہتے تھے کہ نہیں بات وہی ہے جو حضرت عمر نے ارشاد کی یعنے واقعی رسول کے ہوش و حواس درست نہیں رہے۔ اب آپ فرمائیے کہ اس کے بعد رسول کو کب موقع تھا کہ کچھ تحریر کراتے اور اگر کچھ لکھواتے بھی تو وہ مستند کب سمجھا جاتا جب کہ بخیال حضرات " بحالت صحت نفس و ثبات عقل " کی شرط ہی مفقود تھی۔

میں اپنے مسلمان اصحاب اور خصوصیت کے ساتھ سنی احباب سے معذرت چاہتا ہوں۔ میں تو تاریخی واقعات سے دیکھ رہا ہوں کہ غدیر خم کے واقعہ کے بعد ایک مکمل سازش ہو گئی تھی کہ رسول کا مقصد کامیاب نہ ہونے دیا جائے اور اس سازش کے ارکان اتنے اندرونی تھے کہ رسول اپنے بستر بیماری پر بھی ان کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ اور خود حضرت کو بھی اس سازش کا پورا اندازہ ہو گیا تھا۔ اسی سازش کے توڑنے کے لئے آپ نے لشکر اسامہ کے بھیجنے کا بندوبست کیا تھا اور نام بنام تمام مفر عناصر سے چاہا تھا کہ فضا کو صاف کر دیں اور اس کے لئے اتنے تاکیدی احکام نافذ کئے تھے کہ " خدا کی لعنت ہے اس پر جو لشکر اسامہ میں نہ جائے " مگر آپ کی عدول حکمی کی گئی جس کے بعد آپ کا کوئی اختیار نہیں تھا۔

محترم مدیر نگار نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ بیشتر صحابہ کو حضرت علی سے رشک و رقابت اور عداوت تھی اور مختلف وجوہ کی بنا پر آپ کے خلاف متفق تھے۔

اس صورت حال میں وہ فرماتے ہیں کہ علی کا خلیفہ قرار پانا غیر ممکن تھا۔ بے شک غیر ممکن تھا، لیکن اس سے تمام اصحاب الزام سے بری تو نہیں ہو جاتے۔

فرض کیا جائے کہ ایک بادشاہ، رئیس، امیر کبیر کے تمام ملازمین اُسکے فرزند کے قتل کرنے پر متفق ہو جائیں یقیناً اُس کا قتل ہو جانا اس صورت میں ناگزیر ہے لیکن کیا اس بنا پر قاتل بالکل بری قرار پا جائیں گے۔

اس صورت میں کیا جماعت مسلمین، عقیدت مندان رسول کو آزادانہ طور پر واقعات کی جانچ کرنے کے بعد اس کا اقرار نہیں کرنا چاہئے تھا کہ جو کچھ ہوا وہ رسول کی مرضی کے خلاف ایک منظم بندوبست کا نتیجہ تھا جو قابل افسوس ہے۔ نہ یہ کہ اس کے برخلاف " الصحابۃ کلھم عدول "۔ " صحابہ سب کے سب عادل ہیں " کے کلئے بنائے جائیں اور غزوہ بدر، بیعت شجرہ وغیرہ کے پیغاموں کو بلا استثنا سب کے رستگار، نیکوکار ہونے کی قطعی سند قرار دے لیا جائے اور " اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم " کی سی روایتوں کو رسول کی زبانی بیان کر کے ہر ایک کی پیروی کو ذریعہ نجات سمجھ لیا جائے۔

محترم مدیر نگار کو یہ تسلیم ہے کہ "خلفائے ثلثہ کی خلافت کا مسئلہ رائے عامہ حاصل کرنے کے بعد طے نہیں کیا گیا، لیکن جن ذاتی اثرات کے ماتحت یہ حضرات خلیفہ تسلیم کئے گئے وہ غالباً ایسے تھے کہ اگر رائے عامہ حاصل کی جاتی تو بھی شاید نتیجہ یہی نکلتا"۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ "ذاتی اثرات" رسول کے منشا کی موافقت میں کام نہیں آسکتے تھے اور جب ایسا نہیں ہوا تو مخالفت رسول کی ذمہ داری کیا اب انہی "ذاتی اثرات" والی ہستیوں پر عاید نہیں رہ جاتی؟ اور کیا اس صورت میں ان لوگوں سے اظہار اختلاف صرف رسول کے ساتھ بجا (یا بیجا) عقیدت کا نتیجہ قرار نہیں پاتا لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ معاملہ بالکل برعکس ہو گیا یعنے حضرات اہلسنت محبت رسول اللہ کے تنہا دعویدار بن گئے اور شیعہ جماعت کے متعلق یہ خیال قرار دیدیا گیا کہ ان کو رسول سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے"

پھر چونکہ پیغمبر نے اپنے انہی اظہارات میں (جنھیں محترم مدیر نگار بھی اعلان نہیں لیکن اظہار رائے کی حد تک صحیح سمجھتے ہیں اور یہ کہ ان کا منشا یہ تھا کہ اگر انتخاب کی نوبت آئے تو رسول کا ورثہ علی کے حق میں سمجھا جائے)۔ اس مسئلہ کو کسی خالص دنیاوی پہلو کے اعتبار سے نہیں پیش کیا بلکہ اسے گمراہی سے بچنے کا وسیلہ اور نجات کا ذریعہ بتایا تھا جیسا کہ (لن تضلوا) کے الفاظ بتا رہے ہیں۔ نیز یہ کہ "میں روز قیامت دریافت کروں گا کہ تم نے ان کے ساتھ کیا کیا؟"

تو اب بتائیے کہ اس چیز کو مذہب سے الگ اور اخروی جزا و سزا سے غیر متعلق کیونکر قرار دیا جائے۔

بہرحال جیسا کہ میں نے اپنے دوسرے مضمون میں تحریر کیا ہے اسوقت مسلمانوں کے لئے مسئلۂ خلافت کا عملی پہلو صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنے احکام و تعلیمات مذہبی میں کن پیشوایان دین کو اپنا رہنما قرار دیں اور انکی تعلیمات پر عمل کریں" اگر یہ مسئلہ اسوقت بھی طے پا جائے اور تمام اہل اسلام متفقہ حیثیت سے عترت رسول کی مذہبی پیشوائی کو قبول کرلیں اور احکام و تعلیمات مذہبی میں انہی کے تعلیمات کو [illegible] کریں تو پھر کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ اس لئے کہ خلافت یعنی بادشاہت تو ایک وقتی چیز ہے جس کے احکام انتظامی حیثیت رکھتے ہیں جن کا کوئی تعلق آیندہ نسلوں کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتا اسلئے اگر حضرات خلفاء کی حکومت کو اس حیثیت سے اُن کے زمانہ میں تسلیم بھی کیا جائے تو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے ساتھ اُس کا کوئی عملی یا اعتقادی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔ اور اسلئے موجودہ زمانہ میں شیعہ اور سنی کی تفریق کا کوئی سبب باقی نہیں رہتا۔ خدا کرے مدیر نگار کی کوشش کامیاب ہو اور مسلمانوں کی یہ باہمی تفریق دور ہو کر ایک مذہب قرار پائے جس کو کہا جا سکے "حقیقی اسلام"

بس مجھے اب اس سلسلہ میں کچھ کہنا نہیں ہے۔ مدیر نگار نے جو تنقیحات قائم کئے ہیں اُن پر اہلسنت اور شیعہ مذہب کے علماء کو بحث کرنا چاہئے اس لئے کہ زاویۂ بحث اب ایسے نقطہ پر پہونچ گیا ہے جو ایک "ہندو" کے دسترس سے باہر ہے۔ "ہرنام"

(نگار) گزشتہ فروری کے نگار میں مسئلۂ خلافت و امامت پر میرے محاکمہ کی اشاعت کے بعد

اسوقت تک متعدد مضامین شیعہ و سنی حضرات کے موصول ہوئے لیکن اُن کو شائع نہیں کیا گیا کیونکہ جو طریق استدلال ان میں اختیار کیا گیا ہو وہ یا تو کیسر مجادلانہ ہے یا پھر اُس انداز کا جو اس سے قبل بارہا استعمال ہو چکا ہے اور ناکام ثابت ہوا ہے۔

جس حد تک روایات کا تعلق ہے یقیناً حضرات شیعہ اس اعتقاد میں بالکل حق بہ جانب ہیں کہ رسول اللہ جناب امیر کی خلافت چاہتے تھے اور اپنی اس خواہش کا آپ نے اظہار بھی فرما دیا تھا۔ اہل سنت دیگر خلفاء کے صرف فضایل بیان کرکے اس حقیقت کے مٹانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ سوال خلافت کا ہے نہ کہ محض فضیلت کا۔ اسی کے ساتھ اہل سنت کا مناظرانہ پہلو اسلئے اور بھی زیادہ کمزور ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اسے شیعہ روایات سے ثابت نہیں کر سکتے اور شیعی حضرات خود اہل سنت کی روایات سے حضرت علی کی وصایت و خلافت کو ثابت کر دکھاتے ہیں۔

اس لئے اب اس مسئلہ پر بحث کرنا کہ رسول اللہ حضرت علی کو اپنا جانشین و خلیفہ بنانا چاہتے تھے یا نہیں بیکار ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ (اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد) نفس مسئلۂ امامت پر گفتگو کی جائے یعنی یہ کہ اس کی اہمیت مذہب اسلام میں کیا ہے اور اسی کے ساتھ یہ کہ کیا جناب امیر کی امامت واقعی منصوص تھی یا نہیں۔

اسی لئے میں نے ماہ مارچ ۳۶ء کے نگار میں چند مباحث متعین کر دئے تھے اور چاہتا تھا کہ شیعی علماء اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں، لیکن افسوس ہے کہ اسوقت تک کسی نے توجہ نہیں کی۔

اب جناب ہر نام کا (جو اس تحریک کے بانی ہیں) یہ دوسرا مقالہ شائع کیا جا رہا ہے، وہ بھی میرا محاکمہ دیکھنے کے بعد اس ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ میں پہلے شیعی علماء سے درخواست کروں گا کہ وہ تمام ان مباحث کو سامنے رکھکر جو ماہ مارچ ۳۶ء کے نگار میں درج کئے گئے ہیں، اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں اور اس کے بعد سنی علماء کو متوجہ کروں گا کہ وہ جواب دیں لیکن دونوں فریق سے میری التجا یہی ہے کہ جو کچھ وہ لکھیں اس میں کوئی مجادلانہ پہلو نہ ہونا چاہئے، نیز یہ کہ روایتی استدلال میں وہ صرف فریق مخالف کی کتابوں کو سامنے رکھیں، ورنہ یوں تو اپنی اپنی روایات کو سامنے رکھکر ہمیشہ سبھی نے بحث کی ہے اور اسی لئے معقول نتیجہ کبھی پیدا نہیں ہوا۔

باب الاستفسار

حُروفی طبقہ

(جناب شیخ اکرام الحق صاحب۔ پشین)

نگار کے کسی آئندہ پرچہ میں دوچار حرف "حروفی طبقہ" کی بابت لکھ کر جو ایران میں پندرھویں صدی میں نمودار ہوا تھا، ممنون فرمائیے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کوئی مستند کتاب مل جائے تو واقفیت پیدا کروں، مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اب مجبوراً آپ کو تکلیف دیتا ہوں اور امید واثق ہے کہ اس التجا کو رد نہ کریں گے۔

(نگار) حروفی طبقہ فی الحقیقت ایک شیعی طبقہ ہے جس کا بانی ایک شخص فضل اللہ تھا۔ یہ استراباد کا رہنے والا تھا اور آٹھویں صدی ہجری کے اخیر یا چودھویں صدی میں پایا جاتا تھا۔

اس کی اشاعت سلطنت عثمانیہ میں ایک شخص علی الاعلیٰ کے ذریعہ سے بہت کافی ہوئی جو فضل اللہ کا مرید تھا۔ ترکی میں بکتاشی درویشوں کا گروہ اسی مسلک سے تعلق رکھتا تھا۔

ان کے عقاید کا حال ان کی مشہور کتاب محرم نامہ سے معلوم ہو سکتا ہے جو ۸۲۸ء میں مرتب کی گئی تھی مختصراً یہاں درج کئے دیتا ہوں:۔

۱۔ دنیا قدیم ہے اور برابر گردش کر رہی ہے

۲۔ تغیرات عالم کا سبب یہی گردش ہے

۳۔ تغیرات عالم کے مختلف دور ہوا کرتے ہیں جس کی ابتدا و انتہا یکساں ہوتی ہے یعنی شروع میں آدم کا ظہور آخر میں یوم حساب

۴۔ خدا نے انسان کی شکل اور خصوصیت کے ساتھ اس کے چہرہ میں ظہور کیا ہے

۵۔ خدا کا یہ ظہور مختلف پیغمبروں کی شکل میں یکے بعد دیگرے ہوا اور پھر اولیا کی شکل میں۔
۶۔ آخری پیغمبر محمد تھے۔ اور اس کے بعد اولیاء کا دور آیا جس کی ابتدا حضرت علی سے ہوئی اور انتہا امام حسن عسکری (گیارھویں امام) پر۔ فضل اللہ کو بھی وہ انھیں اکابرین سے مانتے تھے جن میں خدا حلول کر گیا تھا۔
۷۔ انسان کی امتیازی خصوصیت اس کی زبان یا قوت گویائی ہے جو عربی کے ۲۸ حروف میں منحصر ہے۔
انھوں نے حروف ابجد کے اعداد سے عجیب و غریب باتیں پیدا کی ہیں اور ان کے عقاید زیادہ تر انھیں مفروضات پر قایم ہیں جو اعداد حروف سے انھوں نے پیدا کئے ہیں اور اسی لئے انھیں حروفی کہتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ انسانی شکل کے امتیازی خطوط سات ہیں اور ان کو جب چار عناصر سے ضرب دو گے تو حاصل ضرب ۲۸ ہوگا جو تعداد ہے عربی حروف کی۔
ان کی خاص خاص کتابیں یہ ہیں:۔ محرم نامہ۔ ہدایت نامہ۔ جاودان۔ حقیقت نامہ۔ استوا نامہ۔ ان میں سے بعض ترکی زبان میں ہیں اور بعض استرابادی ملی ہوئی فارسی میں۔ اور درویشوں کی طرح انکے یہاں ذکر و شغل نہیں پایا جاتا۔ وہ روز صبح کو اپنے پیر طریقت کے مکان پر جمع ہوتے ہیں جسے وہ بابا کہتے ہیں۔ بابا ان کو اپنے خادم کے ذریعہ سے ایک ایک پیالہ شراب یا نبیذ کا، ایک ٹکڑا روٹی کا اور تھوڑا سا پنیر تقسیم کرتا ہے یہ لوگ پیالہ کو لیکر آنکھ اور سر سے لگاتے ہیں اور پھر پیکر بہت ہو حق مچاتے ہیں۔

کیا عہد قدیم کا انسان زیادہ صحیح و توانا تھا

(جناب سید محمد رفیع صاحب۔ آگرہ)

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ آج کل بیماریوں کی کثرت تمدن جدید کی وجہ سے ہے اور اس سے قبل جب انسان وحشی تھا تو وہ نہ بیمار پڑتا تھا اور نہ جلد مرتا تھا۔ کیا یہ صحیح ہے۔

(نگار) بالکل غلط ہے۔ اور افسوس ہے کہ اس غلطی میں اکثر پڑھے لکھے آدمی بھی مبتلا ہیں۔ میں نے خود بہت قابل لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جتنی ترقی ڈاکٹری یا علم طب میں ہوتی جاتی ہے اتنی ہی بیماریاں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ اس سے قبل جب انسان پہاڑوں اور جنگلوں میں رہتا تھا تو نہ اسے کوئی بیماری لاحق ہوتی تھی اور نہ اس قدر جلد وہ موت کا شکار ہوتا تھا۔

قدیم انسان کے جو جمجمے یا کاسہائے سر دریافت ہوئے ہیں ان کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد قدیم کا انسان عضلات کی بیماری میں بہت مبتلا رہتا تھا، اسی طرح قدیم انسانی ڈھانچوں کے دیکھنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ مسلول انسان کی ہڈیاں ہیں۔ ابتدائے عہد تاریخ کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ قدیم مصریوں میں ہڈیوں اور جوڑ کی بیماری بہت کثرت سے پائی جاتی تھی اور اسی لئے ان کی پیٹھ جھک جاتی تھی۔ اسوقت آپ کو اتنے کبڑے انسان نظر نہیں آتے جتنے عہد قدیم میں پائے جاتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ شرائین میں سختی پیدا ہونا بھی تمدن جدید کی بیماری ہے، حالانکہ قدیم مومیاؤں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرض مصر قدیم میں بھی پایا جاتا ہے چنانچہ موسیٰ کے زمانہ کا فرعون اسی میں مبتلا تھا گو انتقال اس کا ہوا اندھی آنت کی بیماری میں۔

قدیم انسان تاریک اور سرد و مرطوب غاروں میں رہتا تھا اور چونکہ بہ نسبت درندوں کے وہ عناصر سے زیادہ ڈرتا تھا۔ اس لئے وہ بہت کم باہر نکلتا تھا اور جب فراہمی غذا کے لئے مجبور ہو کر باہر آتا تھا تو جلد سے جلد پھر اندر چھپ جانے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ قدیم انسان کھلی ہوا اور دھوپ میں رہتا تھا اور اس لئے بہت تندرست تھا۔ اس کے بچے تاریک غاروں میں رہنے اور اچھی غذا نہ ملنے کی وجہ سے اکثر و بیشتر سوکھے کے مرض میں مبتلا ہو کر مر جایا کرتے تھے۔

جو ڈھانچے اسوقت تک دریافت ہوئے ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اسلاف قدیم کی عمر ۳۰ سال سے زیادہ ہوتی ہی نہ تھی۔ روڈسیا (افریقہ) میں ایک جمجمہ ایسا دریافت ہوا جو جاوا وغیرہ سے دریافت شدہ جمجموں سے مختلف ہے۔ اور اختلاف یہ ہے کہ اس میں ایک سوراخ پایا جاتا ہے جو اور جمجموں میں نہیں ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ سوراخ جراثیم کا پیدا کیا ہوا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جس انسان کا یہ جمجمہ ہے وہ پہلے کان کے امراض میں مبتلا ہوا، اور جب جراثیم اس کی سماعت کو تباہ کر چکے تو کاسۂ سر کی طرف بڑھے اور دماغ تک پہونچکر اس کی ہلاکت کا باعث ہوئے۔

قدیم انسانی ڈھانچوں اور جمجموں کی تحقیق اب ایک مستقل فن ہے اور اس کی مدد سے بہت عجیب و غریب باتیں انسان قدیم کے متعلق معلوم ہوئی ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں یہ امر بھی تحقیق ہوا ہے کہ پرانے زمانہ میں نقرس، وجع مفاصل کے امراض بہت زیادہ پائے جاتے تھے۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ دانتوں کے امراض (مثلاً پایوریا وغیرہ) جدید تہذیب کے برکات میں سے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ چونکہ پہلے انسان ہر چیز کچی کھاتا تھا اس لئے اس کے دانت مضبوط رہتے تھے اور اب ہم چیز پکا کر کھانے کی وجہ سے وہ دانتوں کی بیماریوں میں مبتلا ہو گیا ہے۔ لیکن یہ خیال بھی بالکل غلط ہے۔ کیونکہ

مصر کی قدیم مومیائی شدہ لاشوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد فراعنہ سے پہلے بھی دانتوں کے امراض ان میں بکثرت پائے جاتے تھے۔

امریکہ کے ہنود احمر کے جو ڈھانچے اور جمجمے دریافت ہوئے ہیں اُن سے بھی دانتوں کے امراض کا پتہ چلتا ہے۔ جزیرۂ ہوائی کے قدیم انسان کے ڈھانچوں سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے بلکہ ان کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دانتوں کے کیڑے بعض دفعہ سر تک پہونچکر دماغ کو کھوکھلا کر دیتے تھے۔

نہ صرف انسان بلکہ عہد قدیم کے جانوروں کے جو ڈھانچے دریافت ہوئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسوقت کے جانور بھی اس موذی مرض میں مبتلا ہوتے تھے، چنانچہ ڈینوسور ماسٹوڈون ایسوہیوسس قدیم جانوروں کے ڈھانچوں میں اس مرض کے علامات بکثرت پائے جاتے ہیں۔ پھر جبکہ عہد قدیم کے جانور بھی امراض سے نہ بچ سکتے تھے تو انسان جو اُن سے بہت ضعیف تھا کیونکر محفوظ رہا ہوگا۔

الغرض یہ سمجھنا کہ قدیم انسان زیادہ صحیح و توانا تھا اور بڑی عمریں پاتا تھا بالکل غلط ہے وہ اکثر بیمار رہتا تھا اور مختلف بیماریاں اس کو لاحق ہوتی تھیں یہاں تک کہ مشکل سے ہزار میں سو بچے اس کے زندہ رہتے تھے اور تیس سال سے زیادہ وہ خود بھی زندہ نہ رہتا تھا۔

اس وقت چونکہ تحقیق و تفتیش سے مختلف امراض کی تعیین ہو چکی ہے۔ اس لئے لوگ سمجھتے ہیں کہ اگلے لوگ ان امراض کا شکار نہ ہوتے تھے۔ وہ اب سے زیادہ سل و دق میں مبتلا ہوتے تھے، اسوقت سے کہیں زیادہ نمونیا، چیچک، تپ محرقہ، تپ معادی، سرطان، وجع مفاصل، پایوریا وغیرہ ان کو ستاتے تھے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ پہلے نہ وہ ان بیماریوں میں کوئی امتیاز کر سکتے تھے اور نہ ان کا علاج۔ اب چونکہ ان تمام آلام و شکایات کی علٰحدہ علٰحدہ تعیین ہو گئی ہے اس لئے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ امراض بھی نئے ہیں۔

مکتوبات نیاز

مطبوعات موصولہ

پوئٹری مختصر سا انگریزی مقالہ ہے جناب فضل الدین اختر بی۔ اے کا۔ جس میں انھوں نے موجودہ دورِ شاعری پر بحث کرتے ہوئے سیماب، جوش اور اقبال پر بھی رائے زنی کی ہے۔ حضرت چونکہ اختر صاحب کے اُستاد ہیں اس لئے ان کی تعریف کرنی ہی چاہئے تھی۔ اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نہائی جوشِ عقیدت سے کام لیکر پورا حق شاگردی ادا کیا ہے۔ سیماب نہایت اچھے شاعر ہیں اور میں ان کے تغزل کا بہت معترف ہوں، لیکن افسوس ہے کہ ان کے منظومات میں نہ واقعیت ہے نہ اثر۔ میں انکا شاگرد ہوں اس لئے ایسا کہہ رہا ہوں، ممکن ہے ان کا تلمذ حاصل کرنیکے بعد میں ایسا نہ کہہ سکتا یا کہنا مناسب نہ سمجھتا۔ اختر صاحب کی رائے حضرت سیماب کے متعلق تو قابل لحاظ نہیں، البتہ جوش اور اقبال کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں انھوں نے ضرور کہیں کہیں اپنی نکتہ رسی کا ثبوت دیا ہے۔ اقبال کی بالِ جبریل کو وہ کمتر درجہ کی تصنیف کرتے ہیں، حالانکہ میرے نزدیک اقبال کا یہی کارنامہ یادرہ جانے والا ہے۔ جوش کی انھوں نے جتنی اور تعریف کی ہے وہ یقیناً اسی کے مستحق تھے۔

یہ مقالہ مجلد شائع ہوا ہے اور دس آنہ میں آگرہ پرنٹنگ ورکس آگرہ سے ملسکتا ہے۔

ن آرزو جناب آرزو لکھنوی کی غزلوں کا مجموعہ ہے جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس سے چند سال قبل فغان آرزو کے نام سے ایک مجموعہ اور بھی شائع ہوا تھا اور اہل نظر نے اس کی کافی قدر کی۔ جناب آرزو لکھنو کے مشہور کہنہ مشق شعراء میں سے ہیں اور گزشتہ چند سال سے بہت سہل و سادہ الفاظ میں کہنے کا ڈھنگ نکالکر انھوں نے ایک خاص امتیاز اپنے لئے علحدہ پیدا کرلیا ہے۔

آرزو کے کلام میں سادگی و سلاست کے ساتھ اثر بھی ہے اور اگر کسی جگہ انھوں نے صرف الفاظ کی شاعری کی ہے تو اس کو بھی اپنے انداز بیان سے بہت گوارا صورت دیدی ہے آرزو کے کلام میں یقیناً نہ جوش و مستی ہے نہ رعنائی، لیکن اس کی جستجو بیکار ہے کیونکہ وہ اس رنگ کے شاعر ہی نہیں اور ابتدا ہی سے انکی شاعری "مسکنت و غربت" لئے ہوئے ہے۔ بعض اشعار جو سرسری نگاہ میں مجھے پسند آئے ذیل میں درج ہیں:

غنچے چپ ہیں، گل ہیں ہوا پر، کس سے کہئے جی کا حال　　خاک نشیں اک سبزہ ہے سو اپنا بھی بیگانہ بھی

غفلت سے کہیں بہتر تھی جفا یعنی کہ محبت تھی زندہ ۔ جو ایذا تھی سہہ لینے کی اک بار نہیں سو بار سہی
کٹنے کی شرم اُدھر آرزو، اِدھر یہ خیال ۔ دیا تھا درد جنھوں نے وہی دوا کرتے
پرسش اُدھر مزاج کی، بند اس طرف زباں ۔ وہ وقت ہے کہ وہ بھی کہیں بیوفا مجھے،

یہ دیوان ایک روپیہ میں حقیقت بک ایجنسی لکھنو سے ملسکتا ہے۔

انتخاب کلام مظہر مظہر مرحوم، جن کا پورا نام بہ شمول اسناد ڈاکٹر محمد عبدالغفور تھا، احسان شاہجہانپوری کے شاگرد تھے۔ رہنے والے کہاں کے تھے یہ نہ مجھے معلوم ہے اور نہ دیباچہ سے اس کا پتہ چلتا ہے پنشن لینے کے بعد ۷۰ سال کی عمر میں آپ کا انتقال جھانسی میں ہوا اس لئے ممکن ہے وہی وطن بھی ہو۔ بہرحال وہ متوطن کہیں کے ہوں، ان کی شاعری لکھنؤ کی تھی۔

اس مجموعہ میں غزلیات، مخمسات و قطعات کے علاوہ بعض مضامین نثر کے بھی ہیں۔

یہ مجموعہ ان کے صاحبزادے محمد احسن الغفوری۔ اے نے شائع کیا ہے اور ابتدا میں اپنے والد مرحوم کے مختصر حالات بھی درج کر دئے ہیں۔ طباعت و کتابت اچھی ہے اور ۲ ر کے ٹکٹ بھیجنے سے ہر شخص کو مفت ملسکتا ہے۔

عورت دہلی سے ایک مشہور طبی ماہنامہ ہمدرد صحت کے نام سے جاری ہے۔ جولائی کا رسالہ جسے اشتہارات نکالکر ۲۴۲ صفحات کی ضخیم کتاب کہنا چاہئے، عورت کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ امراض نسائی سے متعلق کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کا اس میں ذکر نہ ہو اور کوئی طریق علاج ایسا نہیں ہے جو بتایا نہ گیا ہو۔ عورت کی زندگی کے تین زمانے ہیں، ایک دوشیزگی کا، دوسرا ازدواج کا اور تیسرا ماں بننے کا۔ اس مجموعہ میں ان تینوں نمانوں سے بحث کی گئی ہے اور اس قدر تکمیل کے ساتھ کہ میری رائے میں ہندوستان کی ہر عورت کو اس کا مطالعہ میں رکھنا فرض ہے۔

کارکنان ہمدرد صحت نے جس محنت و کاوش سے اس خاص اشاعت کو پیش کیا ہے وہ یقیناً مستحق داد و ستایش ہے۔ اس مخصوص نمبر کی قیمت، بارہ آنے ہے جو حقیقتاً کچھ بھی نہیں ہے۔

انقلاب روس تصنیف ہے جناب پنڈت کشن پرشاد صاحب کول کی جس میں نہایت بسط و وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ روس کا موجودہ نظام حکومت کیا ہے اور یہ کہ اس نظام کی تشکیل کے اسباب کیا تھے۔ فاضل مصنف نے اس کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصۂ اول میں روس کی گزشتہ تاریخ پر بحث کرتے ہوئے اور جمہوریت کے نشو و نما اور جنگ عظیم کے بعد جو حالات رونما ہوئے ان پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسرے حصہ میں نظریۂ سوشلزم پر تاریخی و علمی نقطۂ نظر سے گفتگو کرتے ہوئے ۱۹۱۷ء کے ہنگامۂ انقلاب کی داستان بیان کی ہے۔ تیسرے حصہ میں وہاں کے دستور حکومت اور آئین و قوانین کو بیان کیا ہے

چوتھے حصہ میں صنعت و حرفت اور زراعت کا ذکر کرکے پانچویں حصہ کو تعلیم و مذہب اور طرز معاشرت کے بیان پر ختم کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قابل مصنف نے اس قدر تکمیل کے ساتھ اس کتاب کو پیش کیا ہے کہ موضوع سے متعلق کوئی تشنگی مطالعہ کرنے والے کو باقی نہیں رہتی۔

زبان اور انداز بیان حد درجہ سلیس و سادہ ہے اور اسی کے ساتھ دلچسپ بھی۔ یہ کتاب ٹائپ کے حروف میں شائع ہوئی ہے اور عہ میں ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد سے مل سکتی ہے۔

اُردو۔ ہندی اور ہندوستانی

مقالہ ہے جناب پنڈت کشن پرشاد صاحب کول کا جو انھوں نے ہندوستانی اکاڈمی کی لٹریری کانفرنس میں پڑھا تھا۔ اسوقت اُردو ہندی کا جھگڑا بہت اُلجھا ہوا مسئلہ ہے اور ہر وہ شخص جو اُردو ہندی لٹریچر سے دلچسپی رکھتا ہے اس پر کچھ لکھنے یا سننے کی طرف مایل نظر آتا ہے لیکن افسوس ہے کہ مسلمان اور ہندو دونوں صحیح راستہ پر نہیں ہیں اور جس مقصد کو سامنے رکھ کر وہ اصلاح زبان و رسم الخط کی کوشش کر رہے ہیں وہی سرے سے بالکل گمراہ کن ہے۔

اس دوران میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے، لیکن ان تمام مقالات میں، صرف پنڈت کشن پرشاد صاحب کول ہی کا ایک مقالہ ایسا ہے جس کے پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لکھنے والے نے جو کچھ لکھا ہے وہ واقعی سوچ سمجھ کر لکھا ہے۔

میں کول صاحب کے اس بیان سے بالکل متفق ہوں کہ اُردو ہندی کی نزاع کا بڑا سبب سیاسی نزاع ہے اور اسی کے ساتھ میں اس باب میں بھی ان کا ہم خیال ہوں کہ سیاسی اغراض کی تکمیل کے لئے یہ ضروری نہیں کہ تمام ہندوستان کے باشندوں کی ایک ہی زبان ہو اور وہ ایک ہی رسم الخط کے پابند ہو جائیں۔ اگر ہندو ہندی رسم الخط کی طرف مایل ہیں تو اس کے یہ معنے نہیں کہ مسلمان اُردو رسم خط چھوڑ دیں اور اگر مسلمان ہندی رسم الخط اختیار نہیں کرتے تو ہندو اس کو سیاسی اختلاف کی صورت میں پیش کریں۔

کول صاحب نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے اور اس سے قبل بارہا میں بھی نگار کے ذریعہ سے اس خیال کا اظہار کر چکا ہوں کہ ابتدائی ثانوی مدارس میں اُردو ہندی دونوں کی تعلیم لازمی قرار دینا چاہئے۔ تاکہ ہندو مسلمان دونوں کی ایک دوسرے کے لٹریچر، تاریخی واقعات اور مذہبی روایات سے واقف ہونے کا موقعہ ملے اور یہ بیگانگی جو اس وقت زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آرہی ہے دور ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ اس طرف کسی نے توجہ نہیں کی اور دور از کار مباحث و تدابیر میں وقت ضایع کیا گیا۔

زبان کو سادہ و سلیس بنانے کے طرفدار کول صاحب بھی ہیں، لیکن وہ عربی و فارسی الفاظ کے ترک

(؟)دینے کے مؤید نہیں ہیں کیونکہ اُردو بغیر عربی وفارسی الفاظ کی مدد کے علمی زبان کبھی نہیں بن سکتی - بہرحال (؟) صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ یقیناً ان کے غایر مطالعہ کا نتیجہ ہے اور جس نتیجہ پر وہ پہونچے ہیں اسکی صحت (؟)م از کم مجھے ضرور اعتراف ہے -

(؟)ی زبان

اس رسالہ میں مولوی یعقوب الرحمان عثمانی نے اُردو زبان کی وسعت و اہلیت پر روشنی ڈالی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کی یہی ایک زبان ایسی ہے جو مشترک زبان بننے کی (ص)لاحیت رکھتی ہے - یہ رسالہ آٹھ آنے میں مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی سے مل سکتا ہے -

اطلاعنامہ بنام دائنان دربارہ ادخال درخواست بریت

دفعہ ۱۴ (۱) ایکٹ ۵ سنہ ۱۹۲۰ء

بعدالت جناب جج صاحب بہادر خفیفہ لکھنؤ

درخواست دیوالیہ نمبر ۲، سنہ ۱۹۳۵ء

بمقدمہ قرار داد دیوالیہ مسمی موتی ولد پرسا و سماۃ لچھمن زوجہ موتی اقوام مہتر ساکنان گڈھیا چار باغ لکھنؤ - سائلان

بنام

(۱) گیا پرشاد (۲) متھرا پرشاد پسران لچھمن داس ساکن رستوگی ٹولہ تھانہ چوک لکھنؤ - (۳) گنگا دھر رستوگی ساکن (؟)جہ بازار تھانہ چوک لکھنؤ - (۴) منا ولد مستری ساکن رستوگی ٹولہ لکھنؤ - (۵) نانک سنگھ قوم سکھ پنجابی ساکن (؟)یہ نگر لکھنؤ - (۶) ملک اللہ بسایا ساکن گھسیاری منڈی لکھنؤ - (۷) آغا شاہ محمد خاں کابلی ساکن امانی گنج لکھنؤ (۸) بنواری لال ساکن رستوگی ٹولہ لکھنؤ - (۹) موہن مہاراج ساکن جیتوا پور عقب چوکی پولیس لکھنؤ - (۱۰) گنیشی ساکن تکیہ پیر جلیل لکھنؤ - (۱۱) محمد ولد نادر خاں ساکن مولوی گنج لکھنؤ - (۱۲) آغا حبیب اللہ ساکن (؟)عیش باغ لکھنؤ - (۱۳) گوپال داس رستوگی ساکن بازار راجہ لکھنؤ - (۱۴) درگا ولد نامعلوم ساکن ناکہ ہنڈولہ لکھنؤ -

مطلع ہو کر دیوالیہ مذکور الصدر نے اپنی بریت کی درخواست عدالت ہذا میں گزرانی ہے اور عدالت ہذا نے (سم)اعت درخواست کے واسطے تاریخ چھ اگست سنہ ۳۶ء بوقت دس بجے دن مقرر کی ہے -

تاریخ ۲۲ ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۶ء

دستخط منصرم بخط انگریزی

آخری وصیت

(انگریزی شاعرہ روزیٹی کی ایک نظم کا ترجمہ براہ راست انگریزی سے)

یاد کرنا بچھڑ کے جب تم سے ہم بسائیں گے شہرِ خاموشاں
دور بستی سے، کالے کوسوں دور کوئی پرساں نہیں کسی کا جہاں

یاد کرنا وہ وقت، پیارے جب تم مرے ہاتھ کو دباتے تھے
اور حیا سے یہ حال تھا میرا پاؤں تھراتے، لڑکھڑاتے تھے

پھیرے منھ کو جانا چاہتی تھی پر نہ اُٹھ سکتے تھے قدم میرے
دیکھ کے تر مجھے پسینے میں آپ ہی تم ہاتھ چھوڑ دیتے تھے

یاد کرنا وہ وقت جب ہر روز سوچا کرتے تھے ہم بہم کیا کیا
آہ بس یاد ہی کیا کرنا وقت ہوگا دعا نہ مشورے کا

بھول جاؤ کبھی جو بھولے سے اور پھر اُس کے بعد یاد کرو
رنج کرنا نہ میری جاں کی قسم روح خوش ہوگی جس میں تم خوش ہو

کیونکہ تاریکی و فنا نے اگر شائبہ بھی خیال کا چھوڑا
یہ تصور چلائے گا چھُریاں دشمنوں کو ہے غم جدائی کا

سُن لو یہ آخری وصیت ہے ٹھنڈی سانسیں بہت نہ بھرنا تم
کر لو وعدہ، اگر محبت ہے یاد کرنا مگر نہ کڑھنا تم

اثر لکھنوی

یاد ہے

گلفروشی، برقباری کا فسانہ یاد ہے
یاد ہیں وہ میکدہ بردوش نظریں یاد ہیں
نازسے اُلجھے ہوئے گجروں کو سلجھاتے ہوئے
بے رخی کے ساتھ سننا درد دل کی داستاں
بے دہکتی آگ کا اب تک نگاہوں میں سماں
وہ مرے اشعار پر رنگیں لبوں کی واہ وا!
وہ ترا غرور و تغافل، وہ ہوائیں تیز تیز
وہ تری مستی بھری خود ساختہ سنجیدگی
وہ ترا جذبات کو آتش فشاں کرنے کا ڈھنگ
فتنہ ساماں! وہ ترا انگڑائی لینے کے لئے
وہ ترے رنگین ہونٹوں پر تبسم کی بہار
وہ ترا بدمست ہوکر، کچھ نہ کہہ سکنا، مگر!
وہ ہتھیلی سے ترا آنکھوں کا ملنا دیکھ کر
ہائے یہ بے کیفیٔ دل، وائے یہ ویرانیاں!

مسکرا کر وہ ترا آنچل اُٹھانا یاد ہے
وہ ترا بھر بھر کے جامِ مے پلانا یاد ہے
وہ ترا دھیمے سُروں میں گنگنانا یاد ہے
وہ کلائی میں ترا کنگن گھمانا یاد ہے
جوش میں چہرے کا تیرے تمتمانا یاد ہے
لطف لے لیکر ترا چٹکی بجانا یاد ہے
گیسوؤں کا رُخ سے جھنجلا کر ہٹانا یاد ہے
انگلیوں سے خشک مہندی کا چھڑانا یاد ہے
وہ ترا ہر بار مجھ سے روٹھ جانا یاد ہے
آسماں کی سمت ہاتھوں کا اُٹھانا یاد ہے
پھول بن بن کر ترا بجلی گرانا یاد ہے
ہونٹ کو رہ رہ کے دانتوں میں دبانا یاد ہے
صبح کے تاروں کا پیہم جھلملانا یاد ہے
وہ تو یہ کہئے کہ تیرا مسکرانا یاد ہے

حضرتِ ماہر تمھیں ان غم فزا حالات میں
یہ ہی کیا کم ہے محبت کا فسانہ یاد ہے

ماہر القادری

شامِ برشگال

یہ گھٹتوں کی بستیاں، یہ بہکی بہکی مستیاں!
یہ بادلوں کے قافلے رواں، دواں، یہاں وہاں
ہر ایک چیز مست ہے نوازشِ بہار سے
تجلیاں تمام تر زمین پر بکھر گئیں

بہار زرنگار کی یہ طرفہ جشید ستیاں
پہونچ گئے جہاں کہیں جگا دیں مے پرستیاں
شراب بہہ رہی ہے پھر فراز کوہسار سے،
بکھر کے خود نکھر گئیں، نکھر کے خود سنور گئیں،

شمیم نعمانی نیازی

انتظار

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

خوش تھے ہم خواب میں وہ مست شباب آئے گا
اپنا ارمان بر افگندہ نقاب آئے گا

نظریں نیچی کئے شرمائے ہوئے آئے گا
کاکلیں چہرے پہ بکھرائے ہوئے آئے گا

پتیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو آپ آ ہی گئے
سجدے مسرور کہ مسجود کو ہم پا ہی گئے

شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی
آپ کے آنے کی اک آس تھی اب جانے لگی

صبح نے سیج سے اٹھتے ہوئے لی انگڑائی
او صبا تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی

میرے محبوب میری نیند اڑانے والے
میرے مسجود میری روح پہ چھانے والے

اب بھی آجا کہ میرے سجدوں کا ارماں نکلے
تیرے قدموں پہ مری جان مری جاں نکلے

مخدوم محی الدین بی۔ اے (عثمانیہ)

کیا ہو تم؟

بہت حسین، بڑے دوست آشنا ہو تم
حیات عشق کا معصوم مدعا ہو تم

میں جس خیال میں کھویا ہوا سا رہتا ہوں
اسی خیال کی تشکیل جانفزا ہو تم

سحر کی ضو میں شفق کی حسین شاموں میں
مری حیات کا اک خواب خوشنما ہو تم

تمھیں ہزار حجابوں میں دیکھ لیتا ہوں
جدا نہیں ہو بہر حال، گو جدا ہو تم

یہ برق پاش نگاہیں یہ جلوہ ریز ادا
شعاع حسن ہو یا موجۂ ضیا ہو تم

نگاہیں نیچی کئے شرم سے لجاتے ہوئے
کوئی مجسمۂ عفت و حیا ہو تم

خرام نغمہ ہو یا نغمۂ خراماں ہو
سرور و کیف میں ڈوبی ہوئی صدا ہو تم

حسین خواب ہو میری جوان راتوں کا
کہ خواب عشق کی تعبیر جانفزا ہو تم

خود اپنی مست اداؤں میں آپ کھوئے ہوئے
تمھیں خبر ہی نہیں ہے ابھی کہ کیا ہو تم

یہ انکشاف ہیں سب ممکنات کی حد تک
دگرنہ سچ تو ہے یہ ان سے ماورا ہو تم

انور (رازبیاور)

غزل

بے وفا دنیا کے دام میں بدنصیب آ ہی گیا
دل ہی تھا آخر، فریب دوستی کھا ہی گیا

اب کہاں پہلو میں دل کی بیقراری کے مزے
اب وہ شغل نالۂ شام و سحرگاہی گیا

ترک الفت خوب ہے لیکن اسے کیا کیجئے!
جب خیال آیا کسی کا دل کو تڑپا ہی گیا

دوستداری اور وفاکیشی کی امید آپ سے!
آپ نے فرمایا، مجھ کو اعتبار آ ہی گیا

کلیم انجم رضوانی

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت علاوہ محصول عار

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اُصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت علاوہ محصول عہ

فراست الید

مؤلفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل عمر، عروج و زوال موت حیات صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ کی صحیح پیشنگوئی کر سکتا ہے۔

قیمت علاوہ محصول عہ

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل متیاب ہو جاتا ہے اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بہترین نمونے نظر آتے ہیں

قیمت علاوہ محصول (۱۲)

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں ۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔ ۲۔ مادئین کا مذہب ۳۔ حرکت کے کرشمے نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت عہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا پھر ختم تک پڑھ لینا ہے اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت (۱۲) علاوہ محصول

تاریخ الدولتین

جرجی زیدان کی تاریخ تمدن اسلام کی چوتھی جلد کا ترجمہ جس میں عہد بنی اُمیہ و بنی عباس کی سیاسیات پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے۔ جرجی زیدان کی یہ کتاب بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہے

قیمت (۱عہ) علاوہ محصول

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآراء کتاب ہے جسمیں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی [illegible] پیدا ہوئی اور [illegible] اسکی مستند [illegible] اُردو میں اس موضوع پر اس قسم کی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی [illegible] اسکی عبارت [illegible] ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔ قیمت عا

علاوہ محصول

صحابیات

اسمیں عہد سعادت کی ۰۰ خواتین کے مستند حالات لکھے گئے ہیں اسکا مقدمہ جسے مولانا نے خاص طور سے لکھا ہے دیکھنے کے قابل ہے اس موضوع پر اور کتابیں بھی اگر مصنفین کی موجود ہیں لیکن اتنی صحابیات کے حالات کسی کتاب میں نہیں لکھے گئے ہیں قیمت عا

علاوہ محصول

المسئلۃ الشرقیہ

مصطفےٰ کمال پاشا کی اس مشہور عالم کتاب کا ترجمہ جسنے یورپ و ایشیاء کی سیاسیات میں ہلچل ڈالدی تھی اور جسنے سب سے پہلے ترکی و مصر و عرب و حجاز میں انقلاب کی روح پھونک کر عالم اسلامی کے درخشاں مستقبل کو بے نقاب کر دیا تھا

قیمت عا

علاوہ محصول

عرض نغمہ

یعنی ٹیگور کی گیتان جلی کا سب سے پہلا اُردو ترجمہ جسکے متعلق ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کی رائے تھی کہ دنیا کی کسی زبان میں گیتان جلی کا ترجمہ اس سے بہتر نہیں کیا گیا اسکے شروع میں ایک نہایت ہی دلچسپ مقدمہ بھی شامل ہے قیمت عہ مجلد

علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴
شاہی
تیار کردہ
طیبی
دواخانہ
یونانی
SHAHI
BEST TONIC FOR GENERAL DEBILITY
BEST UNANI
ملیریا اور ٹائیفائیڈ (موتی جھرہ)
کے بعد کمزوری دفع کرنے کیلئے
"شاہی"
لاجواب دوا ہے
ہسٹریا اور اسقاط حمل
کے
دفع کرنے میں
"شاہی"
کا مقابلہ کرے ایسی
دوا شاذونادر
ہی ہو
اینیمیا (کمی خون) دمہ
کھانسی وجملہ امراض
سینہ کے لئے
"شاہی"
اکسیر علاج
ہے
مزید معلومات کے لئے
سات سو تیار شدہ مرکبات کی فہرست مفت طلب کیجئے
طیبی دواخانہ یونانی
۲۶ محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳
ٹیلیفون نمبر ۳۴۹۰۳
تار کا پتہ :- "شاہی" اندور (مالوہ)

قیمت ۸ر

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)

بیرون ہندوستان سے [illegible] سالانہ پیشگی مقرر ہو

شمار (۳)	فہرست مضامین ستمبر [illegible]ء	جلد ([illegible])

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۳۰)	ستمبر ۳۶ء	شمار (۳)

ملاحظات

بازارِ اسلام میں جنسِ کفر کی ارزانی

جب کسی قوم کی اخلاقی حالت پست ہوجاتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ دورِ انحطاط سے گزر رہی ہے جب اس کے اخلاق بلند ہوتے ہیں تو ہم حکم لگاتے ہیں کہ وہ عروج پر ہے اور ہماری تنقید زیادہ سے زیادہ اسی حد تک پہونچکر رہجاتی ہے۔ درانحالیکہ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ہمارے اخلاق کی پستی و بلندی کا تعلق کس چیز سے ہے یا بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ ہمارے عروج و زوال کا ذمہ دار کون ہے۔

قوم نہ نام کسی ایک فرد کا ہے نہ بہت سے افراد کا، بلکہ اس جماعت کا جو کسی ایک قانون، ایک ضابطہ زندگی کی پابند ہو اور جس کے تمام افراد کسی ایک غرض مشترک سے وابستہ ہوں، اسی پابندی کا نام ہیئت اجتماعی ہے اور یہی ہم آہنگی و یکرنگی سوسائٹی یا سماج کی جان ہے۔

دنیا میں جتنے مذاہب رونما ہوئے ان سب کی غایت سوسائٹی کی اصلاح تھی تاکہ اس کے افراد ایک شیرازہ سے بندھے رہیں اور ان میں انتشار پیدا ہو کر مقاومت کی قوت فنا نہ ہوجائے۔

یہاں اس بحث کی ضرورت نہیں کہ مذہب کوئی الہامی چیز ہے یا خود انسان کے دماغ کی پیداوار۔ اگر

وہ خدا کا بنایا ہوا دستور ہے تو بھی اور اگر ذہن انسانی کی اختراع تو بھی - بہرحال اُسے زمانہ کے حالات اور تمدن کی تدریجی ترقی کے لحاظ سے مرتب ہونا چاہئے تھا اور ہوا۔ صنم پرستی سے لیکر صمد پرستی تک جتنے دور مذہب پر گزرے ہیں ان سے اس تدریجی اقتضار کا حال پوری طرح واضح ہو سکتا ہے۔

ہر چند جس زمانہ میں جو مذہب ہوا ہے، اس نے بغیر کسی "اندیشۂ فردا" کے ہمیشہ یہی دعویٰ کیا کہ وہ ایک مکمل چیز ہے اور اس میں کسی اضافہ کی گنجایش نہیں، لیکن زمانہ نے ہمیشہ اس کے دعویٰ کو باطل کر کے دکھا دیا کہ دنیا کا کوئی قانون، کوئی شریعت، کوئی مذہب مستقبل کے حالات پر حاوی نہیں ہو سکتا اور انسان مجبور ہے کہ "حال" کے لحاظ سے اپنے اُصول زندگی میں تبدیلی پیدا کرتا رہے۔

اس سے شاید انکار ممکن نہ ہو کہ سب سے آخر میں مذہب اسلام کا ظہور ہوا اور گزشتہ ساڑھے تیرہ سو سال کے اندر کوئی تحریک اتنی قوی اور ایسی منظم رونما نہیں ہوئی جسے ہم "مذہب" کے لفظ سے موسوم کر سکیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب صرف یہ ہو کہ اس دوران میں مذہب انسانی نے اتنی ترقی کر لی ہو کہ وہ مذہب کے وجود کو ضروری نہ سمجھتی ہو، لیکن مسلمانوں کا یہ دعویٰ بھی بالکل لغو و مہمل قرار نہیں دیا جا سکتا کہ ان کا مذہب اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اتنی مکمل چیز ہے کہ وہ ہر زمانہ کا ساتھ دے سکتا ہے اور اس میں اتنی اہلیت موجود ہے کہ اگر دنیا چاہے تو اسے ایک عالمگیر سماجی قانون کی حیثیت سے اختیار کر سکتی ہے۔ یہ تو ہوئی وہ بات جس کا یقین دوسرے کو صرف اسی وقت آسکتا ہے جب خود براہ راست تعلیم اسلام کا مطالعہ کرے اور مذہبی لٹریچر کے اس حشو و زواید کو نظر انداز کر دے جس نے اسلام کے چہرہ کو تو بر تو نقابات کے اندر چھپا رکھا ہے۔ لیکن یوں بھی ہر شخص تاریخ اسلام کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد معلوم کر سکتا ہے کہ جتنی جلد اور جسقدر وسعت اسلام نے حاصل کی، اتنی کسی اور مذہب کو اتنے تھوڑے زمانہ میں نصیب نہ ہوئی۔ پھر اجتماعی ترقی کے تمام اور نفسیاتی رموز و غوامض کو جانے دیجئے، لیکن اس بات کے تسلیم کرنے میں تو کسی حجت و برہان کی ضرورت نہیں کہ کسی قوم کا یہ استعلاء و استیلا بغیر غیر معمولی جوش عمل اور ہم آہنگی کے ناممکن ہے۔

میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو صحیح اسلام کی عمر ۳۲ھ پر ختم سمجھتے ہیں اور بنو امیہ و بنو عباس کے دور ملوکیت کو مذہبی ترقی سے علحدہ کوئی اور چیز قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ اگر فتوحات ملکی محض اس لئے کہ ان کا تعلق دنیا سے ہے، خلاف مذہب قرار دیجائیں تو خود رسول اللہ اور خلفاء کے زمانہ کی فتوحات کی نسبت کیا کہا جائے گا۔ الغرض میرے نزدیک حکومت و ملک گیری قطعاً روح اسلام کے منافی نہ تھی، لیکن رسول اللہ کی رحلت کے بعد ہی ایک اور چیز ضرور نئی پیدا ہوئی جو یقیناً بہت خراب تھی۔ اتنی خراب کہ آخر کار اس نے اسلام اور اہل اسلام کو تباہ کر کے رکھدیا۔ وہ چیز کیا تھی؟ ——— **مولویت** ——— آپ کہیں گے اور غالباً ہنسیں بھی کہ دنیا کی

ہر بُری چیز کو "مولویت" سے تعبیر کرتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ مذہب کی دنیا میں وہ چیز جسے "Priesthood" کہتے ہیں اور جس کے کارنامے ہر مذہب اور ہر زمانہ میں حد درجہ تاریک رہے ہیں سوائے مولویت کے اور کس لفظ سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

"مولویت" نام جزئیات مذہب سے آگاہی کا نہیں ہے اور نہ اس کا تعلق مہارت علوم و فنون سے ہے بلکہ وہ عبارت ہے اس مخصوص ذہنیت سے جو سوائے اپنے تمام دنیا پر عقل و فہم کا دروازہ بند کر دیتی ہے اور لوگوں کے ذہن و فراست پر قفل ڈال کر مذہبیت کے بہانہ سے اپنے بدترین اغراض نفسانی پورا کرنے میں تامل نہیں کرتی۔ یہ ایک عظیم بلا ہے جس نے ابتداء عہد اسلام سے لیکر تا ایندم بیشمار ہلاکتیں دنیا میں پھیلائیں جن میں سب سے بڑی ہلاکت اجتماع قومی کے شیرازہ کو منتشر کرنا، بھائی کو بھائی سے لڑانا اور گوشت سے ناخن کو جدا کرنا ہے۔ چنانچہ حنبلی، مالکی، شافعی، حنفی مسالک کی تفریق، اشاعرہ و معتزلہ کی تقسیم، اہلِ قرآن و اہلِ حدیث کا باہمی اختلاف، شیعہ سُنّی کی جنگ اور اسی طرح کے اور بہت سے فتنے اسی "مولویت" کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ آیندہ اور کتنا زہر اسے پھیلانا ہے۔

اسلام کی وہ خصوصیت جو یقیناً دنیا میں کسی اور مذہب کو حاصل نہیں ہے اور جس کا اعتراف ہر صاحب فکر نے کیا ہے، صرف یہ ہے کہ وہ کوئی خیالی چیز نہیں ہے جس کی بنیاد صرف فلسفہ کی ہفوات پر قائم ہو بلکہ وہ یکسر حرکت و عمل ہے اور اس قدر سادہ و آسان کہ مسلمان ہونے کے معنی ہی "صرف ایک صلح جو متمدن انسان" ہونے کے ہیں۔ لیکن "زمانۂ مولویت خراب" اس نے اسلام کی جو راہ متعین کر رکھی ہے وہ اس قدر دشوار گزار ہے کہ ایک ذی عقل و ہوش انسان دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن مسلمان کبھی نہیں بن سکتا۔ کیونکہ ان "مفتیان شرع متین" کی مرضی کے مطابق کوئی شخص مسلمان ہو ہی نہیں سکتا، جب تک وہ پہلے عقل و فراست کو خیرباد نہ کہدے۔ اور ظاہر ہے کہ اتنی بڑی قربانی کے لئے ہر شخص اتنی بڑی داڑھی کہاں سے لا سکتا ہے۔

اس جماعت کا سب سے بڑا حربہ، "حربۂ تکفیر" ہے، جو اس سے قبل (اس لئے کہ لوگ زیادہ جاہل تھے) واقعی کوئی اہمیت رکھتا بھی تھا، لیکن اب اس کی حیثیت بالکل ایسی ہی رہ گئی ہے جیسے آپ کسی متمرد گداگر کے سوال کو پورا نہ کریں اور وہ اُلٹ کر گالی دے بیٹھے۔ حال ہی میں ایک نہایت دلچسپ "منظر تکفیر" بعض علماء دیوبند کی طرف سے پیش کیا گیا ہے جس کو دیکھ کر ممکن ہے بعض لوگوں کو افسوس ہوا ہو، لیکن مجھے بہت مسرت ہوئی کیونکہ "ادارۂ دیوبند" کی قبر اس سے زیادہ گہری کھودی جانی ممکن نہ تھی۔

سرائے میر (اعظم گڑھ) میں تقریباً ربع صدی سے مدرسۃ الاصلاح کے نام سے ایک مدرسہ قائم ہے جس کا

مقصد زیادہ تر "علوم قرآنیہ" کی تعلیم اور انھیں کی تحقیق و تفتیش ہے۔ اس کے بانی مولانا حمید الدین اور روحِ رواں مولانا شبلی تھے۔ چونکہ اس کے کارکن نیک نیت ہیں اس لئے اس نے کافی ترقی حاصل کرلی۔ وہیں سرائے میر میں مولویوں کی ایک دوسری جماعت کو اس مدرسہ سے کچھ "یوسف ثانی و اتحوال" آئی اور انھوں نے جواب میں دوسرا مدرسہ قایم کرکے یہ "روٹی کا ٹکڑا" چھین لینا چاہا۔ حالانکہ مدرسۃ الاصلاح کے کارکن اور مدرسہ جن حالات کے ماتحت اس درسگاہ کو چلا رہے ہیں وہ فاقہ کشی اور دشت پیمائی سے کم نہیں ہے لیکن "نانِ شافی" کی "ریزہ چیں" فطرت اس حقیقت کو کیوں سمجھنے لگی تھی۔ اس نے فوراً ہی جنگ [illegible] کردیا اور آخرکار وہی ایک حربۂ تکفیر جس سے غریب مولوی ہمیشہ کام لیا کرتا ہے اس جنگ میں بھی استعمال کیا گیا۔

اسباب تکفیر یہ بتائے گئے کہ اس مدرسہ میں مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کے خیالات کی اشاعت ہوتی ہے جو کافر تھے۔ مولانا شبلی اس لئے کہ وہ "الکلام" اور "علم الکلام" کے مصنف [illegible] اور [illegible] حمید الدین اس لئے کہ وہ قرآن پاک کی شرح و تفسیر میں اکابر سلف کی تقلید سے کہیں کہیں ہٹ جاتے ہیں۔

استفتا شایع کیا جاتا ہے اور اس پر [illegible] علمائے کرام فتویٰ دیتے ہیں کہ شبلی و حمید الدین کافر تھے اور وہ لوگ بھی کافر ہیں جو ان کے خیالات کی اشاعت کرتے ہیں۔

ان فتوے دینے والوں میں مولوی اشرف علی تھانوی [illegible] مولوی [illegible] تک شامل ہیں جنھوں نے "جواب صحیح" لکھ کر اپنی علمیت کا [illegible] اور [illegible] اس فتوے کی تصدیق میں متفق ہیں جیسے "ظفر احمد عفا اللہ عنہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون [illegible]" "قلم احقر" نے اصدار کیا ہے۔

ٹھیک اسی زمانہ میں جب سرائے میر [illegible] مولوی حسین احمد صاحب دیوبندی سرائے میر آئے اور وہ بھی اس فتوے کو دیکھ کر مدرسۃ الاصلاح کے کارکنوں کی طرف سے بدظن ہو گئے لیکن بعد کو جب ان کے سوالات کے جواب میں مدرسہ والوں نے سب کچھ وہی لکھ دیا جو مولوی حسین احمد صاحب سننا پسند کرتے تھے تو انھوں نے پھر ان کے مسلمان ہونے پر مہر توثیق ثبت کردی، لیکن مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کی طرف سے ابتک ان مولویوں کے دل صاف نہیں ہوئے اور ہونا بھی نہیں چاہئے کیونکہ یہ دونوں بزرگ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اور ظاہر ہے کہ اپنی قوت ایمان دکھانے کے لئے اس سے بہتر موقعہ انھیں اور کہاں مل سکتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا شبلی پر جو الزامات الحاد و زندقہ کے لگائے گئے ہیں وہ یکسر بے بنیاد ہیں کیونکہ علم الکلام کی جن عبارتوں کو موردِ کفر قرار دیا جاتا ہے ان کا تعلق خود مولانا شبلی کے اعتقادات سے نہیں ہے بلکہ ان متکلمین کے عقاید سے ہے جن کا ذکر مولانا شبلی نے کیا ہے، لیکن مخالفت جاہلانہ نے حد درجہ دیدہ کاری و

تلبیس سے کام لیکر ان کو مولانا شبلی سے منسوب کردیا۔ اسی طرح مولانا حمید الدین مرحوم کے جو نوٹ متعلق تفسیر رسالہ اصلاح میں شایع ہوئے ہیں وہ بھی نامکمل و ناتمام ہیں اور ان کی بنیاد پر ان کے عقاید سے بحث کرنا کسی طرح مناسب نہ تھا لیکن اگر اس رواداراتہ نقطۂ نظر کا خیال نہ رکھا جائے تو بھی مولانا حمید الدین کا صرف اتنا قصور ہے کہ تقسیم سور، رکوعوں کے نام اور پاروں کی تفریق میں وہ اسلاف کی رائے سے کچھ ہٹے ہوئے ہیں اور اگر کلام پاک کے سمجھنے میں کسی کو رائے کی اتنی آزادی بھی حاصل نہیں ہے تو پھر اسلام خدا اور رسول کا تو نہ ہوا بلکہ صرف مولف شرح مقاصد کا ہوا، شارح فقہ اکبر کا ہوا، ابن حجر اور صاحب نبراس کا ہوا، ابن حزم اور سیوطی کا ہوا جن کے استدلات پر مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کو کافر قرار دیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سرائے میر میں جو کچھ ہوا اس کو مذہبیت اور للہیت سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا، بلکہ اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ لوگ مدرستہ الاصلاح کی طرف سے بدظن ہوکر اس کی امداد ترک کردیں اور دوسرے مدرسہ کے مولویوں کی جھولیاں بھریں۔ یہ ہے ہمارے علمار کرام کی ذہنیت اور یہ ہیں وہ ذلیل تدابیر جن سے وہ اپنا پیٹ پالنا چاہتے ہیں۔

مدح صحابہ

چند دنوں سے لکھنؤ میں عجیب ہنگامہ برپا ہے۔ ہر جمعہ کو ٹیلہ کی مسجد پر سنیوں کا اجتماع ہوتا ہے اور بعد نماز وہاں سے ایک جماعت مدحِ صحابہ پڑھتی ہوئی نکلتی ہے اور گرفتار ہوجاتی ہے لکھنؤ کے بعض حصوں میں جہاں شیعی آبادی زیادہ پائی جاتی ہے بالاعلان مدح صحابہ پڑھنا ممنوع ہے کیونکہ اس سے بارہا فساد پیدا ہوچکا ہے۔ لیکن کبھی کبھی وہ حضرات جن کی اہمیت صرف فساد انگیزی ہی پر قایم ہے سنیوں کو بھڑکا کر قانون شکنی پر آمادہ کردیتے ہیں اور چند دن یہ ہنگامہ رہکر پھر خاموشی طاری ہوجاتی ہے۔

ہر چند آزاد شہری ہونے کے لحاظ سے سنیوں کو یہ حق پہونچتا ہے کہ جس طرح شہر میں بہت سے میلے ہوتے رہتے ہیں، جس طرح روزانہ قوالیوں میں اجتماع ہوتا رہتا ہے، جس طرح روزبارات وغیرہ کے جلوس نکلتے رہتے ہیں، بالکل اسی طرح وہ چار یاری جھنڈا لیکر مدح صحابہ گاتے بجاتے نکلیں، لیکن مذہبی نقطۂ نظر سے مدح صحابہ کا اعلان اسقدر ضروری سمجھنا کہ حکومت کی مانعت کو مداخلت فی الدین قرار دیا جائے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔

اسوقت تک میں یہ سمجھتا تھا کہ سنیوں کی اس حرکت کے ذمہ دار صرف بعض جاہل و متعصب افراد ہیں اور علمار کا دخل اس میں بالکل نہیں ہے لیکن حال ہی میں مولانا حسین احمد صاحب دیوبندی کا یہ بیان پڑھکر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ چار یاری جھنڈا اٹھانے اور مدحِ صحابہ کے اعلان سے باز رکھنا مداخلت فی الدین ہے اور ہر مسلمان (سنی) کا فرض ہے کہ وہ قانون شکنی کرے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ خود مولانا موصوف پر بھی بحیثیت

سنی ہونے کے یہ فرض عاید ہوتا ہے یا نہیں، لیکن اتنا تو بالکل یقینی طور پر معلوم ہے کہ اس وقت تک نہ وہ خود چار یاری جھنڈا لیکر کبھی باہر نکلے اور نہ ایسے جلوس کی قیادت انھوں نے کی۔

یقیناً شیعوں کے اس طرزِ عمل کو میں پسند نہیں کرتا کہ اگر کوئی شخص ان کے سامنے سے مدحِ صحابہ پڑھتا ہوا نکلے تو وہ مشتعل ہو جائیں، کیونکہ کسی کو اچھا کہنا اتنا مکروہ فعل نہیں ہے جتنا کسی کو بُرا کہنا، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ ذہنیت صرف جاہل طبقہ کی ہے اور اہل علم شیعی اس میں شریک نہیں ہیں۔ لیکن اگر رفع فساد کی غرض سے کسی مخصوص حصۂ شہر میں حکومت نے اس کی ممانعت کر دی ہے تو اس کے خلاف سنیوں کا اصرار بھی کم نامعقول بات نہیں ہے۔

اگر حکومت کا ہاتھ بیچ میں نہ ہوتا تو بھی سنیوں کا اخلاقی فرض ہونا چاہئے تھا کہ وہ شہر کی کسی جماعت کے احساس کو صدمہ پہونچائیں چہ جائیکہ وہ جماعت جو بہرحال دائرۂ اسلام میں داخل ہے اور جن سے تمدن و معاشرت کے تعلقات قطع نہیں ہو سکتے۔ پھر اگر اسی کے ساتھ سنیوں کو یقین ہو کہ وہ اس ہنگامہ سے حکومت یا اس کے قانون کو شکست دے سکیں گے تو بھی خیر کوئی حرج نہیں، لیکن جب صورت حال یہ نہیں ہے تو خواہ مخواہ رُسوا ہونے سے فایدہ۔ مسجد شہید گنج کے باب میں ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے کونسی کامیابی حاصل کر لی ہے کہ چار یاری جھنڈا اُٹھانے میں لکھنؤ کے سُنّی کامیاب ہو جائیں گے۔

مذہب کی اصل روح متانت و سنجیدگی ہے نہ کہ سوقیت اور بازاری پن۔ کاش مدحِ صحابہ کے اعلان کو فرض قرار دینے والے سنی سمجھتے کہ جس چھچھورے پن سے وہ اس فرض کو ادا کر رہے ہیں اس سے وہ نہ صرف صحابہ بلکہ خود اسلام و تعلیم اسلام کی توہین کر رہے ہیں اور اگر خلفاء جن کے نام کا جھنڈا اُٹھایا جاتا ہے آج زندہ ہوتے تو وہ بھی ان طفلانہ حرکات کو دیکھ کر ایسے دوستوں سے پناہ مانگنے پر مجبور ہو جاتے۔

ہنگامۂ اسپین اسوقت یوروپ کی سیاسی فضا کا بالکل وہی حال ہے جیسے کسی گولہ کے فلیتہ کو آگ دیدیجائے اور اس کا پھوٹ پڑنا صرف چند لمحوں کی بات ہو۔ مغرب گویا ایک آتش فشاں پہاڑ ہے جس سے دھواں غلیظ تر ہوتا جا رہا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کس وقت اس کا آتشین مادہ اُبل پڑے۔

عہدنامے پر عہدنامے ہو رہے ہیں، کانفرنسوں پر کانفرنسیں منعقد ہو رہی ہیں، قیام امن و سکون کے لئے تخفیف اسلحہ اور متحدہ ٹریبونل قائم کرنے کی کوششیں جاری ہیں، لیکن بے اعتمادی و بے اعتباری کا یہ عالم ہے کہ ٹھیک اُسی وقت جب زبان سے امن و سکون کے الفاظ جاری ہوتے ہیں، دل دھڑکتا ہوتا ہے اور ذہن اس یقین سے معمور کہ جنگ ہونا ضروری اور موجودہ نظام عالم کا تباہ و برباد ہو جانا اٹل ہے۔ پھر آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ایک ملک دوسرے ملک کی طرف سے اتنا خائف نہیں ہے

جتنا خود اپنی آبادی سے اور یورپ کی قومی سی قومی سلطنت کا جنگ کے نام سے لرزہ براندام ہوجانا اس لئے نہیں ہے کہ اسباب حرب کی اس کے پاس کمی ہے بلکہ صرف اس لئے کہ اب اگر کسی سلطنت نے جنگ کی تو خود اندرون ملک میں سول وار کا چھڑ جانا اور انقلاب حکومت ضروری ہے ۔ ممکن ہے بعض حضرات اسے سرمایہ داری کا صرف "اندیشہ بیجا" قرار دیں لیکن سرمایہ دارانہ اصول پر حکومت کرنیوالی قوموں کے دلوں پر ہاتھ رکھکر دیکھئے کہ ان کا کیا حال ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جرمنی کی نازی حکومت اور اطالیہ کی فاسسٹ جماعت تحریک اشتراکیت کی سخت مخالف ہے لیکن سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ دور ملوکیت ختم ہونے کے بعد اگر دنیا کسی چیز سے مطمئن ہوسکتی ہے تو وہ صرف جمہوریت و اشتراکیت ہے اور جس چیز کو ڈکٹیٹرشپ سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ صرف ایک درمیانی منزل ہے جس سے جلد یا بدیر گزر جانا بالکل یقینی امر ہے۔

اسپین میں دور ملوکیت عرصہ ہوا ختم ہوچکا ہے اور اس دوران میں مختلف پارٹیوں کے عروج و زوال کے بعد کچھ عرصہ سے اشتراکی جماعت برسر اقتدار تھی۔ لیکن چونکہ جرمنی اور اطالیہ دونوں کا نازی و فاسسٹی پروپاگنڈا بھی ملک میں برابر جاری تھا اس لئے فوج کا ایک حصہ اشتراکی جماعت کا مخالف ہوگیا اور اس نے بغاوت شروع کردی۔

اب حالت یہ ہے کہ باغی جماعت کو اطالیہ و جرمنی کی طرف سے خفیہ مدد پہونچ رہی ہے اور حکومت کو روس و فرانس کی طرف سے ۔ واقعات کا رخ بتاتا ہے کہ باغیوں کو کامیابی حاصل ہوگی اور وہاں فاسسٹی حکومت قایم ہوجائے گی۔ لیکن یہ بات یہیں تک پہونچکر ختم نہ ہوجائے گی بلکہ اور آگے بڑھے گی کیونکہ اسپین میں فاسسٹی اقتدار قایم ہونے کے معنے صرف یہ ہیں کہ جرمنی کی قوت فرانس کے خلاف بہت زیادہ بڑھ جائے اور فرانس جرمنی کے ساتھ معاملہ کرنے پر مجبور ہو جسے برطانیہ کبھی پسند نہیں کرسکتا۔ پس اسپین کا یہ ہنگامہ کوئی معمولی آگ نہیں ہے جو کسی مخصوص ملک تک محدود رہے۔ عجب نہیں اس کے شعلے کسی عالمگیر جنگ کا مقدمہ ہوں اور یہی فاسسٹی اقتدار، سرمایہ داری کے خلاف ایک عام ہیجان دنیا کے اندر پیدا کردے۔

بہرحال اگر یہ صورت پیدا ہوجائے تو ہندوستان کے لئے موقعہ ہوگا کہ وہ حکومت برطانیہ سے اپنے جایز مطالبات کا سودا کرے اور بالکل ممکن ہے کہ برطانیہ اور ہندوستان دونوں کیلئے یہ سودا مفید ثابت ہو۔

آسکر وائلڈ کے متعلق چند انتقادی مذاکرات

پرسیول پولارڈ لکھتا ہے :- ۱۹۰۵ء میں مجھے برلن جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک دن گھومتے گھومتے کسی کتب فروش کی دوکان کی طرف جا نکلا۔ وہاں مجھے آسکر وائلڈ کے باب میں ایک مختصر سی کتاب ملی جس میں دو فرانسیسی اور ایک جرمن ادیب نے اُس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ جرمن تھیٹر پر ہر ملک کے ادب کا اثر پڑا ہے لیکن اُسکر وائلڈ سے زیادہ وہاں کسی کی قدر نہیں کی جاتی۔ وہاں دوسری زبانوں کے ڈرامے بھی کھیلے جاتے ہیں مگر اُسکر وائلڈ کا "سالومی" سب سے زیادہ ہر دلعزیز ہے اور صرف یہی نہیں کہ جرمن تھیٹر ہی وائلڈ کا شیدائی ہو بلکہ تمام جرمن ادیبوں پر اُسکر وائلڈ کی طرز نگارش کا اثر پڑا اور رفتہ رفتہ یہ اثر جرمنی ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ یورپ کے تمام ممالک میں پھیل گیا۔

برلن میں وائلڈ کے دوسرے ڈرامے مثلاً (An Ideal husband) وغیرہ بھی تھیٹروں میں کھیلے جانے لگے اور دوسرے ملکوں میں بھی وہاں کے انشا پردازوں نے وائلڈ کو اپنے ملک سے روشناس کرانا شروع کردیا، چنانچہ وائنا (آسٹریا) میں اس کی تمام تصنیفات کا ایک ایڈیشن شائع ہوا۔ فلورنس (اٹلی) میں لیونارڈو وازارٹا نے اس کی (De Profundis) کے محاسن کو اپنے ہموطنوں پر ظاہر کیا اور میڈرڈ (اسپین) میں گومز کرلو نے سالومی کے مصنف کی عظیم الشان اور دلکش شخصیت کو پیش کیا۔

کرلو لکھتا ہے کہ "سالومی" کی تصنیف کے بعد آسکر وائلڈ کے دماغ میں ہر وقت "سالومی" ہی کے رقص کی تصویر رہا کرتی تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ وہ مجھ سے کہنے لگا "تم میڈرڈ کے باشندے ہو؟ میں صرف اس وجہ سے اسپین جانا چاہتا ہوں کہ وہاں پریڈو ٹیٹین کی سالومی دیکھ سکوں جس کے بارہ میں تھٹار ڈ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ یہ وہ آدمی ہے جو مرتعش جسم کی مصوری کرتا ہے"۔

وائلڈ کا کوئی دن ایسا نہیں ہوتا تھا جب وہ مجھ سے "سالومی" کی باتیں نہ کرے۔ ایک دفعہ اُس نے مجھ سے سڑک پر چلتے چلتے کہا "کیا تمہارا یہ خیال نہیں کہ وہ بالکل عریانی کی حالت میں [illegible] وہ بہتر معلوم ہوتی ہے؟" (اسوقت بھی وہ سالومی ہی کی باتیں کر رہا تھا)۔ اس کے بعد اُس نے کہا "ہاں - بالکل عریاں! - مگر جواہرات سے مرصع!

وہ جواہرات جو اُس کے بالوں، اُس کی کلائیوں، اُس کے بازوؤں اور اُس کے گلے اور اُس کے سُرین کے چاروں طرف لٹک رہے ہوں اور اپنی تابش بے محاباسے اُس معصیت پرور جسم کی بے عصمتی کو اور زیادہ تابناک بنا رہے ہوں! میں کبھی ایسی سالومی کی نسبت جو کچھ نہ جانتی ہو، کچھ نہیں غلنا چاہتا۔ نہیں نہیں۔ سالومی جانتی ہے ۔۔۔"

بعض وقت تو وہ سالومی کے بارہ میں اس قسم کے خیالات ظاہر کرتا اور بعض وقت اُس کی "سالومی" عصمت کی دیوی ہو جاتی تھی ایک مرتبہ وائلڈ مجھ سے ایک شاہزادی کی نسبت جس نے ہیراڈ کے سامنے رقص کیا تھا کہنے لگا۔ "اُس کا تھرتھراتا ہوا جسم دراز ہے اور نیلوفر کی طرح زرد اُس کے حُسن میں جوشِ مستی کا نام نہیں۔ فرشتوں کی بُنی ہوئی نقابیں اُس کے نازک جسم کو چھپائے ہوئے تھیں اور اُس کے سنہرے بال پگھلے ہوئے سونے کی طرح اُسکے شانوں پر پڑے ہوئے تھے۔۔۔"

ایک مرتبہ ایک سر بریدہ عورت کی تصویر دیکھ کر وائلڈ کہنے لگا۔ "دیکھو۔ یہ تو سالومی ہے!" پھر یکایک اُسے ایک شاہزادی کا خیال آگیا جس نے اپنے عاشق کی خاطر ایک شخص جان، کا سر کاٹ لیا اور پھر یہ خیال کر کے کہ اُسکی اس حرکت سے اُس کا عاشق نفرت کی نگاہ سے دیکھیگا اُس نے اپنا سر بھی اُس کے پاس بھیجدیا۔ یہ خیال آتے ہی وہ کہنے لگا "یہ بالکل اُسی طرح کی تصویر ہے۔ بوسری (Boissere) نے نوبیا کی ایک روایت کی تحقیق کی ہے جسمیں ایک نوجوان فلاسفر کا قصہ درج ہے۔ اس نوجوان کے سامنے ایک یہودی شاہزادی نے ایک ولی اللہ کا سر کاٹ کر پیش کیا۔ اس پر نوجوان نے اُس سے سکرا کر کہا 'پیاری، مجھے تمہارا سر اپنے پاس رکھنے کی خواہش تھی' یہ سنکر وہ غمزدہ ہو کر چلی گئی اور اُسی شام کو ایک غلام نوجوان فلاسفر کے پاس سونے کے طشت میں اُس کی معشوقہ کا سر لایا۔ فلاسفر نے یہ دیکھ کر کہا "یہ سب خون کیوں بہایا گیا؟ اور یہ کہکر افلاطون کی کتابیں دیکھنے لگا۔ اب بتاؤ کیا تمھارا یہ خیال نہیں ہے کہ یہ سالومی ہے؟"

وائلڈ نے سب سے پہلے اس روایت کو ایک افسانہ کی صورت میں پیش کرنا چاہا جس کا نام اس نے (Das Madchen ohne Seele) رکھا تھا مگر اُسے پھاڑ ڈالا، پھر نظم کرنے کا خیال کیا مگر وہ بھی ترک کر دیا اس کے بعد ڈرامہ لکھا مگر اُس کے خوابوں کی رقاصہ شہزادی کی تصویر گسٹیو موریو (Gustave Moreau) نے ہی پیش کی اکثر اوقات وائلڈ، ہوئسمین (Huysmans) کے یہ الفاظ دہرایا کرتا تھا کہ" وہ تقریبًا بالکل عریاں ہے۔ رقص کے جھونکے میں نقاب ڈھیلی ہو جاتی ہے، شال زمین پر گر پڑتی ہے اور صرف جواہرات ہی اُس کے بدن کا لباس رہجاتے ہیں ایک بہت چھوٹا سا پٹکا اُس کے سرین پر رہ گیا ہے اور اُس کے سینوں کے درمیان ایک ہیرا ستارے کی طرح چمک رہا ہے ۔۔۔" پانچ برس کے بعد جب وائلڈ جیل خانہ میں مصائب کے دن گزار رہا تھا اُس کے منہ سے یہی آخر کا جملہ نکلا کرتا تھا۔

وائلڈ کے مرنے کے ایک ماہ بعد جنوری ۱۹۰۱ء میں میں نے ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا " وائلڈ بحیثیت ایک مصور کے " اور اب میں دیکھ رہا ہوں کہ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں وائلڈ مقبول نہ ہو۔ بعض لوگ یہ خیال کر سکتے ہیں کہ وائلڈ کے حقیقت آموز کلیات اس قدر مشہور ہو چکے تھے کہ وہ اور زیادہ عمق میں جانا پسند نہیں کرتا تھا مگر جن لوگوں نے اُس کی نظم " ہلاس " دیکھی ہے وہ سمجھ جائیں گے کہ وائلڈ کی حقیقت کو لوگ نہیں پہچان سکے ہیں۔ " ہلاس " میں وائلڈ کی اصلی تصویر آخر سامنے آ ہی گئی — وائلڈ نے جن خیالات کا اس سانٹ میں اظہار کیا تھا اُسی قسم کا اُس نے خطوں میں اظہار کیا ہے جو اُس نے قید خانہ سے اپنے دوست مسٹر راس کے نام لکھے تھے اور جن کا مجموعہ " ڈی پروفنڈس " کے نام سے شائع ہوا ہے۔ وائلڈ کی یہ کتاب اُسکے قید خانہ کی زندگی بلکہ اُس کی روح کی ٹریجڈی ہے۔ جن لوگوں نے " ڈی پروفنڈس " میں وائلڈ کے عزائم پڑھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وائلڈ کی قید خانہ کے بعد والی زندگی وہ زندگی نہ تھی جس کی نسبت وائلڈ اپنے قید خانہ کے خطوط میں اظہار خیال کرتا تھا۔ بہر حال یہ کتاب اُسی قید خانہ کے بعد والی زندگی سے متعلق ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان بیانات میں بعض جگہ اختلاف ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ جیونس (jeunesse) وغیرہ نے جو کچھ لکھا ہو وہ قابل قدر ہے۔

اب یہاں پر ان لوگوں کا بھی مختصر طریقہ سے تذکرہ کر دینا مناسب ہوگا جن کے مقالات انتقادی پیش کئے جا رہے ہیں۔ ایم لاجیونس (M. la jeunesse) فرانس کے نوجوان ادیبوں میں سب سے مشہور ظرافت نگار ہے۔ اُس نے زولا (Zola) بورجٹ (Bourget) اور اناطول فرانس (Anatole France) وغیرہ پر سخت تنقید کی ہے۔ ہر فرانز بلی (Her Franz Blei) مشہور جرمن رسالہ ڈائی انسل (Die Insel) کے ادارہ میں کام کر چکا ہے۔ اُس نے والٹر پیٹر آرتھر سیمیسن وغیرہ کے اکثر مضامین کا جرمنی میں ترجمہ کیا ہے۔ ایم گائڈ (M. Gide) کے متعلق زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکیں اُس کے مضمون میں جس 'ڈی' کا تذکرہ ہے اُس سے لارڈ الفرڈ ڈگلس مراد ہیں جنہوں نے اولیو کانسٹینس سے شادی کی ہے اور جن کا سالوی کا انگریزی ترجمہ حال میں شائع ہو چکا ہے۔

جس ہوٹل والے کا ذکر ہے وہ ابھی تک ان کمروں کی حفاظت کرتا ہے جن میں وائلڈ مرا تھا اور اس سے اسے کچھ فایدہ بھی ہو جاتا ہے۔

اینڈرے گائڈ کی یادداشت

جن لوگوں نے وائلڈ سے اُس کی عمر کے آخری حصہ میں ملاقات کی ہے وہ اس حیرت انگیز شخصیت سے اچھی طرح واقف نہیں ہو سکے ہیں میری اور اُسکی سب سے پہلے ۱۸۹۱ء میں ملاقات ہوئی اُس زمانہ میں وائلڈ کو (بقول تھیکرے) سب سے بڑی لیاقت یعنی کامیابی حاصل تھی اُسکے حرکات اور اُسکی صورت سے تحمندی ٹپکتی تھی اُسکی یہ کامیابی اتنی مکمل تھی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ آگے آگے ہو اور وائلڈ اُسکے پیچھے پیچھے

اس کی کتابوں کا ہر جگہ ذکر ہوتا تھا اور اس کے ڈرامے لندن کے متعدد تھیٹروں میں کھیلے جاتے تھے۔ وہ امیر تھا وہ مشہور تھا، وہ خوبصورت تھا اور اس کے قبضہ میں مسرت اور عزت دونوں چیزیں تھیں۔ کوئی اُسے ایک ایشیائی عیش پرست جانتا۔ کوئی اُسے قیصر روم سے تشبیہ دیتا اور کوئی اُسے حُسن کا دیوتا کہتا تھا۔

جب وہ پیرس آیا تو اُس کا نام ہر زبان پر تھا۔ لوگ اُس کے بارہ میں مہمل باتیں سنایا کرتے اور اُس کی نسبت یہ کہا جاتا کہ وہ سنہرے کاگ والے سگرٹ پیا کرتا ہے اور ہاتھ میں ایک پھول لے کر چلتا ہے۔ یہ باتیں اسوجہ سے مشہور ہوئیں کہ وائلڈ ہمیشہ ان لوگوں کو ملکہ دیتا رہا جو شہرت کو فیشن سمجھتے ہیں اور اس کی وجہ سے وائلڈ نے اپنے لئے ایک ایسا نقاب بنالیا جس سے اُس کے اصلی خط و خال کو کوئی نہیں دیکھ سکا۔

ایک دوست نے وائلڈ کو کھانے پر مدعو کیا۔ مہمان چار تھے مگر صرف وائلڈ ہی گفتگو کرتا رہا۔ وہ آہستگی، متانت اور نرم آواز میں باتیں کرتا اور فرانسیسی نہایت نفیس بولتا تھا۔ جب ہم لوگ رسٹوران سے اُٹھے تو میرے دوست تو الگ چلے گئے اور میں وائلڈ کے ساتھ ہولیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وائلڈ مجھ سے یکایک کہنے لگا۔ "میں تمھیں ایک قصہ سنا رہا ہوں مگر اسے بجائے کانوں کے آنکھوں سے سنو:-

"جب نارسیس مرگیا تو اُس کی مسرتوں کا چشمہ آب شیریں کے پیالہ کے بجائے تلخ آنسوؤں کا پیالہ بن گیا اور اوریڈ (Oreads) جنگل سے روتے ہوئے آئے تاکہ وہ چشمہ کے سامنے گائیں اور اُسے تسلی دیسکیں۔ اور جب انھوں نے یہ دیکھا کہ چشمہ میٹھے پانی کے بجائے نمکین آنسوؤں کا ایک پیالہ بن گیا ہے تو انھوں نے اپنے بالوں کی سبز لٹیں کھولدیں اور چشمہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ ہمیں کوئی تعجب نہیں اگر تو نارسیس کے لئے اس طرح رو رہا ہے، کیونکہ واقعی وہ بہت خوبصورت تھا۔

چشمہ نے دریافت کیا۔ "لیکن کیا نارسیس خوبصورت تھا؟"

اوریڈس نے جواب دیا "تم سے زیادہ بہتر اور کون جان سکتا ہے۔ ہماری طرف سے تو وہ ہمیشہ کے لئے کٹ کر چلا گیا تھا مگر تمھاری اُسے ہر وقت جستجو رہی۔ وہ تمھارے کنارے پر آکر لیٹا تھا، تم کو دیکھتا تھا اور تمھارے پانی کے آئینہ میں اپنے حسن کا عکس ڈالا کرتا تھا"

چشمہ نے جواب دیا۔ "مگر میں تو اس سے اس لئے محبت کرتا تھا کہ جب وہ میرے کنارہ پر آکر لیٹتا اور میری طرف دیکھتا تو میں اُس کی آنکھوں کے آئینہ میں اپنے حُسن کا عکس دیکھتا تھا"

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں وائلڈ دوسروں کے لئے ہمیشہ نقاب پوش بنا رہا کبھی ان کو دھوکا دینے کے لئے کبھی خوش کرنے کے لئے اور کبھی برہم کرنے کے لئے وہ کسی دوسرے کے خیالات کے پیچھے پڑتا تھا اور اگر وہ کسی صحبت میں تنہا نہیں چمک سکتا تھا تو الگ ہو جایا کرتا تھا۔ اس سے ملنے کا لطف حقیقتاً تنہائی میں تھا چنانچہ جب تنہائی ہوتی تو

وہ مجھ سے سوال کرتا۔

"کل سے تم نے کیا کام کیا ہ"

چونکہ اُس زمانہ میں مجھے کوئی خاص کام نہ تھا اس لئے میں جو کچھ بتاتا اُس سے اُس کو دلچسپی نہ ہوتی چنانچہ جب میں اُس سے کچھ بتاتا تو وہ پھر کہتا۔

"واقعی صرف یہی کیا؟"

میں کہتا۔ "واقعی اس کے علاوہ اور کوئی نئی بات نہیں کی"۔

وہ کہتا۔ "تو پھر اس کے بھی کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ تمہیں خود دیکھ لینا چاہئے کہ یہ سب کس قدر غیر دلچسپ ہو۔ دنیائیں دو ہیں۔ ایک تو وہ جس کے متعلق کوئی کچھ بھی نہیں کہتا۔ یہ حقیقی دُنیا ہے کیونکہ اُس کے وجود کو دیکھنے کے لئے کسی شخص کو اُس کی نسبت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسری دنیا آرٹ کی دنیا ہے۔ اُس کے متعلق گفتگو کرنا چاہئے کیونکہ بغیر اس قسم کی بات کئے اُس کا وجود ہی نہ باقی رہے گا۔

ایک زمانہ میں ایک آدمی تھا جسے اس کی کہانیوں کی وجہ سے اُس کے گاؤں والے بہت چاہتے تھے۔ اور صبح وہ گاؤں سے چلا جاتا اور جب شام کو واپس آتا تو گاؤں والے جو دن بھر محنت کرنے کی وجہ سے تھک چکے ہوتے اُس کے پاس آکر جمع ہوتے اور کہتے "بتاؤ! آج تم نے کیا کیا دیکھا؟" وہ ان سے کہنا شروع کرتا "میں نے ایک جنگلی دیوتا کو جنگل کے دیوتاؤں کے سامنے ناچتے دیکھا" لوگ پھر کہتے "اور کیا دیکھا بتاؤ!" وہ پھر شروع کرتا: "میں سمندر کے قریب گیا تو تین جل پریوں (بنات البحر) کو دیکھا جو اپنی ہری کاکلوں میں سنہری کنگھی کر رہی تھیں" چنانچہ لوگ اُس کی کہانیوں کی وجہ سے اُس سے محبت کرتے تھے۔

ایک دن وہ حسب معمول پھر گاؤں سے نکلا لیکن جیسے ہی وہ سمندر کے پاس پہونچا اُس نے تین جل پریوں کو اپنے بالوں میں سنہری کنگھی کرتے دیکھا۔ جب وہ آگے بڑھا۔ تو اُس نے جنگل میں ایک جنگلی دیوتا کو ناچنے والی جنگلی پریوں کے سامنے ساز بجاتے دیکھا۔ اس کے بعد جب وہ شام کو گاؤں واپس آیا اور ایک آدمی نے حسب معمول اُس سے کہا "بتاؤ۔ کیا دیکھ آئے" تو اُس نے جواب دیا کہ "کچھ نہیں"

اس کے بعد وائلڈ تھوڑی دیر رکا اور پھر کہنا شروع کیا!

"مجھے تمھارے لب پسند نہیں۔ وہ ایسے آدمی کے لب معلوم ہوتے ہیں جو کبھی جھوٹ نہ بولا ہو۔ میں تمہیں جھوٹ بولنا سکھا دوں گا تاکہ تمھارے ہونٹھ خوبصورت ہو جائیں۔

"تم جانتے ہو کہ آرٹ کیا ہے اور فطرت کیا، نیز یہ کہ ان میں فرق کیا ہے ؟ کیونکہ ایک پھول بھی اتنا ہی خوبصورت ہوتا ہے جتنا آرٹ کا ایک نمونہ۔ اس لئے ان میں خوبصورتی کا ہی کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اچھا تو ان دونوں میں کیونکر

متیاز ہو سکتا ہے ؟ - آرٹ کا کام ہمیشہ نادر الوجود ہوتا ہے اور فطرت جو کوئی مستقل چیز پیدا نہیں کرتی ہمیشہ اپنا ہی اعادہ کرتی رہتی ہے تاکہ جو کچھ وہ تخلیق کر چکی ہے وہ ضائع نہ ہونے پائے۔ نرگس کے پھول بہت سے ہوتے ہیں اس لئے وہ سب صرف ایک دن رہ سکتے ہیں۔ بہرحال فطرت جب کوئی نئی شکل بناتی ہے تو بار بار اس کی تکرار کرتی ہے۔ ایک سمندر اوپو یہ جانتا ہے کہ اُس کا ہم شبیہ کسی دوسرے سمندر میں ہے۔ جب خدا نے نیرو، برگیا، یا نپولین کو پیدا کیا تو یوں سمجھو کہ اس نے ویسے ہی دوسرے لوگوں کی جگہ پر کرنے کے لئے پیدا کیا تھا۔ ہرچند ہم ان دوسروں کو نہیں جانتے مگر اس سے ہمیں کیا سروکار۔ اہمیت صرف اس بات میں ہے کہ کامیابی ہوگئی کیونکہ خدا انسان کو حاصل کرتا ہے اور انسان آرٹ کے کام کو حاصل کرتا ہے۔"

وائلڈ سخت حُسن پرست تھا اور اسی لئے نہ انجیل اس کو پسند تھی اور نہ اُس کے معجزات اسے اچھے معلوم ہوتے تھے۔ اُسے مشرکوں کے عقاید اور ان کے دیوتا زیادہ محبوب تھے کیونکہ وہ ان عقاید اور ان دیوتاؤں میں بڑا حُسن محسوس کرتا تھا۔ ایک دفعہ اُس نے کہا کہ :-

"جب عیسیٰ ناصرہ واپس ہوئے تو وہ اتنا بدل گیا تھا کہ وہ شناخت نہ کرسکے، پہلے وہاں ہرطرف پریشانیاں ہی پریشانیاں تھیں۔ مگر اب انبساط و مسرت کی لہریں موجزن تھیں۔ جب حضرت شہر میں داخل ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ پھولوں سے لدے ہوئے غلام ایک سنگ مرمر کے مکان کے سفید زینوں پر جلدی جلدی چڑھ رہے ہیں۔ اسکے بعد وہ ایک مکان میں داخل ہوئے جس کے سنگ یشب کے کمرہ میں ایک شخص سنگ مرمر کے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے بالوں میں سُرخ گلاب لگے ہوئے تھے اور ہونٹ شراب کی وجہ سے سرخ ہو رہے تھے۔ حضرت اُس کے قریب پہونچے، اُس کے بازو چھوئے اور اُس سے کہا "تم اپنی زندگی اس طرح کیوں گزارتے ہو ؟" وہ آدمی گھوما اور حضرت کو پہچان کر بولا "میں ایک زمانہ میں مبروص تھا اور آپ نے مجھے اچھا کر دیا۔ اب میں اور کس طرح زندگی بسر کروں ؟"

"حضرت یہ سُنکر گھر سے نکل کر سڑک پر چلے آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ نے ایک ایسی عورت کو دیکھا جس کا چہرہ اور کپڑے رنگے ہوئے اور پاؤں جواہرات سے لدے ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے ایک اور نوجوان مثل ایک شکاری کے آہستہ آہستہ اور خاموش چلا جا رہا تھا۔ اُس کا کوٹ دو رنگ کا تھا اور اُس کی آنکھوں سے مستی ٹپک رہی تھی۔ مگر عورت کا چہرہ ایک دیوتا کے چہرہ کی طرح خوبصورت تھا۔ حضرت عیسیٰ نے نوجوان کا ہاتھ چھوا اور اُس سے کہا "تم اس عورت کو اس طرح سے کیوں گھور رہے ہو" وہ نوجوان پیچھے مڑا، حضرت عیسیٰ کو پہچانا اور کہنے لگا :-

"میں اندھا تھا۔ آپ نے مجھے بصارت بخشی۔ اب میں اور کیا چیز دیکھوں ؟"

اس کے بعد حضرت عورت کے قریب آئے اور اُس سے کہا۔ "جس راستہ پر تم چل رہی ہو وہ گناہ کا راستہ ہے

تم ادھر کیوں جا رہی ہو۔ عورت حضرت کو پہچان کر بولی "جس راستہ پر میں چل رہی ہوں وہ نہایت پرلطف راستہ ہے اور آپ نے تو میرے گناہ معاف کر دئے تھے"۔

" اس پر حضرت کا دل رنج سے بھر آیا اور آپ نے شہر سے چلا جانا چاہا۔ چنانچہ جب وہ شہر کے پھاٹک کے پاس آئے تو دیکھا کہ ایک نوجوان سڑک کے کنارے بیٹھا رو رہا ہے۔ حضرت اُس کے قریب آئے اور بالوں کو چھو کر پوچھا "تم رو کیوں رہے ہو؟"

" نوجوان نے ان کی طرف دیکھا اور انھیں پہچان کر کہا۔ میں مرگیا تھا مگر آپ نے مجھے زندہ کر دیا۔ اب میں رونے کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہوں"۔

ایک مرتبہ مجھ سے وائلڈ نے ایک رستوراں میں کہا۔ "تم سے ایک راز بتاؤں؟ تم جانتے ہو کہ حضرت عیسیٰ اپنی ماں سے کیوں محبت نہیں کرتے تھے؟" وہ اسوقت بہت آہستگی سے میرے کان میں باتیں کر رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اُسے بہت شرم آرہی ہے۔ اُس کے بعد تھوڑی دیر خاموش رہا اور پھر میرا بازو پکڑ کر یکایک مجھ سے کہا:-
" اس لئے کہ وہ دوشیزہ تھیں"۔

ایک دن مجھ سے وائلڈ نے ایک ریویو پڑھنے کو کہا جس میں کسی ناتجربہ کار نقاد نے اُسے اس چیز پر مبارکباد دی تھی کہ وہ اپنے خیالات کو نہایت عمدہ افسانوں کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ اس ریویو پر وائلڈ نے کہا:-
" لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ خیالات دنیا میں بالکل عریاں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ میں افسانوں کے علاوہ اور کسی طرح غور کر ہی نہیں سکتا۔ سنگتراش، اپنے خیالات سنگ مرمر میں منتقل نہیں کرتا بلکہ وہ اُس میں غور کرتا ہے"۔

وائلڈ سمجھتا تھا کہ آرٹ میں ایک قسم کی قسمت بھی شامل ہوتی ہے اور یہ کہ خیالات انسان سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ اُس نے کہا۔ "مصور دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو ہمارے سامنے جواب پیش کرتے ہیں اور دوسرے سوال اس لئے ہر مصور کو یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کس قسم کا مصور ہے کیونکہ جو شخص کوئی سوال کرتا ہے وہ، وہ نہیں ہوتا جو جواب دیتا ہے۔ آرٹ کے کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جن کے لئے منتظر رہنا پڑتا ہے اور ان کو کوئی شخص عرصہ تک نہیں سمجھ سکتا اس لئے کہ وہ ہمارے سامنے ایسے سوالوں کا جواب پیش کرتے ہیں جنھیں ابھی تک کسی نے اُٹھایا ہی نہیں اکثر و بیشتر سوال بجواب کے بہت دیر بعد کیا جاتا ہے"۔

وائلڈ نے ایک دن کہا:-
" روح جسم میں بڈھی بن کر آتی ہے اور اُسے نوجوان کرنے کے لئے جسم کو بڈھا ہونا پڑتا ہے۔ جس کا نام افلاطون ہے وہ حقیقتاً سقراط کی نوجوانی تھی"۔

اس کے بعد مجھ سے اور وائلڈ سے تین برس تک ملاقات نہیں ہوئی۔ اس اثنا میں ایک ڈرامہ نگار کی حیثیت سے اُس کی کامیابی کے ساتھ ساتھ یہ افواہیں بھی مشہور ہونا شروع ہوئیں کہ اُس میں عجیب و غریب خصلتیں ہیں۔ ان افواہوں پر بعض لوگ تو کسی قدر بے ہی کا مسکرا مسکرا کر اظہار کر دیتے تھے اور بعض کچھ نہ کہتے تھے۔ یہ بھی خبر اُڑی کہ وائلڈ خود ان باتوں کو راز میں نہیں رکھتا اور اُس کی بابت کھلم کھلا گفتگو کرتا ہے۔ مجھے یہ سن کر بہت تعجب ہوا کیونکہ مجھے اپنے دوران ملاقات میں اس قسم کا کوئی شبہ اس کے متعلق نہیں ہوا تھا۔ جنوری ۱۸۹۵ء میں اتفاق سے ہم دونوں کی پھر ملاقات ہو گئی۔ میں تبدیل آب و ہوا کی غرض سے نہیں بلکہ تنہائی حاصل کرنے کی غرض سے سفر پر روانہ ہوا اور الجیریا اور بلیدہ ہوتے ہوئے بسکرہ پہونچا۔ یہاں کے ہوٹل کے تختہ پر مسافروں کا نام لکھا دیکھا تو معلوم ہوا کہ وائلڈ بھی یہیں موجود ہے۔ اُس سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ گزشتہ تین برس کے اندر وائلڈ میں بہت فرق پیدا ہو گیا ہے۔ اُس کے چہرہ کی نرمی کم ہو گئی تھی، اُس کے قہقہہ میں سختی آ گئی تھی اور اُس کے رکھ رکھاؤ میں کچھ تصنع پایا جاتا تھا اور کامیابی کے لئے کم پریشان تھا۔ وہ اس وقت زیادہ ہمت ور اور اپنے اوپر زیادہ اعتماد کرنے والا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے دوران گفتگو میں مجھ سے کہا کہ:۔

"میں آرٹ سے بھاگ رہا ہوں اور صرف سورج کی پرستش کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ سورج ہر خیال سے کتنی نفرت کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ خیالات کی بے قدری کرتا ہے اور سایوں کی طرف بڑھتا ہے۔ ایک زمانہ میں "خیال" مصر میں رہتا تھا۔ مگر سورج نے مصر کو فتح کر لیا۔ یونان میں بھی "خیال" بہت عرصہ تک رہا مگر سورج نے اس پر بھی قبضہ کر لیا اس کے بعد اسنے یونان اٹلی اور فرانس کو بھی فتح کر لیا۔ آجکل "خیال" ناروے اور روس کی طرف بھیج دیا گیا ہے جہاں سورج کبھی چمکتا ہی نہیں۔ سورج آرٹ سے حسد کرتا ہے۔"

سورج کی پرستش سے اس نے زندگی کی پرستش مراد لی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ وائلڈ کی یہ پرستش زیادہ ہی ہوتی گئی۔ وہ کہتا تھا "میرا فرض یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو نہایت اچھے طریقے سے لطف اندوز کروں۔" ایک مرتبہ وائلڈ کو میں نے یہ بھی کہتے سنا۔۔۔ "مسرت نہیں، مسرت کے علاوہ ہر چیز! لیکن لطف۔ ہاں۔ لطف و انبساط! ہر شخص کو اُس چیز کی ضرورت ہونا چاہئیے جو سب سے زیادہ رنجدہ ہو۔"

الجیریا میں وہ خوب روپیہ بانٹتا پھرتا تھا چنانچہ ایک دن اُس نے کہا۔ "میں نے اس شہر کو اچھی طرح سے خراب کر دیا ہے۔" یہ باتیں دیکھ کر مجھے نہایت حیرت و استعجاب ہوا۔ میں اُس کی خراب صحت، اور اُسکے دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کو جانتا تھا اور معلوم تھا کہ اُس کی ظاہری شان و شوکت میں پژمردگی پوشیدہ ہے۔ ایک شام ایسا معلوم ہوا جیسے اُس نے یہ طے کر لیا ہے کہ وہ کوئی بات خلوص اور سنجیدگی کی نہ کہے گا۔ اُس کی گفتگو سے مجھے الجھن ہونے لگی، میں نے اُس سے کہا۔ "آپ کے ڈرامے اور کتابیں آپ کی باتوں سے زیادہ اچھی نہیں ہیں۔"

وائلڈ نے جواب دیا۔ "ہاں ڈرامے اچھے نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان میں کوئی چیز بھی اچھی نہیں ہے۔۔لیکن کاش تم یہ جان جاتے کہ وہ کس قدر دلچسپ ہیں ــــ ان میں سے اکثر شرط کا نتیجہ ہیں۔ ڈورین گرے کا بھی یہی حال ہے میں نے اُسے چند ہی روز میں لکھ لیا تھا کیونکہ میرے ایک دوست نے کہا تھا کہ میں ناول کبھی نہ لکھ سکونگا۔ یہ کہکر وہ میری طرف جھکا اور کہنے لگا۔" کیا تم میری زندگی کے زبردست ڈرامہ کے بارہ میں جاننا چاہتے ہو۔" میں نے اپنی زندگی کو اپنی عقل دیدی ہے اور اپنی تصنیفات کو اپنی قابلیت!"

وائلڈ کا ارادہ لندن واپس جانے کا تھا۔ مارکوئس۔۔۔اُس پر بھاگ جانے کا الزام لگا رہے تھے لیکن میں نے وائلڈ سے دریافت کیا کہ اُسے خبر بھی ہے کہ وہ لندن جاکر کن خطرات سے دوچار ہوگا، وائلڈ نے اس کے جواب میں کہا "یہ ایسی بات ہے جسے انسان کو بھی جاننا ہی نہ چاہئے۔ میرے بعض احباب بھی بہت دلچسپ ہیں۔ وہ مجھے ہوشیار رہنے کی نصیحت کرتے ہیں ــــ ہوشیار رہنے کی! مدعا یہ کہ مجھے فوراً واپس جانا چاہئے۔ کچھ نہ کچھ ہونا چاہئے ــــ کوئی چیز بالکل نئی!"

دوسرے دن وائلڈ لندن چلا گیا۔ بقیہ حال سب کو معلوم ہے۔ وہ "کوئی چیز بالکل نئی" قید سخت تھی! قید خانہ سے وہ فرانس آیا اور ڈیپی کے قریب ایک گاؤں بـ ــــ میں سبسٹین ملماتھ کے نام سے رہنے لگا۔ میں اُسے جس روز دیکھنے پہونچا تو معلوم ہوا کہ وہ ڈیپی گیا ہوا ہے۔ میں دن بھر اُس کا انتظار کرتا اور یہ سوچتا رہا کہ اُس نے یہ مقام کیوں پسند کیا ہے۔ بہرحال رات کو گیارہ بجے تک میں نے اُس گاؤں کے واحد ہوٹل میں جہاں وہ رہتا تھا اور جہاں میں بھی اُترا تھا اُس کا راستہ دیکھا آخرکار نصف شب کو وہ آیا۔ سردی کے مارے وہ ٹھٹھر گیا تھا۔ راستہ میں اُس کا کوٹ چوری ہوگیا تھا۔ اُس کا نوکر ایک دن پہلے ایک طاؤس کا پر لیتا آیا اُس کی نسبت وائلڈ کو خیال تھا کہ یہ گویا بدشگونی کی نشانی تھی اور وہ خوش قسمت تھا کہ صرف کوٹ ہی کے ہاتھ گئی۔ بہرحال وہ سردی سے کانپ رہا تھا مگر اُس کے آتے ہی ہوٹل بھر نے اُسے شراب پیش کرنی شروع کی، اُس نے مجھ سے اُس وقت اپنے جذبات کا اظہار دوسروں کے سامنے نہیں کیا لیکن بعد میں جب میں نے دیکھا کہ سبسٹین ملماتھ پھر آسکر وائلڈ ہوگیا ہے تو میرا استعجاب جاتا رہا۔ اس وقت وائلڈ، الجیریا کا وائلڈ نہ تھا بلکہ اپنے چہرہ پر مسکراہٹ اور دلکشی رکھنے والا پرانا وائلڈ تھا اُس نے دو کمرے جو ہوٹل میں بہترین تھے کرایہ پر لے رکھے تھے اور ان کی بہت عمدہ طریقہ سے آرائش کی تھی۔ خیر ہم دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے مگر اب تیز روشنی میں میں نے دیکھا کہ اُس کے چہرہ کی جلد سخت ہوگئی تھی اور ہاتھ کی کھال بھی کھردری ہوگئی تھی البتہ اُنگلیوں میں وہ وہی انگوٹھیاں پہنے تھا۔ باتیں کرتے کرتے میں نے اُس سے الجیریا میں اپنی گزشتہ ملاقات کا ذکر کیا اور کہا۔ "جس خطرہ میں آپ پڑنے جا رہے تھے وہ آپ کو معلوم تو ہوگیا ہوگا؟" اُس نے کہا۔ "بے شک میں جانتا تھا کہ کوئی نہ کوئی آفت آئے گی۔ خواہ وہ کسی قسم کی ہو۔

مجھے اس کی توقع تھی۔ اس کا خاتمہ یونہیں ہونے والا تھا۔ ذرا خیال کرو! آگے بڑھے جانا ناممکن تھا۔ اور خاتمہ بھی ہونا تھا۔ قیدخانہ نے مجھے بالکل بدل دیا ہے۔ ڈ۔ بہت خوفناک ہے۔ وہ یہ کبھی نہ سمجھ سکے گا کہ میں اپنی پرانی زندگی کیوں نہیں اختیار کر رہا ہوں۔ وہ دوسروں کو الزام دیتا ہے کہ انھوں نے مجھے بدل دیا۔ لیکن کوئی شخص ہمیشہ ایک ہی زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ میری زندگی بالکل آرٹ کے انداز کی ہے۔ ایک مصور کبھی ایک چیز کو دو مرتبہ نہیں شروع کرتا۔ قیدخانہ سے پہلے میری زندگی کامیاب تھی۔ اب وہ بالکل ختم ہو چکی ہے۔ عوام ایک خوفناک چیز ہیں۔ وہ ایک آدمی کا اندازہ اُسی کام سے لگاتے ہیں جو اُس نے آخر میں کیا ہے۔ اگر میں پیرس جاؤں تو وہاں کے لوگ مجھے سزا یافتہ ہی تصور کریں گے۔ میں وہاں اسوقت تک نہ جاؤں گا جب تک کوئی نیا ڈرامہ نہ لکھ لوں، مگر گیا یہاں آنے میں، میں بالکل حق بجانب تھا۔ میرے دوست مجھے جنوب کی طرف آرام کی غرض سے بھیجنا چاہتے تھے کیونکہ میں بہت کمزور ہو گیا تھا لیکن میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ میرے لئے شمالی فرانس میں ایک خاموش چھوٹا سا گاؤں تلاش کر دیں جہاں میں کسی کو نہ دیکھ سکوں اور جہاں تھوڑی سی ٹھنڈک اور مشکل سے کچھ دھوپ ہو۔ اور یہ تمام چیزیں مجھے یہاں میسر ہیں۔

"یہاں ہر شخص خاصکر پادری صاحب میرے اوپر بہت مہربان ہیں، اُس کا چھوٹا سا گرجا میرے لئے بڑی مسرت کی جگہ ہے۔ ذرا خیال تو کرو، اس گرجے کا نام ہے "مسرت کی محبوبہ"۔ کیا یہ پیارا نام نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس کو نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ آج ہی صبح پادری صاحب نے گرجے میں میرے لئے ایک خاص جگہ مقرر کر دی ہے۔

رہ گئے کسٹم افسران۔ یہ لوگ بھی کس قدر تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا ان کے پاس پڑھنے کی کوئی چیز نہیں ہے اور اب میں ان کے لئے پرانے ڈوما کی تمام ناول فراہم کر رہا ہوں، مجھے یہاں رہنا ہی چاہئے۔ یہاں بچے میری پرستش کرتے ہیں۔ ملکہ کی سالگرہ کے دن میں نے لڑکوں کو دعوت دی اس موقع پر گویا تمام اسکول مع اُستادوں کے موجود تھا۔ یوم ملکہ کے لئے! کیا یہ دلچسپ نہیں؟.... تم جانتے ہو کہ میں ملکہ کا بڑا مداح ہوں۔ میرے پاس اُن کی تصویر ہر وقت رہتی ہے۔ اس کے بعد اُس نے مجھے ملکہ کی تصویر دکھائی تصویر دیکھنے کے بعد میں نے اُس سے پوچھا کہ کیا آپ نے (Recollection in a Morgue) پڑھا ہے اس کا وائلڈ نے براہ راست جواب دینے کے بجائے اس طرح کہنا شروع کیا:۔

"روسی مصنفین بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ان کی کتابوں کو جو چیز اتنی عظمت بخشتی ہے وہ جذبۂ ہمدردی ہے جو ان میں پایا جاتا ہے۔ میں پہلے میڈیم بویری کی بہت تعریف کرتا تھا مگر فلابرٹ کی کتابوں میں جذبۂ ہمدردی کا نام نہیں ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ یہ محض ہمدردی تھی جس نے مجھے خودکشی سے بچائے رکھا۔ میں اول چھ ماہ تک اسقدر رنجیدہ رہا کہ میرا خودکشی کر لینے کو جی چاہتا تھا۔ مگر پھر میں نے دوسروں کو دیکھا۔ میں نے ان کی تکلیف دیکھی اور

ان کے ساتھ جو ہمدردی مجھے پیدا ہو گئی اُس نے مجھے خودکشی سے بچا لیا - ایک زمانہ وہ تھا کہ میں ہمدردی کو جانتا ہی نہیں تھا - تم جانتے ہو یہ کتنی حیرت انگیز چیز ہے - میں ہر رات کو خدا کا شکر ادا کرتا تھا - ہاں! یہ واقعہ ہے کہ میں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اُس کا شکریہ ادا کرتا تھا کہ اُس نے مجھے اس جذبہ سے آگاہ کر دیا کیونکہ جیل خانہ جاتے وقت میرا دل پتھر کا تھا اور مجھے صرف اپنی مسرتوں کی پرواہ تھی - مگر اب میرا دل ٹوٹ چکا ہے اُس میں رحم دلی آگئی ہے اور میں جان گیا ہوں کہ رحم دلی دنیا میں سب سے بڑی اور سب سے پیاری چیز ہے ...... - اور اسی وجہ سے میں ان لوگوں کی مخالفت نہیں کر سکتا جنھوں نے مجھے سزا دی کیونکہ بغیر ان کے مجھے یہ سب تجربات نہ ہوتے - ڈ ــــ مجھے مگر وہ خط لکھا کرتا ہے - کہتا ہے وہ مجھے سمجھ نہیں پایا اور نہ اُس کی سمجھ میں یہ آیا کہ یہ تمام دنیا کے خلاف کیوں نہیں جنگ کرتا کیونکہ ہر شخص نے میری مخالفت کی ہے ــــ نہیں وہ مجھے نہیں سمجھتا - مجھے سمجھ ہی نہیں سکتا - میں ہر خط میں اُسے لکھ دیتا ہوں کہ ہمارے راستے مختلف ہیں - اُس کا راستہ عیش کا ہے اور میرا وہ نہیں - اس کا راستہ السیبیڈس Alcibiades کا ہے اور میرا سینٹ فرانسس (St: Francis) کا - تم سینٹ فرانسس کو جانتے ہو؟ کیا تم مجھ پر ایک مہربانی کروگے؟ مجھے میرے نجات دہندہ کی بہترین سوانح عمری بھیج دو - میں نے اس کا وعدہ کیا اور اُس نے پھر کہنا شروع کیا:-

"ہاں - تو (جیل کے) آخری چھ ماہ کے دوران میں میرا نگراں بہت اچھا اور دلچسپ آدمی تھا مگر پہلے چھ ماہ بڑی مصیبت سے کٹے - اُس زمانہ کا نگراں بہت خراب آدمی تھا، وہ بڑا ظالم یہودی تھا جس میں تخیل کا کوئی مادہ ہی نہ تھا" میں اس بیان پر ہنس پڑا اور وائلڈ بھی ہنسنے لگا اور پھر کہا:-

"ہاں وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ہمارے ستانے کے لئے وہ کیا چیز ایجاد کرے، تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ اس آدمی کو تخیل سے کتنا بعد تھا - تم جانتے ہوگے کہ قید خانہ میں صرف ایک گھنٹہ دھوپ میں بیٹھنے کو ملتا ہے یعنی صحن کے چاروں طرف ایک دوسرے کے پیچھے گھومنے کی اجازت ملتی ہے مگر زبان سے ایک لفظ نکالنا بھی منع ہے - ہر شخص کی نگہبانی کی جاتی ہے اور اگر کسی شخص کو بات کرتے پکڑ لیا جائے تو سخت سزائیں دی جاتی ہیں - جو نئے نئے جیل میں پہلی مرتبہ جاتے ہیں ان کو اپنے لبوں کو جنبش دئے بغیر بولنے کی قدرت نہ رکھنے کی وجہ سے فوراً پہچان لیا جاتا ہے میں وہاں دس ہفتوں سے تھا اور کسی سے ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا - ایک دن شام کو جب ہم اپنا چکر ایک دوسرے کے پیچھے لگا رہے تھے میں نے یکایک اپنا نام کسی کو لیتے سنا - میرے پیچھے جو قیدی تھا وہ مجھ سے یہ کہہ رہا تھا "آسکر وائلڈ مجھے تم پر بہت ترس آتا ہے کیونکہ تم مجھ سے زیادہ تکلیف اُٹھا رہے ہو - میں نے اس کی بہت کوشش کی کہ کوئی مجھے دیکھنے نہ پائے، اور پھر بغیر گھومے ہوئے کہا - نہیں میرے دوست! ہم سب برابر مصیبت اُٹھاتے ہیں - اُس دن مجھے خودکشی کا خیال نہیں آیا -

اس طرح ہم لوگ اکثر گفتگو کرلیا کرتے تھے، مجھے اس کا نام معلوم تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کس جرم میں ماخوذ ہے۔ اُس کا نام پ ــــ تھا اور وہ اچھا آدمی تھا۔ مگر ابھی تک لب ہلائے بغیر بولنے کی ترکیب نہیں جانتا تھا اور ایک مرتبہ سی نمبر ۳۳ (یہ میرا نمبر تھا۔) اور سی نمبر ۴۸ پکڑلئے گئے۔ اور جیل کی کنجیاں رکھنے والے نے مجھ سے کہا تمھیں وارڈن کے سامنے جانا ہوگا! چونکہ میرے دل میں ترس پیدا ہوچکا تھا اس لئے مجھے صرف اپنے ساتھی کیلئے خوف تھا اور میں بذات خود اسی پر خوش تھا کہ اُس کی وجہ سے مجھے تکلیف اُٹھانی پڑے گی ــــ وارڈن ایک دیو پیکر انسان تھا۔ پہلے اُس نے پ ــــ کو بلایا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم دونوں کے بیانات الگ الگ سنے کیونکہ اس شخص کی سزا جو پہلے بولتا ہے دوسرے سے دگنی ہوتی ہے۔ عموماً اول الذکر کو دو ہفتوں کے لئے کال کوٹھری میں رہنا پڑتا ہے اور دوسرے کو صرف ایک ہفتہ۔ وارڈن یہ جاننا چاہتا تھا کہ ہم دونوں میں سے پہلے کون بولا۔ "پ" سے پوچھا تو اس نے کہدیا کہ پہلے وہی بولا ہے۔ لیکن جب وارڈن نے مجھ سے سوال کیا تو میں نے بھی کہدیا کہ پہلے میں بولا ہوں۔ اس پر وارڈن اتنا بگڑا کہ اُس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ کہنے لگا کہ "پ ــــ بھی یہی کہتا ہے کہ گفتگو کی ابتدا اُس نے کی۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔۔۔" اُس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا اور وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ پھر یکایک اُس نے کہا کہ میں تو اُسے دو ہفتوں کی سزا دے چکا ہوں۔ خیر۔ اگر یہ معاملہ ہے تو تم دونوں کو ہما دن کی سزا ملیگی ــــ ہے نہ دلچسپ چیز! وارڈن کے دماغ میں فکر و تصور کا شائبہ بھی نہ تھا۔"

وائلڈ ان باتوں سے بہت محظوظ ہو رہا تھا اور گفتگو کئے چلا جا رہا تھا:۔

"چودہ دن کے بعد قدرتاً ہم لوگوں کی گفتگو کرنے کی خواہش اور زیادہ تیز ہوگئی تھی۔ تم جانتے ہو کہ دوسروں کی وجہ سے تکلیف اُٹھانے کی سنسنی کتنی شیریں ہوتی ہے۔ چونکہ ہر شخص ایک ہی سلسلہ سے ہمیشہ پریڈ نہیں کرتا تھا۔ اس لئے رفتہ رفتہ میں نے ہر ایک سے گفتگو کرنے کا موقع نکال لیا۔ میں ہر ایک کا نام، اُس کا قصہ، اور یہ کہ اُسے جیل سے کب چھٹکارا ملیگا سب جانتا تھا۔ اور ہر ایک سے یہ کہتا تھا کہ جب تم باہر نکلو تو سب سے پہلا کام یہ کرنا کہ ڈاکخانہ جاؤ، وہاں تمھارے نام ایک خط مع روپیہ کے تم کو ملیگا۔۔۔۔۔ ان میں کچھ لوگ بہت اچھے آدمی تھے۔ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میرے تین ساتھی قیدی مجھے یہاں دیکھنے آئے تو تم یقین کروگے؟ کیا یہ چیز حیرت انگیز نہیں ہے؟

"اُس غیر حساس وارڈن کا جانشین بہت اچھا آدمی تھا۔ میرا جو کچھ جی چاہتا تھا پڑھنے کے لئے طلب کرسکتا تھا۔ مجھے یونانیوں کا خیال آیا کہ وہ مجھے مسرت پہونچا سکیں گے۔ چنانچہ میں نے سوفوکلس (Sophocles) کی کتابیں مانگیں مگر وہ میرے مذاق کے مطابق نہ تھا۔ پھر میں نے مذہب پر لکھنے والوں کی خواہش کی مگر ان کا بھی مجھ پر اثر نہ ہوا۔ پھر یکایک مجھے ڈینٹے (Dante) کا خیال آیا ــــ اُف ڈینٹے! میں ڈینٹے کی تصنیف

اطالوی زبان میں ہر روز پڑھا کرتا تھا۔ اُس کا ہر صفحہ میں نے پڑھ ڈالا۔ مگر میرے لئے نہ بہشت تھی نہ برزخ۔ لیکن انفرنو (Inferno) میرے لئے بجز اُس کی پرستش کے اور کیا چارہ کار تھا۔ دوزخ۔ کیا ہم اُس میں مقیم نہ تھے۔۔۔ دوزخ! یہی قیدخانہ تھا"

اُسی رات کو اُس نے مجھ سے ایک فرعون کے بارہ میں اپنے ڈرامہ کی اسکیم اور جوڈاس (Judas) پر ایک پرزور افسانہ کا تذکرہ کیا۔

دوسرے دن صبح وائلڈ مجھے ایک چھوٹے سے خوبصورت مکان میں لے گیا جو ہوٹل کے نزدیک تھا، اس مکان کو اس نے کرایہ پر لے رکھا تھا اور اُس کی آرائش کر رہا تھا۔ یہاں وہ اپنے ڈرامے لکھنا چاہتا تھا۔ پہلا فرعون کا اور پھر "اشاب اور اسا بیلا" (Ashab & Isabella) کا موخرالذکر افسانہ اُس نے مجھے سنایا بھی۔ اس کے بعد میری گاڑی تیار ہوئی اور وائلڈ مجھے تھوڑی دور تک پہونچانے کی غرض سے ساتھ بیٹھ گیا اور میری کتابوں کی تعریف کرنے لگا۔ اتنے میں گاڑی رکی اور وائلڈ نے اتر کر مجھے رخصت کیا پھر یکایک بولا۔" دیکھئے مجھ سے ایک بات کا وعدہ کیجئے (Nourriture Terrestres) عمدہ چیز ہے۔ بہت عمدہ۔ لیکن مسٹر! مجھ سے وعدہ کیجئے کہ "میں" (I) کبھی نہ لکھئے گا۔ آرٹ میں صیغہ واحد متکلم کوئی چیز نہیں ہے جب میں پیرس پہونچا تو میں نے ڈ۔۔۔ سے سارا قصہ سنایا۔ اس نے کہا۔" میں اُس سے واقف ہوں۔ وہ مجھے روز خط بھیجتا ہے۔ ممکن ہے پہلے وہ اپنا ڈرامہ تیار کرلے اور اس کے بعد میرے پاس آئے۔ لیکن اُس نے تنہائی میں کبھی کوئی بڑا کام نہیں کیا اُسے خیالات منعطف کرنے کی ضرورت ہے۔ اُس نے اپنی بہترین تصنیف اُس وقت تیار کی جب وہ میرے پاس تھا۔ اُس کا آخری خط دیکھو۔۔۔۔ یہ کہکر ڈ۔۔۔ نے مجھے وہ خط سنایا۔ اس خط میں اُس نے ڈ۔۔ سے درخواست کی تھی کہ مجھے "فرعون" سکون کے ساتھ ختم کرلینے دو، اُس کے بعد میں تمھارے پاس آؤں گا۔ خط کے آخر میں یہ شاندار جملہ تھا۔" اور اُسوقت میں ایک بار پھر زندگی کا بادشاہ بن جاؤں گا"

وائلڈ کچھ عرصہ کے بعد پیرس آگیا۔ وہ ڈرامہ نہیں لکھا گیا تھا اور نہ پھر کبھی لکھا جا سکا۔ جب سوسائٹی کسی کو تباہ کرنا چاہتی ہے تو وہ تمام ضروری چیزوں سے واقف ہوتی ہے اور اُس کے طریقے موت سے بھی زیادہ یقینی ہوتے ہیں۔۔۔۔ وائلڈ دو برس تک، بہت خاموشی سے مصیبتیں جھیل چکا تھا اور اُس کے عزائم ٹوٹ چکے تھے۔ پہلے چند ماہ تک تو وہ اپنے لئے استعارات استعمال کرتا رہا اور پھر یہ بھی ترک کر دیا۔ یہ دلکشی تھی۔ اُس کی تباہ شدہ زندگی میں بجز پچھلی عظمت کی یاد کے اور کچھ نہیں باقی رہ گیا تھا گو کچھ نہ کچھ ظرافت اب بھی باقی باقی تھی۔ کبھی کبھی وہ اس کا امتحان شاید اس خیال سے لیا کرتا تھا کہ آیا اب بھی اُس میں قوت تخیئل باقی ہے یا نہیں۔ لیکن اب وہ ظرافت غیر فطری بے مغز

اور سطحی رہ گئی تھی۔ اس کے بعد مجھ سے اور وائلڈ سے صرف دو مرتبہ ملاقات ہوئی۔

ایک دن جب میں بلوارڈ میں ج ـــ کے ساتھ گھوم رہا تھا یکایک میں نے کسی کو پشت کی طرف سے اپنا نام پکارتے سنا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وائلڈ تھا۔ وہ بہت بدلا ہوا تھا۔ اُس نے ایک دفعہ کہا تھا کہ "اگر میں بغیر دوسرا ڈرامہ لکھے پھر ظاہر ہوں تو دنیا مجھے سزا یافتہ مجرم ہی سمجھے گی۔" وہ نئے ڈرامہ کے بغیر واپس ہوا تھا اور جب چند لوگوں نے جن کے پاس وہ گیا بے التفاتی ظاہر کی تو پھر اُس نے کسی سے ملاقات نہیں کی۔ وہ بدمعاش بن گیا۔ دوستوں نے اکثر اُسے بچانے کی کوشش کی۔ ایک نے ترکیبیں سوچنا شروع کیں کہ اس کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ چنانچہ ایک صاحب اُسے اٹلی لے گئے مگر وہاں سے وائلڈ بھاگ نکلا۔ ان دوستوں میں سے بعض نے جو وائلڈ کے بہت وفادار رہے مجھ سے بیان کیا تھا کہ وائلڈ کہیں غائب ہو گیا ہے۔ چنانچہ جب میں نے اُسے اُس جگہ اور اس حالت میں دیکھا تو میں گھبرا سا گیا۔ وائلڈ ایک قہوہ خانہ کے چبوترہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے میرے اور ج ـــ کے لئے دو مرغ کا آرڈر دیا۔ میں اُس کی طرف منہ کئے بیٹھا تھا اور میری پیٹھ ادھر سے گزرنے والوں کی طرف تھی۔ وائلڈ نے اسے محسوس کر لیا اور اس چیز کو ایک مہمل شرم سے منسوب کیا۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ اس بات میں ایک بڑی حد تک حق بجانب تھا اس کے بعد اُس نے کہا "میرے قریب یہاں بیٹھ جاؤ۔ میں اب بالکل تنہا ہوں۔" یہ کہکر اُس نے اپنے نزدیک ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وائلڈ اب بھی اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھا مگر اُس کی ہیئت میں اب وہ شان نہ تھی، اُس کا کالر اب بھی پرانے طرز کا تھا مگر اتنا صاف نہ تھا اور اُس میں خفیف سی شکنیں بھی دکھائی پڑتی تھیں۔

اس کے بعد اُس نے یہ گفتگو شروع کی:۔

"جب میں ایک مرتبہ ورلین سے ملا تو میں اُسے دیکھ کر شرمایا نہیں۔ میں دولتمند تھا۔ خوش تھا۔ مشہور تھا مگر مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ورلین کے ساتھ دیکھا جانا میرے لئے ایک عزت ہے اگرچہ وہ شراب پئے ہوئے تھا۔" لیکن یہ خیال کرکے کہ شاید اس قسم کی باتوں سے وہ ج ـــ کو گھبرا دیگا اُس نے اپنا لہجہ بدل دیا اور ظریف بننے کی کوشش کی اور مذاق شروع کیا۔ جب ہم اُٹھے تو وائلڈ نے اصرار کیا کہ دام وہی دیگا لیکن جب میں اُس سے رخصت ہونے لگا تو وہ مجھے الگ ہٹالے گیا اور آہستہ سے گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا "سنو۔ دام تمھیں کو دینا پڑیں گے، میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔"

کچھ دنوں کے بعد میں نے اُسے پھر آخری مرتبہ دیکھا۔ اس مرتبہ اُس نے مجھ سے کہا کہ اب میں اپنے آرٹ کو نہیں استعمال کر سکتا۔ میں نے اُس سے کہا کہ تم نے وعدہ کیا کہ بغیر ڈرامہ تیار کئے پیرس نہ واپس ہوں گا۔ اس پر اُس نے میری طرف بہت غمگین صورت سے دیکھ کر کہا:۔

"ایک ایسے شخص سے جو ناکامیاب ثابت ہو چکا ہے کسی کو کچھ نہ پوچھنا چاہئے۔"

آسکر وائلڈ روڈس بیوکس آرٹس (Rue de Beaux Arts) کے ایک بہت ذلیل چھوٹے سے ہوٹل میں مرا۔ سات آدمی اُس کے جنازہ میں شریک ہوئے اور ان میں سے سب اُس کی آخری آرامگاہ تک بھی نہیں گئے۔ جنازہ پر پھول اور ہار رکھے تھے۔ صرف ایک پتھر پر ایک کتبہ لکھا ہوا تھا جسے اُس کے مالک مکان نے لکھوایا تھا۔ اس کتبہ پر یہ الفاظ لکھے تھے:۔ "A mon Localaire"

ارنسٹ لاجیونس کی یادداشت

اگر کوئی شخص اِس آہستہ رو اور سنجیدہ مزاج شخص کو مع اُس کے تن و توش کے، خوب غور کئے بغیر، ٹہلتا ہوا دیکھتا تو ایسا معلوم ہوتا گویا وہ کسی ماتمی جلوس کا ایک فرد ہے۔ "عوام" اور شعراء میں اُس سے زیادہ غلط فہمی کا شکار اور کوئی نہیں ہوا ہو۔ پبلک چاہتی ہے کہ اُسے احمق بنایا جائے۔ وہ چاہتی ہے کہ وہ شام کو تھیٹر کا خواب دیکھا کرے تاکہ اُس کے لئے دن کو حیرت اور استعجاب کا سامان موجود رہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اخباروں میں قتل و جرائم کی خبریں ہوا کریں تاکہ کام شروع کرنے سے قبل علی الصباح اُس میں سنسنی پیدا ہوجائے۔

جب کوئی اعجاز نگار (میں اس لفظ کو خاص طور سے استعمال کر رہا ہوں کیونکہ وائلڈ اس لفظ کی بہت عزت کرتا تھا) پبلک کو بیوقوف بنانا چاہتا ہے تو اُسے اختیار حاصل ہوتا ہے جہاں سے جو مواد چاہے انتخاب کرلے۔ ایک شخص کو اُس سے یہ توقع کرنا عبث ہے کہ وہ معاشرتی یا اخلاقی سبق سکھائیگا بلکہ اُس سے چالاکیوں، نئی ترکیبوں، دوزخ اور جنت کی کہانیوں کی توقع کی جاتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک نبی یا ساحر ہو۔ اُسے لازم ہے کہ وہ دنیا کو ایک اُصول بنانے والی کی طرح دو ٹکڑے کرے، اور پھر اپنے شاعرانہ تخئیل سے دوبارہ اُسے پیدا کرے۔ اُسے نظریات اور حقائق پیش کرنا چاہئے۔ اُسے بدیہیات، کلیات حتیٰ کہ وحشیانہ ذو معنی الفاظ پیش کرنا چاہئے۔

اس قیمت کے لئے (جو بہت کافی ہے) اُسے معتوب فرشتوں کی طرح گمراہی نصیب ہوسکتی ہے اور وہ اپنے لئے فریب اور مغالطہ بھی تلاش کرسکتا ہے۔ وائلڈ نے یہ قیمت ادا کی تھی۔ اب وہ اپنی کامیابی کی مدد سے ایک نوجوان آدمی کا پارٹ ادا کرنا چاہتا تھا جسے وہ اچھی طرح ادا نہ کرسکا۔

لیکن اُسے دھوکا دینے کی کوشش میں پبلک نے خود دھوکہ کھایا کیونکہ اچھا یا برا معاوضہ بھی شاعر کو دیا جاتا ہے وہ، وہ ہے جو ایک سوانح نگار شاعر کی وفات کے بعد دیتا ہے۔

جلاوطنی میں بھی وائلڈ کی شان ایک انگریز کی سی رہی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر مظلوم سے (مضمون سے بیر رکھے ہوئے بغیر) ہمدردی رکھتا تھا۔ لوسی میسٹ کی سزائے موت کو جسے اپنے بچہ کو مار ڈالنے کے جرم میں پھانسی دی گئی تھی وہ بالکل مناسب خیال کرتا تھا۔ اُس نے ٹرانسوال کے حالات کا غور سے مطالعہ کیا اور کچنر اور رابرٹس دونوں کی تعریف کی۔ جو ایک جلاوطن کے لئے ایک خاص چیز تھی! وہ پیدائش کے اعتبار سے آئرش، خیالات

کے اعتبار سے اطالوی، تہذیب کے لحاظ سے یونانی، اور بدیہیات کے شوق کی حیثیت سے ایک فرانسیسی ہوتے ہوئے بھی وہ لندن کو نہیں بھول سکتا تھا جس کی فضا میں اُس کو اپنی تمام کامیابیاں نصیب ہوئی تھیں۔ وہ لندن جس میں وہ تمام اجنبی تہذیب لایا تھا — وہ لندن جسے اپنی خود پسندی میں اُس نے پھولوں اور محلوں کا ایک باغ، اعلیٰ ترین خیالات اور بہترین دلکشی کی جگہ بنا دیا تھا۔ انگریزوں کے خلاف وہ جو گستاخیاں کرتا تھا وہ گویا ایک مہربان شہنشاہ کی سی ہوتی تھیں۔ جب وہ کسی قہوہ خانے میں بغیر کسی کو سلام کئے ہوئے اندر داخل ہوتا تو قہوہ خانہ کی مالکہ سے دریافت کرتا "کیا میں یہاں کسی کو جانتا ہوں؟" اس سے اُس کا مقصد کسی کی توہین کرنا نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ اُس کی جوانمردی تھی اور صرف یہ دکھلانا چاہتا تھا کہ وہ دنیا بھر کو نہیں جانتا ہے خصوصاً اس حالت میں جبکہ خود وہ بھی اپنے مہمانوں میں سے صرف چند کو جانتی ہوتی تھی۔ اُسے ملامت کی جاتی ہے کہ اُس نے اپنے ڈراموں کی آمدنی [illegible] لاکھ فرانک نہایت بیدردی سے اڑا دی۔ اُسے دیوالیہ قرار دیدیا گیا۔ اُس کا نام لوگوں کے دماغوں سے فراموش ہوگیا۔ اُس کے بچوں کو اُس سے چھین لیا گیا۔ اور یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ پبلک اُسے اپنے مظالم سے متنفر کرنا چاہتی تھی۔

پھر جب سے اُس نے ہماری سرزمین پر قدم رکھا تو اس انداز سے کہ یہ عظیم الخلقت ہستی جسے نیند، غذا، سکون اور کتابوں کا فقدان برباد اور کمزور نہ کر سکا تھا سمندر سے، پیرس سے اور نیپلس سے دریافت کرتا تھا کہ ان کے دامن میں اُس کے آرٹ کے لئے کوئی گنجائش ہے یا نہیں اور افسوس ہے کہ وہ اس میں ناکام رہا۔

چالیس برس کی عمر میں جبکہ وہ مستقبل سے توقعات رکھتا تھا ناکام ثابت ہوا۔ امریکہ والے اُس کا ایک نیا ڈرامہ چاہتے تھے مگر وہ صرف یہ کر سکا کہ اُس نے لیونارڈ اسمتھرس کو اپنا پرانا ڈرامہ An Ideal husband چھپنے کے لئے دیدیا۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھایا کرتا تھا تاکہ پچھلے واقعات کی یاد فراموش نہ ہونے پائے۔ اُسے خاموشی پسند تھی کیونکہ اس کی بدولت وہ اپنی گزشتہ حالت کو یاد کر سکتا تھا مگر پھر بھی اُس میں کسی ہمراہی کے ساتھ گمنام سے گمنام گلیوں میں گھومنے کی عادت باقی تھی اور وہ لندن میں اپنے پرانے تجربات کا پھر خواب دیکھا کرتا تھا۔ شرابخانوں میں بھی اُسے لندن کی جستجو تھی مگر بجز امریکن شرابخانوں کے اور تمام شراب خانے اُس کی دسترس سے باہر تھے چنانچہ ایک مرتبہ چیتھم میں اُس سے یہ کہدیا گیا کہ وہاں نہ آیا کرے۔

اُس کے چہرہ پر آنسوؤں کی لکیریں بن گئی تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں رونے سے حلقہ پڑ گئے تھے اور اُس کے ہر عضو بدن سے اُس کی بےچینی اور کرب کا پتہ معلوم ہوتا تھا وہ ہر شخص اور خاصکر اپنے لئے ہمیشہ متضاد باتیں بیان کرتا تھا۔ وہ اس کا یقین کرنا چاہتا تھا کہ وہ اب بھی بہت کچھ جانتا ہے — اور واقعی

وہ سب کچھ جانتا تھا۔

ایک مرتبہ وائلڈ نے ایک بادشاہ اور فقیر کا قصہ سُنایا اور آخر میں کہا "میں ابھی تک بادشاہ رہا ہوں، اب فقیر ہو جاؤں گا، مگر پھر بھی وہ آخر وقت تک ایک مکمل انگریز بنا رہا اور کبھی دست سوال دراز نہیں کیا۔

اٹلی کے بعد اُسے اسپین اور بحیرۂ قلزم کے کنارہ رہنے کی خواہش تھی۔ فرانس میں بجز پیرس کے اُس کے لئے اور کچھ نہ تھا اور وہ پیرس بھی اب اُس کے لئے بند ہو رہا تھا، پیرس بہرہ ہو گیا تھا، اُس میں خون کی روانی نہیں رہی تھی، اُس کے پاس دل بھی نہ تھا غرضکہ پیرس میں کوئی دلکشی، کوئی رعنائی اور کوئی رومان باقی نہیں رہ گیا تھا۔

اُس کا رنج روز بروز زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ اُس کے دوست بھی نہیں باقی رہ گئے تھے۔ اُس کے خاندان والوں نے دس فرینک روزانہ کی جو قلیل رقم اُس کے لئے منظور کی تھی اُس میں وائلڈ کے پبلشر کچھ بھی اضافہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اُسے ان ڈراموں اور کتابوں کو لکھنا تھا، جن کا وہ ٹھیکہ لے چکا تھا مگر وہ شام کو تین بجے سے قبل اُٹھنے سے معذور تھا۔

وہ ان باتوں سے بدمزاج نہ ہوتا تھا بلکہ ان کو برداشت کرتا۔ ایک دفعہ وہ بستر پر لیٹ گیا اور کہنے لگا اُسکے کھانے میں زہر ملا دیا گیا ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ پھر اُٹھا مگر بہت مضمحل اور موت کا خیال دل میں لئے ہوئے!

جن لوگوں نے اُسے آخر زمانہ میں اپنی ظرافت و ذکاوت کی سحر کاریوں کے نمونے پیش کرتے دیکھا ہے وہ اُس ہستی کے پر درد نظارہ کو نہیں بھول سکتے جو اگرچہ مردود بارگاہ ہو چکا ہو مگر جس کی گردن پھر بھی نہ جھکتی ہو۔

لیکن آیئے اب ان تفصیلات کو چھوڑ کر اُس کے انجام پر ایک نظر ڈال لیں! حدود شہر سے دور ایک کمرہ میں ۱۳ آدمی ایک تابوت کے سامنے جس کا نمبر ۱۳ ہے اپنی ٹوپی اُٹھاتے ہیں۔ لاش کی گاڑی کے بجائے دو لینڈو دکھائی پڑتی ہیں۔ کچھ مرجھائے ہوئے پھول ہیں اور ایک پھولوں کا ہار گرجا میں موت کی گھنٹیاں نہیں بج رہی ہیں اور اس کے جنازہ کے لئے صرف ایک بغلی راستہ کا دروازہ کھلتا ہے۔ بغیر کسی موسیقی کے نماز جنازہ پڑھائی جاتی ہے، اور تین رپورٹر جلوس جنازہ کے شرکاء کا شمار کر رہے ہیں — یہ ہے وہ رسم رخصت جو دنیا اپنی ایک اولاد کی جدائی پر ادا کر رہی ہے — وہ اولاد جس نے اُس کے خواب کی عظمت کو چمکانا اور وسیع کرنا چاہا تھا — یہ ہے تصورات کی زندگی اور ناممکن حسن کے خوابوں کی زندگی کا، جرس ماتم۔

وائلڈ کیتھولک تھا۔ اُسے مرتے وقت صرف دو اصطباغ ملے۔ پہلا جب کہ وہ عالم بیہوشی میں تھا اور دوسرا جب کہ وہ ابدی نیند سو رہا تھا۔ جو پادری اُس کے اِن آخری مراسم کے وقت موجود تھا اُس کے داڑھی تھی اور وہ خود انگریز تھا۔ بہرحال میں یہ ضرور کہوں گا کہ وائلڈ اس قدر ایماندار کیتھولک تھا کہ اُسے آخری مراسم کی ضرورت ہی نہ تھی اور وہ پاپائے روم کے مذہب کی ہر رسم کو مانتا تھا۔

میں یہاں پر آسکر وائلڈ کی تعریف نہیں کرسکتا اور نہ اُس پر تنقید کرسکتا ہوں۔ اُس کی حیرت انگیز قابلیت پر کما حقہ تبصرہ کرنا بہت بڑا کام ہے۔ اُس کی پوری قابلیت صرف اُس کی تصانیف سے نہیں عیاں ہوتی۔ بے شک اُس کی تحریر نہایت ظرافت آمیز اور اعلیٰ ہے مگر اُس کی حقیقی قابلیت کے سامنے وہ کچھ نہیں۔ اُس کی تصانیف اُسکے خیالات کا پرتو ہیں۔ اور اُسے ایسے شخص کی طرح سمجھنا چاہئے جو ہر چیز جانتا ہے اور ہر چیز بہترین طریقہ سے کہہ سکتا ہو وائلڈ سے زیادہ آرٹ کا شیدائی میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ اب میں اس بیان کو وائلڈ کی سادگی کا مختصراً ذکر کرتے ہوئے ختم کئے دیتا ہوں۔

ایک دن وائلڈ جو کبھی اپنی کھوئی ہوئی دولت پر سب کے سامنے دکھڑا نہیں روتا تھا اپنی ابویت پر اظہار افسوس کرنے لگا اور اپنے ۱۲ سالہ لڑکے ڈیورین کے بارہ میں کہنے لگا کہ کیتھولک ہونے کے بعد اُس نے اپنے سرپرست سے یہ کہا کہ میں کیتھولک ہوں۔ اس کے بعد پھر اُس نے کہنا شروع کیا کہ "۱۲ سالہ لڑکا ڈیورین کو چ پر لیٹا رہتا ہے اور جب وہ لوگ اُس سے اُٹھنے کو کہتے ہیں تو وہ کہتا ہے مجھے رہنے دو میں غور کر رہا ہوں۔ اور وہ یہ بالکل میرے لہجہ میں کہتا ہے جس پر لوگ ہمیشہ تمسخر اُڑاتے رہے اور کہتے رہے کہ یہ مصنوعی ہے۔

فرانز ہلی کی یادداشت

" زندگی میں کوئی تناسب نہیں اُس کے مصائب غلط جگہ اور غلط آدمیوں پر پڑتے ہیں۔ اُس کی کمیڈیوں (Comedies) کے چاروں طرف خوف کا دور دورہ رہتا ہے اور اُس کی ٹریجڈیاں ڈھونگ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اگر تم اس کے نزدیک جاؤ تو وہ تمہیں مجروح کردیگی وہ یا تو بہت عرصہ تک رہتی ہے اور یا بہت کم وقفہ تک"

اگر کوئی شخص ان جذبات کا نمونہ دیکھنا چاہے تو اُسے اُس شخص کی زندگی سے بہتر کوئی اور مثال نہیں مل سکتی، جس نے یہ الفاظ کہے ہیں کیونکہ آسکر وائلڈ کا ہر لفظ اُس کے حالات زندگی پر منطبق ہوتا تھا، چنانچہ اُس کے یہ الفاظ بھی بالکل صحیح ثابت ہوئے۔

وہ سمجھتا تھا کہ چونکہ میں حُسن کی شعل اپنے سامنے لئے چل رہا ہوں اس لئے میں زندگی کے راستوں پر آسانی سے چل سکتا ہوں۔ لیکن جو لوگ زندگی کے پاس خواب دیکھ دیکھ کر آتے ہیں انھیں ہمیشہ ناکامی ہوتی ہے۔ بعض وقت وائلڈ "گناہ" کو محض اس حیثیت سے دیکھتا تھا کہ اُس سے حسن کا احساس پیدا ہوتا ہے چنانچہ وہ اس "گناہ" کی پرستش بھی کرنے لگتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ گناہ کی بدولت ہی زندگی اور رنگینی کا وجود ہے اور ایک گنہگار سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ وہ اس قسم کا آدمی تھا جس کی تمنا تو ہمارے عہد کو بہت ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اُسکا خوف بھی غالب ہے، ہم اپنے تصورات میں تو اُس کی تصویر پیش نظر رکھتے ہیں مگر جب وہ عالم وجود میں واقعی آجاتا ہے تو اُسے پھانسی دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

وائلڈ کی ادبی قابلیت اُس کا نام ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے مگر اُس کی زندگی کو ایک ایسی قسمت سے مقابلہ کرنا پڑا جس کا انجام ٹریجڈی تھا اور جو اُس کے کارناموں پر چھا گئی۔ اہل انگلستان کے ظلم کی یہ داستان یقیناً حیرت انگیز ہے کہ اس ملک کے ہر امیر اور غریب نے متفقہ طور سے اپنے پیارے ہموطن کو دو برس کی سزا دلوادی اور اس پر بھی اطمینان نہ ہوا بلکہ اُس کی یاد کو بھی دوسروں کے دلوں سے بھلانے کی کوشش کی۔

وائلڈ بڑا شوقین تھا اور اس سے زیادہ کسی نے اس فرض کو پورا نہیں کیا۔ اُس نے اس فرض کی ادائگی میں اپنی ساری قابلیت صرف کر دی تھی۔ وائلڈ سے زیادہ بہتر طریقہ سے اور کسی شاعر نے آرٹ کو فطرت پر فوقیت نہیں دی کیونکہ اُس کا مطمح نظر صرف شاعر ہونا ہی نہیں تھا بلکہ اُس سے بھی زیادہ شوقین ہونا تھا۔ ؟

بڑا چور ــــ بڑا حکمراں

اس دورِ علم و تہذیب میں اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ یوروپ کی ایک بہت بڑی سلطنت میں جس کا رقبہ کرۂ زمین کے چھٹے حصے کے برابر ہے ایک ایسا شخص حکمراں ہے جو کسی وقت بڑا زبردست چور تھا، ریوالور دکھا دکھا کر بنکوں کو لوٹتا تھا۔ ریل کی پٹریاں اکھاڑ اکھاڑ کر ریل کے مسافروں کا مال چھین لیا کرتا تھا، تو یقیناً وہ بہت حیران ہوگا، لیکن آئیے آج آپ کو ایک ایسے ہی انسان کا قصہ سنائیں۔

۱۹۰۶ء ہے اور روس کی انقلابی جماعت آخری سانسیں لے رہی ہے اور بالکل مفلس و محتاج ہوگئی ہے۔

شہر تفلس میں جو بہ نسبت یوروپ کے ایشیا سے زیادہ قریب ہے، ایک عام چرچا پایا جاتا ہے کہ وہ خوفناک و خونخوار ہستی جو رفیق کوبا کے نام سے مشہور ہے انقلابی جماعت کے لئے چندہ وصول کرنے نہ آجائے اور آخر کار یہاں کے تاجروں نے ملکر فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ ہو وہ اسے ایک پیسہ نہ دیں گے۔ درانحالیکہ رفیق کوبا اپنے مطالبات کے رد کئے جانے سے واقف ہی نہ تھا اور جو طلب کرتا تھا اسے "طوعاً یا کرہاً" وصول ہی کر لیتا تھا۔

رات کا وقت ہے اور یکے بعد دیگرے ساکنانِ تفلس نے اپنے دروازے بند کرلئے ہیں، لیکن ٹھیک اسی وقت جبکہ ایک شخص کسی ضرورت سے دروازہ کھولتا ہے اور سامنے ایک آدمی اُسے نظر آتا ہے۔ یہ صاحب خانہ سے کہتا ہے کہ "رفیق کوبا حاضر ہے۔ اس کا حق مرحمت فرمایئے"۔

یہ کہکر وہ گھر کے اندر داخل ہوجاتا ہے اور سب سے پہلے وہ کھانا طلب کرتا ہے کیونکہ اس زمانہ میں کسی کو پیٹ بھر کھانا مل جانا بھی کوئی آسان امر نہ تھا۔ اس کے بعد وہاں کی ہر قیمتی چیز پر قبضہ کرکے ریوالور ہاتھ میں لئے ہوئے باہر نکل جاتا ہے۔

چند دن کے بعد کوبا نے محسوس کیا کہ تفلس اس کے حوصلوں کے لحاظ سے تنگ و محدود مقام ہے اسلئے اس نے اپنے دو ساتھیوں کو لیکر قوقاز کے ایک شہر کا رُخ کیا۔ یہاں انھوں نے بنک لوٹنے کی تجویز کی چنانچہ ایک دن مقرر کرکے یہ تینوں ریوالور لئے ہوئے وہاں پہونچ گئے اور بڑی تعداد نوٹوں کی لوٹ کر باہر نکلے چونکہ شہر کے اندر تینوں کا ایک ساتھ نکلنا خطرہ سے خالی نہ تھا اس لئے ہر ایک نے اپنی علٰحدہ راہ اختیار کی۔ نوٹ

کوبا کے پاس تھے اور یہ انھیں لئے ہوئے خفیہ طور پر اس مکان میں پہونچ گیا جہاں یہ تینوں چھپے رہتے تھے۔ کوبا نے نوٹوں کو چولھے کے ایک کونہ میں دفن کر دیا اور باہر نکلکر ایک کھنڈر میں اپنے ساتھیوں کا انتظار کرنے لگا، تھوڑی دیر کے بعد اس کا ایک ساتھی جس کا نام ایفانوف تھا آ گیا لیکن دوسرا جسے اشفیلی کہتے تھے نہ آیا۔ دیر تک انتظار کرنے کے بعد یہ دونوں گھر واپس آئے تو دیکھا کہ اشفیلی چولھے کے پاس بیٹھا ہوا آگ جلا کر تاپ رہا ہے۔ یہ دیکھتے ہی کوبا کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور آگ بجھا کر چولھا کھودا تو سوائے سو روبل کے نوٹ کے سب جلکر خاک سیاہ ہو گئے تھے۔ اُن لُٹیروں کو جتنا افسوس ہوا ہو گا ظاہر ہے، لیکن وہ مایوس نہیں ہوئے اور انھوں نے طے کیا کہ اب ریل میں ڈاک کے ڈبہ کو لوٹنا چاہئے۔

چنانچہ یہ کسی ترکیب سے اس غسل خانہ میں چھپ گئے جو ڈاک کے ڈبہ کے پاس تھا۔ یہ ڈبہ مقفل جایا کرتا تھا اور روستوف سے اسکوتک ایک فوجی گارد اس کی حفاظت کے لئے ساتھ چلتا تھا۔ جب رات کی تاریکی بڑھ گئی تو یہ تینوں غسلخانے سے باہر نکلے اور فوجی گارد کے سر پر اچانک ریوالور لئے ہوئے پہونچ گئے۔ ایسی صورت میں ایک یوروپین ہمیشہ اپنے ہاتھ اوپر اُٹھا دیا کرتا ہے چنانچہ گارد کے سپاہیوں نے بھی اسی طرح اعتراف بیچارگی کر دیا اور انھوں نے سونا اور نقد جو کچھ تھا سب لوٹ لیا۔ اس کے بعد یہ تینوں ریل سے کود کر بھاگے لیکن پھر اشفیلی کا پتہ نہ چلا جس کے قبضہ میں لوٹا ہوا مال تھا اور اس طرح کوبا اور اس کے ساتھی ایفانوف کو کچھ ہاتھ نہ آیا۔

اسی طرح کے بیشمار حوادث پر بارہ سال کا زمانہ اور گزر گیا۔ ایک دن ایفانوف، جارجیا کے ایک شہر جوری میں چکر لگا رہا تھا کہ اشفیلی اسے نظر پڑا اور دوسرے دن اس کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا جو بالشیوک حکومت کے دشمنوں کے ساتھ آجکل روا رکھا جاتا ہے۔ یعنی وہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا اور اس کی لاش کا بھی پتہ کسی کو نہ چلا۔

اس واقعہ کو بھی بیس سال کا زمانہ گزر جاتا ہے اور کوبا دفعۃً بلا شرکت غیرے روس کا حکمراں نظر آتا ہے، لیکن کوبا کے نام سے نہیں، بلکہ اسٹالین کے نام سے۔

مکتوبات نیاز

خلافت

اور

جانشین رسول

کچھ روز سے رسالہ نگار میں مسئلہ خلافت پر بہت ہی دلچسپ بحث چھڑی ہوئی ہے، اس سلسلہ میں سہرام صاحب اور خود جناب نیاز صاحب کے نہایت بلند پایہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

مجھے نیاز صاحب کی رائے سے تقریباً اتفاق ہے مگر میرے خیال میں ابتک تاریخ و سیر، حدیث و تفسیر عقاید و کلام کی اوراق گردانی میں تصویر کے صرف ایک ہی رخ پر سارا زور قلم صرف ہوا ہے، دوسرا رخ سرے سے نظر انداز کر دیا گیا ہے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ حضرت علی اور حضرت ابوبکر دونوں کے متعلق ہم سمجھنے کی کوشش کریں کہ اُن کے بارے میں منشار نبوت کیا تھا؟

درحقیقت صحابۂ کرام میں حضرت علی اور حضرت ابوبکر کی ایسی با اقتدار ہستیاں گزری ہیں جن کی دینی اور مذہبی جاں نثاریاں دیکھکر نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ بسا اوقات خود آنحضرت صلعم کو بھی تردد ہوتا تھا کہ وہ اپنا جانشین کس کو بنائیں، ابتدائے اسلام سے لیکر وفات رسول تک واقعات پر تفصیلی نظر ڈال جائیے، اور غور کیجئے کہ یہ مسئلہ خود آنحضرت صلعم کے لئے بھی کسقدر دشوار تھا۔

جہاں تک روایات کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ اخلاق و اعمال، فضائل و مراتب کے اعتبار سے ان دونوں بزرگوں کا مرتبہ تمام صحابہ سے بہت بلند ہے، مگر خود ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا کیسر اشکال سے خالی نہیں۔

بہتر ہوگا کہ خلافت کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے پہلے ہم ان دونوں بزرگوں کا صحیح پوزیشن سمجھ لیں اور دیکھیں کہ اسلام کے آڑے وقتوں میں انھوں نے کیا کیا خدمات انجام دی ہیں۔ یہ طویل بحث مندرجۂ ذیل عنوانات کے ماتحت آسکتی ہے:۔ قبول اسلام، اعانت اسلام، مسئلہ امارت و خلافت، میں انھیں

عنوانات کے ماتحت اس وقت بحث کروں گا۔

قبول اسلام

یہ مسئلہ کہ سب سے پہلے مشرف بہ اسلام کون ہوا؟ نہ کوئی اہمیت رکھتا ہے نہ مسئلۂ خلافت پر اس کا کوئی خاص اثر پڑتا ہے، حضرت علی سب سے پہلے ایمان لائے ہوں خواہ حضرت ابوبکر، اس حقیقت سے تو شاید کسی کو انکار نہیں کہ صحابہ میں سے کوئی اور شخص ان سے پہلے ایمان نہیں لایا، امام ابوحنیفہ نے اس اولیت کے جھگڑے کو نہایت عاقلانہ طریقہ پر ختم کیا ہے اور وہی جمہور علما کا مسلک ہے یعنی یہ کہ:۔ "ابوبکر مردوں میں سب سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے اور علی نے بچوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا، اور خدیجہ عورتوں میں سب سے پہلے ایمان لائیں۔ (تاریخ الخلفا فصل فی اسلام ابی بکر)

اعانت اسلام

اس عنوان کے ماتحت مجھ سے پہلے حضرت علی کے مناقب پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے اس لئے اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں تاہم میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حضرت علی نے ابتدائے اسلام سے آخر وقت تک جو اسلام کی شاندار اعانت فرمائی ہے اُس کی نظیر صحابہ کی تاریخ میں ملنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے، غزوۂ بدر، غزوۂ احد، غزوۂ خندق، غزوۂ خیبر اور غزوۂ حنین کوئی ایسا معرکہ نہ تھا جس میں حضرت علی کو نمایاں اور امتیازی خصوصیت حاصل نہ ہوئی ہو ۔۔۔ ہجرت کے موقعہ پر بھی جو جاں نثاری حضرت علی نے دکھائی کسی دوسرے شخص سے مشکل تھی، ایسے خطرہ کی حالت میں بستر رسول پر لیٹ رہنا معمولی جانبازی کا کام نہ تھا ۔۔ لیکن اس سلسلہ میں بڑی ناانصافی ہوگی اگر حضرت ابوبکر کے خدمات کو نظر انداز کر دیا جائے حضرت علی نوجوان تھے بہادر اور شیر دل تھے اس لئے میدان کارزار ہمیشہ اُن کے ہاتھ رہا، حضرت ابوبکر بوڑھے اور کمزور تھے اس لئے گو انھیں معرکہ ہائے جنگ میں کوئی طرۂ امتیاز حاصل نہ تھا تاہم جو دینی اعانت اُن کی طرف سے کی گئی اُس کی تین بڑی یادگاریں اسلامی تاریخ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اور وہ یہ ہیں عمائد قریش کو مسلمان بنانے کی کوشش کرنا، اسلام کی ترقی میں روپیہ صرف کرنا، نومسلم غلاموں کو آزاد کرنا۔

حضرت ابوبکر نے مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد دوسرے شرفاء قریش کو بھی مسلمان بنانے کی کوشش کی اور ترقی اسلام کو اپنی زندگی کا ایک اہم مقصد بنا لیا، چنانچہ عثمان بن عفان، زبیر بن عوام، عبدالرحمن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، طلحہ بن عبداللہ وغیرہ حضرت ابوبکر ہی کے ذریعہ سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔

(سیرۃ ابن ہشام باب ابتداء افتراض اللہ علی النبی من الصلوٰۃ)

اسی طرح ترقی اسلام پر حضرت ابوبکر نے روپیہ بھی سب سے زیادہ صرف کیا، جسکی تصدیق رسول خدا صلعم کے اُس قول سے ہوتی ہے جو آپ نے اپنے آخر دور حیات میں حضرت ابوبکر کے متعلق فرمایا تھا یعنی:۔

"ما نفعنی مال احد ما نفعنی مال ابی بکرؓ۔ ابوبکر کے مال سے جتنا فایدہ مجھے ہوا کسی دوسرے کے مال سے نہیں ہوا۔

(ترمذی باب مناقب ابی بکر)

اسلام کے ابتدائی دور میں چونکہ مسلمانوں کا کوئی اقتدار نہ تھا اس لئے کفار قریش اُنھیں طرح طرح سے ستایا کرتے تھے، خاصکر اُن غریب غلاموں کو جو ایمان لاچکے تھے، مکہ کی سنگلاخ زمین پر لٹا کر اُن کے سینوں پر پتھر کی جلتی ہوئی چٹان رکھدیتے تھے، بھوکا اور پیاسا رکھکر اُن کے برہنہ جسم پر کوڑے لگاتے تھے، آہنی سلاخیں گرم کرکے اُنھیں داغتے تھے، اور اُن سے کہتے تھے کہ یا تو محمد کے دین سے پھر جاؤ یا پھر اسی حالت میں مرجاؤ۔

اسلام کی اس غربت اور کفار کے اس تشدد کے زمانہ میں حضرت ابوبکر نے سات غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جن کی تفصیل اصابہ میں درج ہے ظاہر ہے کہ اس سے انسان ترسی اور رضا جوئی الٰہی کے علاوہ اور کیا مقصد ہوسکتا تھا۔ کفار قریش کے ہاتھوں بارہا حضرت ابوبکر بھی بہت بری طرح زدوکوب کئے گئے مگر آپ اسلام اور بانی اسلام کی حمایت میں ہمیشہ سینہ سپر رہے۔

حضرت اسماء کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مشرکین کعبہ مسجد میں بیٹھے ہوئے رسول خدا صلعم کا تذکرہ کررہے تھے اسی اثناء میں آنحضرت صلعم مسجد میں تشریف لے آئے، آپ کا دستور تھا کہ لوگ جو کچھ آپ سے دریافت کرتے تھے آپ اُن سے صحیح صحیح بتا دیا کرتے تھے، کفار قریش نے آپ سے پوچھنا شروع کیا، کیا تم ہمارے معبودوں کے بارے میں ایسی ایسی باتیں کہتے ہو؟ آپ نے فرمایا ہاں میں ضرور کہتا ہوں، یہ سنتے ہی سب کے سب آپ کے لپٹ گئے۔ ایک شخص نے آکر حضرت ابوبکر کو اس واقعہ کی اطلاع دی آپ فوراً ہی موقعہ پر پہونچ گئے اور کفار کو ڈانٹ کر فرمایا: "افسوس ہے تم پر کیا تم ایک شخص کو محض اس لئے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار "خدا" ہے، حالانکہ وہ تمھارے پاس معجزات بھی لایا ہے"۔ یہ سنتے ہی کفار نے رسول خدا صلعم کو چھوڑ دیا اور حضرت ابوبکر پر پل پڑے اور اُن کو اس قدر مارا کہ جب وہ گھر واپس تشریف لائے تو سر پر جہاں بھی وہ ہاتھ رکھتے تھے بال ہاتھ کے ساتھ ہی ساتھ چلے آتے تھے، مگر وہ فرماتے جاتے تھے کہ خداوندا تو بزرگ اور برتر ہے۔

(دیکھو استیعاب ذکر عبداللہ بن ابی قحافہ)

ہجرت کے موقعہ پر جب تمام صحابہ مدینہ چلے گئے تو آنحضرت صلعم نے اپنے خاص جاں نثار اور معتمد حضرت علی اور حضرت ابوبکر کو روک لیا، ان دونوں بزرگوں کے علاوہ آپ کی نقل و حرکت کی کسی کو خبر نہ تھی، ان دونوں بزرگوں سے خدا اور اُس کے رسول کو اہم ترین خدمات لینا تھیں اس لئے یہ مکہ میں اُسوقت تک رکے رہے جب تک کہ آنحضرت کو خدا کی طرف سے ہجرت کی اجازت نہ ملی، ابن اسحاق کی روایت ہے:۔

"جہاں تک مجھے علم ہے رسول خدا صلعم کی روانگی کا کسی کو علم نہیں تھا کہ آپ کب روانہ ہوئے سوائے حضرت علی اور حضرت ابوبکر اور اُن کی اولاد کے"۔

(سیرۃ ابن ہشام باب ہجرۃ النبی صلعم)

ہجرت کی اجازت ملنے پر آنحضرت نے حضرت علی کو مکہ میں ٹھہرنے کا حکم دیا اور اُن کے سپرد وہ امانتیں کیں جو لوگوں کی آپ کے پاس رکھی تھیں، اور حضرت ابوبکر کے ساتھ مدینہ روانہ ہوئے، راستہ میں تین دن تک غار ثور میں چھپے رہے، جہاں کھانے پینے اور خبر رسانی کا انتظام پہلے سے حضرت ابوبکر نے کر رکھا تھا، تین دن کے بعد جب خطرہ کچھ کم ہوا تو حضرت ابوبکر اور آنحضرت دونوں ایک ہی اونٹنی پر آگے پیچھے بیٹھ کر روانہ ہوئے، امام بخاری نے اس مبارک سفر کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:-

"ابوبکر شیخ یعرف ونبی اللہ شاب لایعرف فیلقی الرجل ابابکر فیقول یا ابابکر من ہذا الرجل بین یدیک فیقول ہذا الرجل یہدینی الطریق فیحسب الحاسب انہ انما یعنی بالطریق وانما یعنی سبیل الخیر" (حضرت ابوبکر بوڑھے تھے جنھیں لوگ عموماً جانتے تھے، آنحضرت جوان تھے جنھیں لوگ عام طور سے نہیں پہچانتے تھے جو راستہ میں ملتا تھا وہ پوچھتا تھا کہ ابوبکر یہ تمھارے آگے کون ہے؟ حضرت ابوبکر اُس سے کہہ دیتے تھے یہ شخص مجھے راستہ کی ہدایت کرتا ہے؛

سننے والا یہ خیال کرتا تھا کہ وہ اس سے "رہبر" مراد لیتے ہیں لیکن وہ دراصل اس سے "ہادی اور مرشد" مراد لیتے تھے"۔ (بخاری باب الہجرۃ)

امارت وخلافت

اس سے پہلے کہ خلیفہ رسول سب سے پہلے کس کو ہونا چاہئے تھا اور کیوں؟ میں چاہتا ہوں کہ خلافت اور خلیفہ کے معنے کی تشریح کردی جائے تاکہ آیندہ اصل مسئلہ کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

خلافت کے معنی جانشینی کے ہیں، خلیفہ ایک مذہبی عہدہ ہے، اُس کا فرض ہے کہ وہ دینی احکام کی تعلیم و تعمیل کی کوشش کرے اور مسلمانوں کی مذہبی اور اقتصادی حالات کی اصلاح کرے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ سب سے پہلے خلیفہ کس کو ہونا چاہئے تھا اور کیوں؟ اس پر غور کرنے سے پہلے یہ طے کرنے کی ضرورت ہے کہ دراصل اس مسئلہ کا تعلق خدا سے ہے یا بندوں سے؟ عقل سے ہے یا نقل سے؟ اس کا فیصلہ ہونے کے بعد مسئلہ خود بخود واضح ہوجاتا ہے، علامہ قوشجی نے شرح تجرید میں اس مسئلہ پر کافی تفصیل سے بحث کی ہے جو درج ذیل ہے:-

"لوگوں کا اس امر میں اختلاف ہے کہ زمانہ نبوت ختم ہونے کے بعد کسی خلیفہ کا مقرر کرنا واجب ہے یا نہیں اگر واجب ہے تو خدا پر ہے یا ہم پر؟ پھر یہ وجوب عقلاً ہے یا نقلاً۔ اہل السنۃ کا خیال ہے کہ خلیفہ کا تقرر ہم پر نقلاً واجب ہے، معتزلہ اور زیدیہ کی رائے ہے کہ یہ ہم پر عقلاً فرض ہے، فرقۂ امامیہ کا خیال ہے کہ یہ خدا پر عقلاً فرض ہے اور خوارج کا عقیدہ ہے کہ یہ کسی پر بھی فرض نہیں...... مذہب اہل السنۃ کا یہ عقیدہ چند دلائل پر مبنی ہے جنمیں

سے پہلی اور سب سے بہتر دلیل اجماع صحابہ ہے، صحابۂ کرام نے اس مسئلہ کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے حتیٰ کہ رسول خدا کی تجہیز و تکفین کو بھی اس مسئلہ میں مشغولیت کی وجہ سے انھوں نے پس پشت ڈال دیا، اور اسی طرح ہر خلیفہ کے انتقال کے بعد ہوتا رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ شریعت نے حدود و سرحدوں کی نگہداشت اور جہاد کے لئے لشکروں کی تیاری اور بہت سی ایسی چیزوں کا حکم دیا ہے جس کا تعلق نظام دین کی حفاظت اور مذہب اسلام کی حفاظت سے ہے جو بغیر کسی خلیفہ کے عمل میں نہیں آسکتیں اور جس چیز کے بغیر واجبات ادا نہ ہوں وہ جیسا کہ گزر چکا واجب ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ خلیفہ کے تقرر میں اسقدر فوائد ہیں جو شمار نہیں کئے جا سکتے اور اپنے نقصانات سے حفاظت ہو جاتی ہے جو پوشیدہ نہیں اور جس چیز کی یہ حالت ہو وہ یقینی واجب ہے"۔

(شرح التجرید المقصد الخامس فی الامامۃ)

مذکورۂ بالا بیان سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ مسئلہ محض تاریخی اور سیاسی نہیں ہے بلکہ خالص مذہبی ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خلیفہ کا تقرر مذہب کے اہم ترین واجبات میں سے ہے، اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ رسول خدا کے انتقال کے بعد کیا حالات پیش آئے اور حضرت ابو بکر صدیق کا انتخاب کیونکر عمل میں آیا، اور یہ صحیح بھی تھا یا نہیں؟

رسول خدا صلعم کے انتقال کے وقت اسلامی سوسائٹی تین گروہوں پر منقسم تھی جن میں سب سے زیادہ زبردست گروہ انصار کا تھا، مدینہ خاص انھیں کا گھر تھا، وہی وہاں کے رہنے والے تھے، اور انھیں کی وہاں کثرت تھی، انھیں کی قوت و جانبازی سے معرکہ ہائے جنگ میں اسلام کو شاندار کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں، دوسرا گروہ ان مہاجرین کا تھا جن میں آنحضرت صلعم کے داماد حضرت علی اور چچا حضرت عباس اور پھوپھی زاد بھائی حضرت طلحہ بن عبداللہ اور بنی امیہ کے سرگروہ ابوسفیان شامل تھے، یہ سب لوگ حضرت علی کے مکان میں موجود تھے اور اس بات پر متفق تھے کہ حضرت علی کو جانشین رسول ہونا چاہئے اس لئے کہ وہ ہم میں سب سے افضل اور رسول خدا کے ابن عم اور داماد بھی ہیں ۔۔ دوسرے مہاجرین اس فکر میں تھے کہ خلافت کوئی موروثی چیز نہیں جس کو مسلمان بالاتفاق اپنا خلیفہ تسلیم کر لیں بس وہی جانشین رسول سمجھا جانا چاہئے اس گروہ کے روح رواں حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر جیسی با اقتدار ہستیاں تھیں۔

سب سے پہلے خلافت کا خیال انصار کو آیا اور یہ حضرات کسی ایک انصاری کو خلیفہ بنانے کے لئے ثقیفہ بنی ساعدہ جو اُن کا مشہور کونسل چیمبر تھا جمع ہوئے مسئلہ انتخاب پیش ہوا، اس کی خبر رفتہ رفتہ مہاجرین کو بھی ہوگئی، موقع کی نزاکت کا خیال کرکے وہ بھی فوراً پہونچ گئے، انصار کا خیال تھا کہ مدینہ منورہ میں سوائے

انصار کے کوئی دوسرا فرمانروا نہیں ہو سکتا، مہاجرین کی رائے تھی کہ اسوقت کسی خاص شہر یا قبیلہ کی حکمرانی کا نہیں بلکہ سارے ملک عرب کی فرمانروائی کا مسئلہ درپیش ہے اور یہ بوجہ انصار کے بس کا نہیں اس لئے کہ مدینہ کے باہر اُن کا کوئی اثر و اقتدار نہیں، انصار نے کہا اچھا منا امیر و منکم امیر، لیکن مہاجرین اسلامی شیرازہ کو منتشر نہیں کرنا چاہتے تھے، انھوں نے انصار کو سمجھایا کہ تم کو اس مسئلہ میں ہم سے جھگڑا نہیں کرنا چاہئے بلکہ ہماری مدد کرنا چاہیئے، گو اُسوقت فریقین میں کچھ کشیدگی پیدا ہو گئی تھی مگر انصار کی صلح پسندی کی یہ شان اُسوقت بھی نمایاں تھی کہ حضرت زید بن ثابت نے جو انصار ہی میں سے تھے نہایت ایثار کے ساتھ فرمایا کہ " رسول خدا صلعم مہاجر تھے لہذا خلیفہ بھی مہاجر ہی ہونا چاہئے، ہم جس طرح آنحضرت صلعم کے جاں نثار تھے اُن کے خلیفہ کے بھی جاں نثار رہیں گے، آخر انصار کو تسلیم کرنا پڑا اور مہاجرین میں سے حضرت ابوبکر صدیق خلافت کے لئے منتخب ہوئے

اس مجلس انتخاب میں گو انصار کی نمائندگی پورے طور پر ہوئی تھی لیکن بعض سر برآوردہ مہاجرین جن پر نظر انتخاب بالکل بجا طور پر پڑ سکتی تھی موجود نہ تھے اس لئے حضرت ابوبکر کا یہ انتخاب گویا ایک فوری انتظام تھا، چنانچہ حضرت ابوبکر نے اس انتخاب کے کچھ روز بعد فرمایا بھی تھا کہ "میں وقتی انتظام کے طور پر خلافت کے لئے منتخب کیا گیا تھا اب اطمینان کی حالت ہے، مسلمان جسے پسند کریں اپنا خلیفہ بنائیں، مگر عام طور سے مسلمانوں کی نظروں میں سیاست و تدبر کے علاوہ بعض مصالح کی بنا پر حضرت ابوبکر سے زیادہ خلافت کے لئے کوئی دوسرا موزوں نہیں تھا، اس لئے انھوں نے کسی جدید انتخاب کی ضرورت نہیں سمجھی۔

حقیقت یہ ہے کہ قبائل عرب سے حضرت علی کے تعلقات بہت زیادہ پیچیدہ ہو گئے تھے کچھ تو اس وجہ سے کہ بہت سے سرداران قبائل جنگوں میں حضرت علی ہی کے ہاتھوں تہ تیغ ہوئے تھے اور کچھ اس وجہ سے کہ عام طور پر مسلمانوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اگر حضرت علی خلیفہ ہو گئے تو پھر خلافت ایک موروثی چیز ہو کر رہ جائیگی اور یہ اسلام جیسے آزاد خیال اور مساوات پسند مذہب کی پیشانی پر ایسا کلنگ کا ٹیکہ ہو گا جو کبھی مٹائے نہ مٹیگا یہ وہ بات ہے جو حضرت عمر نے بھی ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عباس سے ظاہر کی تھی اور کہا تھا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ خلافت اور نبوت دونوں تمہارے ہی خاندان میں رہیں (دیکھو طبری صفحہ ۲۷۶۸)

آنحضرت صلعم بڑے زمانہ شناس تھے، موقعہ کی نزاکت کو خوب سمجھتے تھے اس لئے آپ نے آخر وقت تک اس بارے میں کوئی حکم نہیں دیا، آپ نتیجہ سے واقف تھے، چنانچہ علامہ سیوطی نے اس بیان میں کہ آنحضرت نے کسی کو اپنا جانشین کیوں نہیں بنایا حضرت حذیفہ کی وہ حدیث نقل کی ہے جو مسند بزاز میں پائی جاتی ہے، وھو ہذا ــــ " قالوا یا رسول اللہ لم لاتستخلف علینا، قال انی ان استخلف علیکم فتعصون خلیفتی ینزل علیکم العذاب " (لوگوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ آپ ہم پر کسی شخص کو خلیفہ کیوں نہیں بناتے، آپ نے

رایا اگر میں کسی کو خلیفہ بناؤں اور پھر تم اُس کو نہ مانو تو تم پر خدا کا عذاب نازل ہوگا" (تاریخ الخلفاء بیان کو نہ صلعم لم یستخلف)
آنحضرت صلعم نے گو اپنا منشاء حدیث منزلہ[1]، واقعہ خم غدیر[2] اور مسئلہ تبلیغ آیات[3] کے سلسلہ میں پوری طرح
ظاہر کر دیا تھا جسے ہر سنجیدہ شخص جو تعصب کی عینک نہ لگائے ہو بہ آسانی سمجھ سکتا ہے، تاہم آپ اُن پیچیدگیوں کو
بھی اچھی طرح محسوس کر رہے تھے جو حضرت علی کے خلاف پائی جاتی تھیں، واقعہ قرطاس اور جیش اُسامہ کا باوجود
آنحضرت کے اصرار کے روانہ ہونا اسی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں بلکہ مجھے کہنے دیجئے کہ نماز کی امامت پر حضرت ابوبکر کا
مامور فرمانا اسی یاس کی ایک خفیف لہر کا نتیجہ تھا جو آپ کو حضرت علی کے متعلق پیدا ہو چکی تھی،

میں اس خیال سے بالکل متفق ہوں کہ آنحضرت کا دلی منشاء یہ تھا کہ اُن کے بعد حضرت علی ہی اُن کے خلیفہ ہوں
مگر ساتھ ہی میرا یہ بھی خیال ہے کہ رسول خدا صلعم حضرت ابوبکر کو بھی اس منصب کا اہل سمجھتے تھے چنانچہ حالات کو دیکھکر
جب آپ کو حضرت علی کی طرف سے مایوسی ہوئی تو آپ نے حضرت ابوبکر ہی کو امامت کے لئے منتخب کیا، نماز پڑھانیوالی
حدیث متواتر ہے، حضرت عائشہ، ابن مسعود، ابن عباس، ابن عمر، عبداللہ بن زمعہ، ابن سعد، علی ابن ابی طالب
وغیرہ سے الگ الگ روایت ہے، ابن زمعہ کا بیان ہے جس وقت آنحضرت نے یہ حکم دیا کہ "ابوبکر سے کہو نماز پڑھائیں"
حضرت ابوبکر وہاں موجود نہ تھے، حضرت عمر نماز پڑھانے کے لئے آگے بڑھے مگر آنحضرت نے تین مرتبہ فرمایا "نہیں نہیں
خدا کو منظور نہیں ہے کہ ابوبکر کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نماز پڑھائے"[4]

ہاں! میں اس کا بالکل قائل نہیں کہ آنحضرت سے اس دلی منشاء کے اظہار میں کہ اُن کے بعد حضرت علی ہی
اُن کے خلیفہ ہوں خطاء اجتہادی کا بھی امکان ہے، اس لئے کہ منشاء نبوت کا تعلق محض حضرت علی کی ذاتی قرابت
سے نہیں تھا بلکہ حضرت علی کی خداداد قابلیت اور اُن کارناموں سے تھا جن کی نظیر صحابہ کی تاریخ میں ملنا نہ صرف
مشکل بلکہ ناممکن ہے، آنحضرت کو حضرت علی سے بالکل ویسی ہی محبت تھی جیسی ایک شفیق باپ کو اپنے ہونہار
بیٹے سے یا ایک نیک دل اُستاد کو اپنے لائق شاگرد سے یا ایک فاتح بادشاہ کو اپنے شیر دل سپہ سالار سے
ہوتی ہے، اس لئے آنحضرت اگر اپنے بعد حضرت علی ہی کو اپنا خلیفہ بنانا چاہتے تھے تو اس میں کیا گناہ تھا؟

---

[1] "انت منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ الا انہ لا نبی من بعدی"۔ (بخاری، طبری، ابن ہشام وغیرہ)
[2] "من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللہم وال من والاہ وعاد من عاداہ" (استیعاب، ابن ہشام، صواعق محرقہ وغیرہ)
[3] "انی امرت ان ابلغہ انا او رجل من اہل بیتی"۔ (خصائص نسائی، طبری وغیرہ)
[4] دیکھو استیعاب ذکر عبداللہ بن ابی قحافہ۔

س مسئلہ میں خطار اجتہادی اگر تھی تو صرف اُن لوگوں کی تھی جنھوں نے خواہ مخواہ "موروثی خلافت" کے فرضی خیال
دلایک ہوّا بنا لیا تھا اور اُس کی تریخ میں کسی جایز اور ناجایز بات کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔
حضرت علی بھی ان تمام پیچیدگیوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے، اسی وجہ سے حضرت عباس نے جب اُنھیں مشورہ
دیا کہ چلو رسول خدا صلعم سے مسئلہ خلافت کے متعلق طے کرلیں تو حضرت علی بذات خود اس مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لئے
یار نہیں ہوئے اور فرمایا کہ اگر کسی وجہ سے اس وقت آنحضرت نے انکار کردیا تو آیندہ پھر کوئی امید نہیں رہیگی۔
اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حضرت علی اُسوقت کی پیچیدگیوں سے خود مایوس تھے اور اپنے متعلق خلیفہ
نائے جانے کا یقین نہیں رکھتے تھے، اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اُسوقت تک حضرت علی کی ولیعہدی یا
لافت کا اعلان بالکل نہیں ہوا تھا، ورنہ حضرت علی اور حضرت عباس وغیرہ کو اُس کا علم ضرور ہوتا اس قسم کی
تنی روایتیں ملتی ہیں جن سے حضرت علی کی ولیعہدی یا خلافت کا اعلان ظاہر ہوتا ہے غلط ہیں۔ علامۂ قوشجی نے
س مسئلہ پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، چنانچہ وہ اس قسم کی لغو روایات کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔
"جواب اس طرح دیا جاتا ہے کہ اگر ایسے عظیم الشان مسئلہ میں جس کا تعلق تمام لوگوں کی دینی اور دنیوی
صالح سے وابستہ ہے اس قسم کے نصوص قطعیہ پائے جاتے تو یہ خبر ضرور متواتر ہوتی اور صحابہ میں مشہور ہوتی اور
س پر عمل پیرا ہونے میں لوگ اُس کی وجہ سے توقف نہ کرتے اور نہ سقیفہ بنی ساعدہ میں جہاں لوگ تقرر خلیفہ
کے لئے جمع ہوئے کوئی ایسا اختلاف ہوتا کہ انصار کہتے کہ ایک خلیفہ ہم میں سے ہو جائے اور ایک تم میں سے،
ہر ایک جماعت حضرت ابوبکر کو خلافت کے لئے موزوں سمجھتی اور ایک حضرت عباس کو اور ایک حضرت علی کو
ور پھر حضرت علی صحابہ سے حجت کرنے اور اور اُن سے جھگڑنے اور اپنے حق کا مطالبہ کرنے اور نص قطعی ثبوت میں
یش کرنے سے کبھی باز نہ رہتے، بلکہ وہ ضرور اپنی بات پر اڑے رہتے اور اپنے حق کا مطالبہ کرتے جیسا کہ وہ اپنے
مطالبہ پر قایم رہے جب اُن کی باری آئی اور جنگ بھی کی یہاں تک کہ صدہا آدمیوں کو فنا کر ڈالا۔ حالانکہ اُسوقت
حالات زیادہ پیچیدہ ہوگئے تھے، شروع میں یہ بات زیادہ آسان تھی اس لئے کہ وہ زمانہ آنحضرت سے زیادہ
ریب تھا اور لوگوں کی ہمتیں آنحضرت کے احکامات کی بجا آوری کی طرف زیادہ مایل تھیں۔
(شرح التجرید، المقصد الخامس فی الامامة)

یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اگرچہ حضرت علی کو اپنے خلیفہ نہ ہونے پر افسوس تھا اس لئے نہیں کہ حضرت
بوبکر نے خلافت پر غاصبانہ قبضہ کرلیا تھا بلکہ صرف اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو خلافت کا زیادہ احق سمجھتے تھے مگر انھوں
نے محض اسوجہ سے کہ حضرت ابوبکر بھی ہر لحاظ سے خلافت کے لئے موزوں تھے کبھی مخالفت نہیں
کی تا آنکہ حضرت عمر کا دور آیا اور حضرت علی اب بھی یہ سمجھکر خاموش ہو رہے کہ حضرت عمر بھی سیاست و تدبر کے

اعتبار سے اُن سے کسی طرح کم نہیں، لیکن یہ ناگواری اُسوقت بہت زیادہ بڑھ گئی جب لوگوں نے انصاف کا خون کرکے محض اس خوف سے کہ خلافت کہیں موروثی چیز نہ بنجائے حضرت علی کو ایک جایز حق سے محروم کر دیا اور حضرت عثمان کے ہاتھ پر بیعت کرلی، حضرت عثمان گو نیک دل اور پرہیز گار بزرگ تھے مگر وہ علم و فضل شجاعت و بہادری، سیاست و تدبر کسی اعتبار سے بھی حضرت علی کے ہم پلہ نہیں تھے،

حضرت علی کا جام صبر لبریز ہوچکا تھا، اُسوقت وہ ضبط نہ کرسکے، انھوں نے مجمع کے سامنے ایک تقریر کی جو روضتہ الاحباب میں بالتفصیل موجود ہے آپ نے لوگوں کو مخاطب فرماکر کہا:۔

"لوگو! میں تم کو قسم دیتا ہوں، کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا شخص ہے جس سے رسول خدا صلعم نے عقد مواخاۃ کے موقعہ پر "انت اخی فی الدنیا والآخرۃ" کہا ہے؟ کیا کوئی ایسا شخص ہے جس کے حق میں آنحضرت نے "من کنت مولاہ فعلیؑ مولاہ" کہا ہو؟ کیا میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس کو سورۂ برائت لیجانے کا امین قرار دیکر آنحضرت نے یہ کلمات فرمائے ہوں؟ "لا یؤدی عنی الا انا او رجل من عترتی" کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا شخص ہے کہ آنحضرت نے غزوات میں جب اُسے کہیں بھیجا ہو تو اُس کو تمام مہاجرین و انصار پر امیر بنایا ہو مگر اُس پر کبھی کسی کو امیر نہ بنایا ہو؟ کیا تم میں کوئی ایسا ہے جس کے حق میں آنحضرت نے "انا مدینۃ العلم وعلی بابہا" فرمایا ہو؟ کیا تم میں میرے سوا کوئی ایسا ہے جو خطرات کے مواقع اعداء کے نرغہ میں آنحضرت کے ساتھ ہمیشہ ثابت قدم رہا ہو؟ کیا تم میں کوئی ایسا ہے جو مجھ سے پہلے دائرۂ اسلام میں داخل ہوا ہو؟ کیا تم میں کوئی ایسا ہے جو سلسلۂ نسب میں، رسول خدا صلعم سے مجھ سے قریب تر ہو؟"

لوگوں نے خاموشی سے تقریر سنی اور ہر ایک سوال پر حضرت علی کی تائید کرتے ہوئے "کوئی نہیں" "کوئی نہیں" کے نعرے لگائے، آخر میں حضرت عبدالرحمن بن عوف نے کہا کہ: "آپ نے اسوقت جو کچھ بیان فرمایا سب صحیح ہے لیکن لوگوں نے حضرت عثمان کے ہاتھ پر بیعت کرلی ہے اُمید ہے کہ آپ بھی اس کی موافقت کریں گے۔"

میرے نزدیک اُس پارٹی کی خصوصًا حضرت عبدالرحمن بن عوف کی یہ زبردست خطاء اجتہادی تھی جنھوں نے حضرت علی کے مقابلہ میں ایک ایسے شخص کو ترجیح دی جو کسی طرح اس کا مستحق نہ تھا، چنانچہ بعد میں خود حضرت عبدالرحمن بن عوف اپنی آخر عمر تک اس پر متاسف رہے۔

مسلمانوں کی سب سے بڑی بدقسمتی وہ تھی جس کو یاد کرکے اکثر حضرت عبداللہ ابن عباس آنسو بہایا کرتے اور فرماتے تھے:۔

"ان الرزیۃ کل الرزیۃ ما حال بین رسول اللہ صلعم وبین المسلمین ان یکتب لہم

ذلک الکتاب "۔ (بڑی مصیبت وہ تھی جو رسول خدا صلعم اور مسلمانوں کے درمیان حائل ہوئی یعنی یہ کہ اُن کے لئے کوئی وصیت نامہ مرتب کیا جائے) ۔ (بخاری کتاب المرضیٰ)

سید خلیل الرحمٰن اعظمی

(نگار) اس مسئلہ پر میرے مضمون کی اشاعت کے بعد سنی و شیعہ حضرات کے مضامین بکثرت موصول ہوئے، لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے اکثر ایسے تھے جن میں طعن و تشنیع اور مناظرانہ کج بحثی کے سوا اور کچھ نہ تھا، اسی لئے میں نے ان کو شایع نہیں کیا۔ بعض البتہ ایسے تھے جنکی اشاعت کو گوارا کیا جا سکتا تھا اور انھیں میں سے ایک یہ مضمون ہے جسے اس ماہ کے رسالہ میں شایع کیا جا رہا ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ فاضل مقالہ نگار نے بہت سلجھے ہوئے انداز میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے، لیکن افسوس ہے کہ جس اصول پر میں گفتگو چاہتا ہوں اس کا لحاظ اس میں بھی نہیں رکھا گیا۔ عام طور پر مناظرہ کرنے والوں کی عادت یہ ہے کہ فریق کو مطمئن کرنے کی کوشش وہ بالکل نہیں کرتے بلکہ اپنی بات کی پچ میں صرف الزامی جواب دینا زیادہ پسند کرتے ہیں اور اسی کو بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔ گالی کا جواب گالی سے دینا بُرا نہیں لیکن اسی وقت جب ہم پہلے یہ تسلیم کرلیں کہ سب سے پہلے جس نے گالی دی تھی اس نے کوئی اچھا کام کیا تھا۔

سنی شیعہ نزاع کا قیام آج تک صرف اسی وجہ سے قایم ہے کہ ہر فریق بجائے اس کے کہ دوسرے کو معقول دلایل سے قایل کرے، گالیوں پر اُتر آتا ہے اور ایسی تلخ گفتگو کرتا ہے کہ دوسرے فریق میں بجائے سمجھنے کے انتقام کی خواہش پیدا ہوجاتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس جذبہ کو معقولیت سے کیا واسطہ؟ میں نے ہر تام کے مضمون کو صرف اسی لئے پسند کیا کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ نہایت سنجیدگی سے لکھا گیا تھا اور دلایل صرف وہی پیش کئے گئے تھے جن کے ماننے پر سنی جماعت کو مجبور ہونا چاہئے تھا کیونکہ تمام روایات سنیوں ہی کی معتبر کتابوں سے لی گئی تھیں۔ اب اگر کوئی صاحب اس کے جواب میں ان روایات کو پیش کریں جنھیں شیعہ حضرات تسلیم نہیں کرتے ہیں تو بالکل بے نتیجہ بات ہوگی۔

چنانچہ ہمارے دوست مولوی سید خلیل الرحمٰن صاحب اعظمی نے بھی اسی اچھے حربہ سے کام لیا، یعنی اپنے پورے مضمون میں جہاں تک روایات کا تعلق ہے کوئی ایک سند بھی ایسی پیش نہیں کی

جس کے تسلیم کرنے پر شیعہ جماعت مجبور ہو۔ فریق ثانی نہایت آسانی سے اس پورے مقالہ کا جواب یہ دے سکتا ہے کہ جو روایات اس میں درج کی گئی ہیں وہ یکسر لغو و مہمل ہیں۔ برخلاف ہر نام کے مضمون کے کہ اس کا جواب سنیوں کی طرف سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم ان روایات کو تسلیم نہیں کرتے،

میں نے جو کچھ فروری کے نگار میں لکھا وہ اسی اصول کے ماتحت تھا یعنی یہ کہ امامت و وصایت جناب امیر کے باب میں تمام روایات کو تسلیم کرنے کے بعد ایک انتہائی آزاد خیال شخص کی طرف سے اس کی تردید میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے اب فضایل وغیرہ کی بحث یا یہ کہ رسول اللہ نے جناب امیر کی ولایت و امامت کا اعلان کیا یا نہیں بالکل دور از کار بات ہے۔ اب تو اس امر کو اپنی جگہ مسلم قرار دیکر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اس سلسلہ میں لازماً انھیں تمام مسایل کی چھان بین کرنا پڑے گی جنکا ذکر میں نے اپریل کے نگار میں کیا ہے اور جن پر اظہار خیال کی دعوت میں نے خصوصیت کے ساتھ شیعی علماء کو دی ہے۔

اعظمی صاحب نے تین عنوانات سامنے رکھ کر بحث کی ہے ۔ قبول اسلام، اعانت اسلام، مسئلہ امارت و خلافت۔ اول الذکر دو عنوانات تو قطعی قابل اعتنا نہیں ہیں کیونکہ انکا کوئی اثر مسئلہ خلافت و امامت پر نہیں پڑتا، رہگیا تیسرا مسئلہ سو افسوس ہے کہ اس کو جیسا کہ چاہئے تھا طے نہیں کیا گیا۔ فاضل مضمون نگار نے ابتدا میں ظاہر کیا ہے کہ مسئلہ خلافت خالص مذہبی مسئلہ ہے لیکن آخر میں اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ رسول اللہ نے اس کا کوئی فیصلہ اپنی زندگی میں نہ کیا تھا۔ حیرت ہے کہ رسول اللہ معمولی نہانے دھونے کے معمولی مسایل تو اپنی زندگی میں لوگوں کو بتا جائیں اور خلافت ایسے اہم معاملہ کو جس پر اسلام کے مستقبل کا انحصار تھا غیر طے شدہ چھوڑ جائیں۔ اگر امامت و خلافت کا مسئلہ واقعی خالص مذہبی مسئلہ ہے تو ہم کو ماننا پڑیگا کہ رسول اللہ نے اس کا فیصلہ ضرور کیا اور وہ فیصلہ یقیناً حضرت علی کے حق میں تھا، جس کے بعد نہ اجماع کی کوئی اہمیت باقی رہجاتی ہے نہ مصلحت وقت کی۔ اس سلسلہ میں اعظمی صاحب نے جن روایات یا جن کتابوں کی مدد لیکر فیصلہ فرمایا ہے وہ صرف وہی ہیں جو "تنہا پیش قاضی روی راضی آئی" کے تحت میں آتی ہیں ــــ جب تک شیعہ، سنی روایات کو سامنے رکھکر اور سنی شیعی روایات کے استناد پر گفتگو نہ کریں دوسرا فریق مطمئن نہیں ہو سکتا۔ آپ لاکھ کہا کریں کہ رسول اللہ نے آخر وقت میں نماز کی امامت حضرت ابوبکر کے سپرد کرکے گویا خلافت کا مسئلہ بھی طے فرما دیا تھا، لیکن شیعہ اس کو مانتے کب ہیں۔ بات ایسی کہئے جو فریق مقابل کو مطمئن و ساکت کرے ورنہ یوں یہ جھگڑا نہ مٹا ہے نہ آیندہ مٹ سکتا ہے۔ گزشتہ ماہ کے رسالہ میں ہر نام صاحب کا ایک اور مضمون شایع ہوا ہے جس پر ایک نوٹ کے ذریعہ سے میں نے شیعی علماء کو متوجہ کیا ہے کہ وہ اُن عنوانات پر اظہار خیال فرمائیں جو ماہ مارچ ۳۶ء کے نگار میں میں نے متعین کئے ہیں ــــ امید ہے کہ جنوری ۳۷ء سے قبل میں اس موضوع پر میں کوئی بسیط مقالہ پیش کر سکونگا اعظمی صاحب اسکا انتظار کریں، ممکن ہے گفتگو کیلئے بعض بالکل جدید پہلو نکل آئیں اور وہ بھی میری طرح آخر میں یہ ماننے پر مجبور ہو جائیں کہ جبتک روایات کو چھوڑ کر صرف درایت کے نقطۂ نظر سے گفتگو نہ کی جائے اس کا فیصلہ دشوار ہے۔

تاریخ کا ایک سیاہ ورق

رُوما کے دورِ استبداد کا ایک خونچکاں منظر

روما کی شہر پناہ سے باہر دریا کے کنارے، گنجان درختوں کے خنک سایہ میں جلبا بیٹھا ہوا ہے اور پاس ہی اس کی بیوی تیرا لیٹی ہوئی ہے جو یونان کی خوبصورت عورتوں میں خاص امتیاز رکھتی تھی۔ ہرچند جلبا افریقہ کا رہنے والا تھا اور ایک یونانی عورت سے اس کا پیوند کوئی معنی نہ رکھتا تھا، لیکن محبت نے جو بہری بھی ہے اور اندھی بھی، تیرا کو نوجوانانِ روما کی التجا کی طرف متوجہ ہونے دیا نہ سہی قدان یونان کی تیکھی صورتوں پر، اور جلبا کا گرویدہ بنا دیا جو یقیناً اپنی شکل و صورت کے لحاظ سے تو بہت معمولی انسان تھا، لیکن اپنی فطرت و سیرت کے لحاظ سے بالکل غیر معمولی چیز تھا۔

تیرا زمین پر اپنی دونوں کہنیاں ٹکائے ہوئے تھی اور ہتیلیوں پر ٹھوڑی رکھے ہوئے جلبا کی پُرشوق باتیں سن رہی تھی اور کبھی کبھی محبت بھری آنکھوں سے اُسے دیکھ بھی لیتی تھی۔

جلبا نے کہا ــ "اے تیرا آؤ ہم تم دونوں ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگیں کہ خدا ہماری محبت کو اسی طرح قائم اور دشمنوں کے فتنہ و فساد سے محفوظ رکھے"

تیرا اُٹھ بیٹھی اور جلبا کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی کہ ــ "اے جلبا، اے میری زندگی کی تنہا مالک، میں تو روز صبح اُٹھکر یہی دعا مانگا کرتی ہوں۔ جب تم محل چلے جاتے ہو تو میں گڑگڑا کر خدا سے یہی التجا کرتی ہوں کہ بارالہٰا، میرے جلبا کو دشمنوں کے حسد سے محفوظ رکھ اور شہنشاہ کی نگاہ میں اسے اور زیادہ عزیز بنا دے۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ خدانخواستہ اگر تمھیں کوئی گزند پہونچگیا، تو میں کسی طرح زندہ نہیں رہسکتی"

جلبا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ ــ تیرا ــ تم اس سے بفکر رہو کہ دشمنوں کی چالیں مجھے کوئی نقصان پہونچا سکیں گی، کیونکہ شہنشاہ کی بڑھی ہوئی عنایتیں میری حفاظت کی ضامن ہیں ــ تم کو معلوم ہوگا کہ پہلے میں قصرِ شاہی میں ایک غلام کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن لڑائیوں میں میری خدمتوں اور جانبازیوں کو دیکھ کر شہنشاہ نے غلامی کی

زنجیریں کاٹ دیں اور مجھے صفِ اول کے امرا میں جگہ دی۔ اے نیرا تجھے خبر نہیں کہ اس غلامی کی زندگی کو میں نے کس تکلیف و مصیبت سے کاٹا ہے۔ اس لئے نہیں کہ میں غلام تھا بلکہ صرف اس لئے کہ اس حال میں نہ تم سے محبت کر سکتا تھا اور نہ تمھاری تمنا دل میں لا سکتا تھا۔ لیکن شکر ہے کہ وہ دن آیا جسکی آرزو میں تڑپ رہا تھا شہنشاہ نے مجھے آزاد کیا اور میں اپنی محبت تیرے قدموں پر نثار کرنے کے قابل ہو سکا۔

ہر چند میں افریقہ کے کسی غلام گھرانے میں پیدا نہ ہوا تھا بلکہ میرے والدین آزاد تھے اپنے اپنے قبایل کے سردار تھے۔ جب یونان کے لشکر نے افریقہ کے صحراؤں پر فتح حاصل کی تو میں بھی اسیر جنگ کی حیثیت سے روما لے آیا گیا اور قصر شاہی کے غلاموں میں شامل کر دیا گیا۔ اُس وقت میری عمر ۲۰ سال کی تھی۔

نیرا نے بات کاٹ کر کہا۔ " اے جلبا، مجھے یہ سب کچھ معلوم ہے اور مجھے تمھارے اصل و نسل کی وجہ سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تم شریف ابن شریف ہو اور تمھارے خصایل خود اس بات کے شاہد ہیں"

جلبا بولا۔ " اے نیرا، کچھ بھی ہو میرے لئے یہ داغ غلامی سخت تکلیف دہ تھا اور میں رات دن اسی فکر میں رہتا تھا کہ کسی طرح یہ دور ہو۔ سو خدا کا شکر ہے کہ شہنشاہ کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ میرے ہاتھ بہ نسبت شراب پلانے کے تلوار چلانے کے لئے زیادہ موزوں ہیں، اور جس کو وہ غلام سمجھتا ہے اس کی رگوں میں انتہائی آزاد خون دوڑ رہا ہے۔ ایک معرکہ میں شہنشاہ نیرون کی جان سخت خطرہ میں پڑ گئی تھی اور دشمن کی فوج کا ایک سپاہی اپنا نیزہ شہنشاہ کے سینے میں پیوست کرنے ہی والا تھا کہ میں نے آگے بڑھکر ایک ہی وار میں اسکا سر قلم کر دیا۔ شہنشاہ نے خوش ہو کر مجھے آزاد کر دیا اور امرا کی صف میں جگہ دیکر خاص اپنی باڈی گارڈ کا افسر بنا دیا۔ نیرا، سچ کہو کیا میں نے اپنی آزادی بہت سستے داموں خریدی ہے؟ "

نیرا نے فرطِ محبت میں اپنے ہونٹ اس کے لبوں سے ملا دئے۔ گویا جلبا نے جو کچھ کہا تھا اس پر مُہرِ توثیق ثبت کر دی۔

جلبا کی عمر ۳۰ سال کی تھی جب اس کی شادی نیرا سے ہوئی۔ نیرا، سپہ سالار روما لوکو لوس کے ایک دوست کی بیٹی تھی جو لڑائی میں مارا گیا تھا اپنے دوست کی موت کے بعد لوکو لوس نے نیرا کو اپنی بیٹی بنا لیا تھا جو خود بھی بیٹیوں ہی کی طرح اس سے محبت کرتی تھی۔

جب تک جلبا آزاد نہ ہوا تھا، نہ اس میں ہمت تھی کہ وہ نیرا کے لئے پیام دے اور نہ نیرا اس کو ممکن سمجھتی تھی لیکن جب جلبا کا داغ غلامی دور ہو گیا تو لوکو لوس نے خوشی سے اس اقتران کو منظور کر لیا اور نیرا کو اس کی آغوش میں سونپ دیا۔

یہ واقعہ ۶۱ء کا ہے جب نیروَن کو تخت روما پر بیٹھے ہوئے تیرہ سال کا زمانہ گزر گیا تھا اور کامل دس سال جلبا کو غلامی کی زندگی بسر کرتے ہوگئے تھے۔ شادی کے بعد ان دونوں کی زندگی جیسی مسرور گزر رہی تھی وہ حقیقتاً ایک ایسا شیریں خواب تھی جس سے بیدار ہونے کی فرصت نہ جلبا کو تھی نہ نیرا کو، لیکن ان غریبوں کو کیا خبر تھی کہ شام وصال کی صبح کسقدر جلد، کتنی اچانک آجاتی ہے۔

اس گفتگو کے بعد جلبا اپنی بیوی نیرا سے رخصت ہوکر قصرِ شاہی میں پہونچا اور نیروَن کے حضور میں حاضر ہوکر نیرا سے اپنے عقد کا حال بیان کیا۔

جلبا اپنی گفتگو ختم بھی نہ کرنے پایا تھا کہ نیروَن کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے اور اس نے جلبا سے پوچھا "اے جلبا تو کس لڑکی کا ذکر کر رہا ہے، کیا تو نے لوکوتوس کی بیٹی نیرا سے عقد کیا ہے؟" یہ سنکر جلبا نے اپنا سر جھکا دیا۔

نیروَن ایک لمحہ خاموش رہا، اس کے بعد اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب قسم کا تبسم نمودار ہوا جس کا مطلب جلبا کچھ نہ سمجھ سکا اور بولا۔ "اے جلبا، مجھے یہ خبر سنکر بڑی خوشی ہوئی، میری طرف سے اپنی بیوی کو مبارکباد پہونچاؤ اور کہدو کہ جس طرح میں تم پر مہربان ہوں، اسی طرح اسپر بھی ہمیشہ اپنی عنایت صرف کروں گا اور تم دونوں کی اولاد پر بھی اگر تمھاری قسمت میں کوئی اولاد لکھی ہے"

جلبا فرطِ عقیدت سے زمین بوس ہوا اور نیروَن کے ہاتھوں کو بوسہ دیکر ایک طرف خاموش کھڑا ہو گیا۔

جلبا اپنی خدمات سے فارغ ہوکر گھر کی طرف لوٹا لیکن قبل اس کے کہ وہ مکان کے اندر داخل ہوتا اس نے معلوم کیا کہ محلہ میں کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ گھر پہونچکر اپنی بیوی سے دریافت کرے گا لیکن اسی وقت محلہ کی ایک عورت کی آواز اس کے کانوں میں پڑی جو پڑوسن سے کہہ رہی تھی کہ۔ "ہاں، ہاں، میں نے خود دیکھا کہ سپاہیوں نے اسے آکر پکڑا اور گاڑی میں بٹھا کر لے گئے۔ غریب کا شوہر بھی گھر پر موجود نہ تھا"

جلبا یہ سنکر سراسیمہ ہو گیا اور فوراً گھر پہونچا۔ یہاں آکر دیکھا کہ محلہ والے جمع ہیں اور اس کی ضعیف خادمہ سے سارا حال دریافت کر رہے ہیں۔ اس کو دیکھتے ہی خادمہ نے اپنا سر پیٹ لیا اور سارا حال بیان کیا کہ سپاہی کیونکر گھر میں گھس کر زبردستی نیرا کو لے گئے۔

یہ سنتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور اب وہ سمجھا کہ نیروَن کے اس تبسم کا کیا مطلب تھا جو نیرا کی شادی کا حال سنکر اس کے چہرہ پر پیدا ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموش سکتہ کی سی حالت میں کھڑا رہا اور پھر اسنے ایک نہ ضبط ہونے والے جوش کے ساتھ اس حال میں کہ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں مجمع سے مخاطب ہوکر کہا کہ۔ "اے لوگو، گواہ رہو، میں اس آگ کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کی ہم تم سب پرستش کرتے

ہیں کہ میں اب اس گھر میں زندہ واپس نہ آؤں گا۔ نیرون نے میرے ماں باپ کو ہلاک کیا، میرے وطن کو تباہ کیا، میری آزادی کو چھینا اور اب وہ میری بیوی بھی لینا چاہتا ہے۔ سو یہ قیامت تک ممکن نہیں۔ اگر نیرون کو میں ہلاک نہ کر سکا تو نیرا اور اس کے ساتھ ہی میری موت یقینی ہے۔"

لوگ اسے سمجھاتے ہی رہے لیکن وہ ایک مجنوں کی طرح صفیں چیرتا ہوا قصر کی طرف واپس گیا۔

جس وقت وہ محل کے پھاٹک پر پہونچا تو غصہ سے اس کا چہرہ سرخ تھا اور منھ سے کف جاری تھا، لیکن پہرہ والوں نے اسے نہیں روکا، کیونکہ سب اس کے مرتبہ سے واقف تھے۔ وہ سیدھا اس کمرہ میں پہونچا جہاں نیرون کے سامنے عورتیں گرفتار کر کے پیش کی جاتی تھیں اور دروازہ پر پہونچتے ہی اس کی آنکھوں نے سخت ہولناک منظر دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ نیرا بے حس و حرکت فرش پر پڑی ہوئی ہے اور آثار حیات بالکل مفقود ہیں۔ قصر کے سرداروں کی ایک جماعت جن کے ساتھ وہ خود بھی کام کرتا تھا لاش کے گرد موجود ہے اور جلبا کو رحم و لطف کی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔

آخر کار جماعت میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور بولا۔ "اے جلبا، ہم سب کے دل تمہارے لئے کڑھ رہے ہیں اور نیرا کی موت پر آنسو بہا رہے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ کچھ مسرت بھی شامل ہے اور وہ یہ کہ تمہاری بیوی جیسی زندگی میں پاکدامن رہی ہے ویسی ہی وہ مرنے کے بعد بھی ہے۔ اس نے تمہارے ناموس کو آخر وقت تک قایم رکھا اور اپنے لانبے لانبے بالوں سے خود اپنا گلا گھونٹ کر نیرون کو اس کا موقعہ نہ دیا کہ وہ اس کی عزت پر حملہ کرتا۔

جلبا خاموشی سے استادہ رہا اس حال میں کہ آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا جاری تھا اور اس کا سینہ سانس کی آمد و شد کے لئے تنگ نظر آتا تھا۔ جب اس کیفیت میں کچھ کمی پیدا ہوئی تو آگے بڑھا اور نیرا کی لاش پر جتنے آنسو باقی رہ گئے تھے وہ بھی اس نے بہا دئے۔ اور پھر ایک ایسی دردناک آواز کے ساتھ جس میں کاہنوں کی سی ہیبت ناک پیشین گوئی شامل تھی بولا کہ۔ "اے نیرون، اے ملعون، سلطنت روما کے ملعون ترین فرمانروا، سن لے کہ اب تیرے ظلم کی عمر ختم ہو گئی ہے اور وہ دن دور نہیں جب تجھ کو بھی تنگ آکر اسی طرح جان دینا پڑے گی جس طرح نیرا نے دی"۔ یہ کہکر اس نے خنجر نکالا اور آناً فاناً اپنے سینہ میں پیوست کر دیا۔

اس واقعہ کو ٹھیک ایک سال کا زمانہ گزرا تھا کہ ۶۸ء میں نیرون کے خلاف ملک نے بغاوت کی اور نیرون کو آخر کار خودکشی کرنا پڑی۔

عالمِ نباتات کا رازداں

سر جگدیش چندر بوس

مشرقی بنگال کے دور افتادہ گاؤں میں جو محنتی کاشتکاروں سے آباد ہے ایک قطعہ آراضی ہے جس میں نہ تو چاول اُگتے ہیں اور نہ ترکاریاں اور نہ پھول کے درخت بلکہ وہاں عجیب حالات کے پودے ہوتے ہیں جو قدرت نے انسان کے لئے نہیں پیدا کئے ہیں، اگر کسی جھاڑی کے قریب کھڑے ہوکر کسی دہقانی راہ گیر سے اس باغ کے متعلق آپ کو سوال کرنے کا اتفاق ہو تو وہ یہی کہیگا کہ یہ باغ "جگدیش چندر بوس" کی ملکیت ہے اور یہی وہ جگہ ہے جہاں ہر پودے اُن سے گویا کہ ہمکلام ہوتے ہیں۔

"سر جگدیش چندر بوس" کی شہرت بحیثیت ماہر سائنس کے چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہے اُن کی عمر اگرچہ (۷۶) سال کی ہو چکی ہے تاہم اب بھی وہ پودوں کی مخفی قوتوں کے چشمہ کی تلاش میں رہتے ہیں، اُنھوں نے سائنس کی تعلیم لندن اور کیمبرج کے دارالعلوموں میں پائی اُس کے بعد واپسی پر اُن کو کلکتہ کے دارالعلوم میں طبیعیات (Physics) کا پروفیسر مقرر کیا گیا جہاں کسی دارالعمل (Laboratory) کے نہونے کے باعث انھوں نے روشنی اور برقی لہروں کی تحقیقات کے لئے آلات بنانا شروع کئے اُن کا کام دور دراز ملکوں میں بہت سراہا گیا لیکن وہ روشنی کی شعاع جس سے اُن کی تحقیقات کی ابتدا ہوتی ہے ناتمام رہ گئی، اُنھوں نے کہا کہ کسقدر اندھے ہیں ہم لوگ اور کس قدر محدود ہمارا علم ہے یہ تھوڑا بہت جو کچھ ہماری نظروں کے سامنے ہے یہ اُس حقیقت کا کہ جس پر ہمارے علم کا دار و مدار ہے عشر عشیر بھی نہیں ہے لیکن امید کی جاتی ہے کہ جو چیزیں اسوقت تاریکی میں پڑی ہوئی ہیں وہ ضرور کسی نہ کسی دن روشنی میں لائی جائیں گی، ہم نے غیر مرئی روشنی کی جھلک دیکھ لی ہے وہ دن دور نہیں ہے جبکہ ہم روشنی کی شعاعوں کو مرئی یا غیر مرئی حالت میں ایک دوسرے کے اندر ڈوبتے نکلتے دیکھ سکیں گے۔

عرصۂ دراز تک "بوس" ان شعلوں کی تحقیقات میں رہے ۱۸۹۵ء میں انھوں نے ایک آلہ ایجاد کیا جو موجودہ لاسلکی تلغراف سے پیشتر کی ایجاد ہے۔ اُنھوں نے برقی لہروں کو اپنے آلات کے ذریعہ سے (۷۵) فیٹ کے

فاصلہ پر منتقل کیا اور جب لہروں نے اتنے فاصلہ کو طے کر لیا تب بھی اُن کے لئے کافی قوت گھنٹی بجانے، طپنچہ کا فائر کرنے، زمین دوز معدنیات میں سرنگ اُڑانے کے لئے درکار تھی، سنہ ۱۹۰۵ء میں وہ برقی شعاع کی قوت سے بغیر روشنی کی امداد کے فوٹو لینے میں کامیاب ہوئے اُس کے بعد اُنھوں نے مصنوعی آنکھ ایجاد کی جو انسانی آنکھ سے زیادہ روشنی رکھتی تھی، دوران تحقیقات میں اُن کو دو راستے نظر پڑے جس میں نئی تحقیق کی کشش سے اُنھوں نے روشنی کے شعلہ کی تحقیق کا سلسلہ منقطع کر کے مردہ چیزوں میں قوت احساس وانفعال کی تحقیق شروع کر دی اثنار تحقیقات میں اُن کو معلوم ہوا کہ برقی لہروں کے ریسیور (Receiver) مہلک ثابت ہوتے ہیں اُن کی یہ خرابی کچھ دنوں کے بعد رفع کر دی گئی نیز اُن کو معلوم ہوا کہ ریسیور (Receiver) بہت دنوں بیکار پڑے رہنے کے باعث بے حس ہو جاتے ہیں لیکن پھر اُن کو برقی قوت کی مدد سے حرکت میں لایا جا سکتا لوہے کے جوہر کی تحقیقات کے دوران میں اُنھوں نے ایک حیرت انگیز تحقیق کی کہ جو دھات برقی تحریک کے اندر کام کرتی ہے وہ انسانی شرائین سے زیادہ مشابہ ہے، پیرس بین الاقوامی علمائے طبیعیات کی کانگریس میں اپنی تحقیقات کے نتائج کو واضح کرتے ہوئے اُنھوں نے بتلایا کہ کوئی حد مقرر کر کے یہ کہنا بہت دشوار ہے کہ یہاں طبعی ظہور ختم ہوتا ہے اور حیاتیات کی ابتدا ہوتی ہے یا یہ کہ ایک مردہ مادہ کا ظہور ہے اور یہ زندہ رہنے والے قوی مادہ کا یہاں علم طبیعیات اور حیاتیات کا درمیانی امتیاز ناپید ہو کر رہ جاتا ہے،

لندن میں اپنی قیام گاہ میں جہاں وہ تھوڑے دنوں کے لئے مقیم تھے ان نتائج پر غور کرتے ہوئے اُنھوں اپنے آپ سے سوال کیا کہ اگر روح و مادہ میں صرف اتنی ہی عمومیت ہے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ نباتات کو قوت حسیہ رکھنے والا تسلیم کرتے ہوئے اُن پر بھی تجربہ کیا جائے، کیا عجب ہے کہ عمدہ نتائج برآمد ہوں، وہ جلد تر ایک باغ میں پہونچے اور وہاں سے ایک درخت کی پتیاں توڑیں اُن میں سے ایک پتی پر تجربہ کیا پتی اُن کے عمل سے متاثر ہوئی اور یہ معلوم ہوا کہ اُن کے عمل کا اس کی طرف سے جواب ملتا ہے، پھر اُنھوں نے گاجر اور شلغم پر تجربہ کیا یہاں بھی یہی صورت پیش آئی۔

"سر بوس" نے اپنے تجربات جاری رکھتے ہوئے دریافت کیا کہ پودے بھی مثل جانداروں کے کلوروفارم سے بیہوش کر دئے جاتے ہیں پھر وہ تازی ہوا سے صحت حاصل کر لیتے ہیں، وہ سردی کی وجہ سے سُن، شراب سے مست، سخت کام کرنے کی وجہ سے تھکے ہوئے، برقی تحریک سے منتشر، بیرونی جھونکوں سے زخمی اور زہر کی سے مردہ ہو سکتے ہیں۔

جب "بوس" نے ماہران فن کی ایک بڑی جماعت کے سامنے پودوں کی قوت ادراک کا اس طرح مظاہرہ کیا جس طرح کہ روشنی کی شعاع کی تیزی پیمانہ پر دکھائی جاتی ہے تو اُن میں سے ایک بے اختیار پکار اُٹھا

"ہکسلے" کو اس تجربہ میں اپنی زندگی کا بہت سا قیمتی سرمایہ صرف کر دینا پڑا تھا، اور دوسرے نے پوچھا کہ تم نے بھاپ کے اُڑا دینے کے لئے کیا تدابیر اختیار کیں، جبکہ تم نے یہ تحقیقات کی ہے تو تم کو بتلانا چاہئے ورنہ اس پر قبضہ پانے کے لئے تم اپنے آپ کو ہلاکت میں مبتلا کر لوگے لیکن ماہرین فن کی عام جماعت نے جب اُن کے کام کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا تو اس غیر معمولی مسئلہ کے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ تمام جوابدہی کے خصوصیات جو کہ جاندار اعصاب میں پائے جاتے ہیں پودوں میں بھی ہیں علمائے حیاتیات نے اُن کو اپنی عملداری پر حملہ آور پاکر نکتہ چینی شروع کی اور اُن کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی تحقیقات کو محض علم طبیعیات ہی تک محدود رکھیں، "بوس" کو اس نکتہ چینی کا مقابلہ کرنا پڑا جو ذرا درشتی کی حد تک پہونچ گئی تھی، اُن کی راہ میں روڑے اٹکائے گئے ایک مشہور ماہر فن نے اُن کے کام پر چھاپہ مارنا چاہا، اُن کا نظریہ فضول اور بیکار سمجھا گیا اور یہ قرار دیا گیا کہ وہ ہندوستانی داغوں کی موروثی فطرت کے مطابق پوشیدہ علوم اور گمراہ تخیل کو پیش کر رہے ہیں،

آلات ایجاد کئے گئے تاکہ ان کی امداد سے درختوں کے ریشوں کی دھڑکن محسوس کی جاسکے انمیں کا ایک تو اسقدر ذکی الحس ہے کہ اُس کی امداد سے ایک سکنڈ کا ۱/۱۰۰ حصہ بھی محسوس کیا جاسکتا ہے، مقناطیسی مقیاس کی حرکت کو ایک لاکھ گنا بڑھا سکتا ہے علاوہ ازیں ایک خاص آلہ کی مدد سے جو دھوپ میں پودوں کی کاربن (Carbon) ہضم کرنے کی کارگزاری کو ناپ سکتا ہے۔ کاربو ہائڈریٹ (Carbohyderate) کی ساخت کو ایک گرام کے ایک لاکھویں حصہ تک ناپا جاسکتا ہے۔

انگریز قوم نے "بوس" کے ایک تجربہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ "میڈا ویل" کے قریب ایک کمرہ میں غیر اجازت یافتہ تجربہ خانہ کی میز سے بندھی ہوئی ایک گاجر موجود ہے اور ایک تار ہے جو دو شیشوں کی نلکیوں کے اندر سے گزرتا ہے جو ایک سفید رطوبت سے پُر ہیں اور جو گاجر سے نکلی ہوئی دونوں ٹانگوں کے مثل معلوم ہوتی ہیں، جب گاجر میں چٹی کی نوکیں چبھودی جاتی ہیں تو وہ اینٹھنے لگتی ہے، یہ گاجر اس طرح بندھی ہوئی ہے کہ جب برقی رو کی تکلیف اُس کے لمبے بازوؤں کو جو ایک بہت ہی نازک لیور (Lever) سے متصل ہیں اور چھوٹے آئینہ سے مشابہ ہیں کھینچتی ہے تو یہ کمرے کے دوسرے سرے کی گلر پر شعاع کو پکڑ لیتی ہے اور اس طرح گاجر کی سرزنش میں غیر معمولی اضافہ کر دیتی ہے اس کے دائیں جانب ایکبار چبھو دینے سے شعلہ دائیں جانب سات یا آٹھ فیٹ پر جا پہونچتا ہے، تار کی دوسری سمت پر چبھو دینے سے بالکل بائیں جانب دوڑ جاتا ہے اس طرح سائنس گاجر ایسی بے حس ترکاری کے احساس کو بھی روشنی میں لاسکتی ہے،

بہت سے ادیب، اخبار نویس، حتیٰ کہ مدبرین بھی "میڈا ویل" میں ایک ہندوستانی کے اس عجیب و غریب تجربہ کو دیکھنے کے لئے پہونچے اُن لوگوں میں برناڈ شا بھی تھے جو ترکاری کھانے کے عادی ہونے کی

حیثیت سے اس بات کو دیکھ کر پریشان ہوئے کہ ایک کرم کلہ کا ٹکڑا بھی موت کے آہنی پنجہ میں گرفتار ہے۔

ہر سال نئے تجربات ہوتے تھے، عجیب عجیب قسم کے سوالات کے جوابات دئے جاتے تھے، مثلاً کیا پودے بھی ایک بادل کے گزرنے سے کمزور ہوجاتے ہیں؟ کیا وہ ذہن رکھتے ہیں؟ کنول کیوں دن بھر سوتے ہیں اور رات بھر جاگا کرتے ہیں؟ کیوں ذکی الحس موسہ (mamosa) کے پودے جب چھوئے جاتے ہیں تو بیدار ہوجاتے ہیں؟ کیونکر عرق کشش کی قوت کے خلاف پودوں کے تنوں میں چڑھتا ہے؟ کیا سخت سے سخت پودے بھی خارجی تحریک کا جواب دیتے ہیں؟ آخری سوال کا جواب فرید پور کی ایک کتاب "عبادت گزار کھجور کا درخت" کے مطالعہ سے ملا، "بوس" سے بیان کیا گیا کہ جب مندر کے گھنٹے بجتے ہیں اور لوگوں کو پوجا پاٹ کے لئے بلاتے ہیں تو یہ درخت اس طرح جھک جاتے ہیں جیسے کہ عبادت کر رہے ہیں اور پھر صبح کو آپ ہی آپ کھڑے بھی ہوجاتے ہیں یہی حرکت ہر روز اُن سے سرزد ہوتی ہے، دہقانوں کا خیال ہے کہ کسی متوفی شخص کی روح اس میں سرایت کرگئی ہے جو اس طرح عبادت کیا کرتی ہے، یہ بھی کہا گیا کہ درخت سے عجیب وغریب امراض کے علاج کئے جاتے ہیں "بوس" اپنے اوزاروں کو لیکر فرید پور پہونچے اور درخت کی حرکات قلمبند کیں اُن کو معلوم ہوا کہ پودوں کے جھکنے اور خود بخود سیدھے ہوجانے کا راز موسمی حرارت کے تغیر و تبدل میں ہے دوسرے درختوں کے تجربہ سے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے، ہر درخت حرکت کرتا ہے اور اُس کی اس حرکت کا انحصار اُس کے گرد و پیش کی فضا پر منحصر ہوتا ہے۔

جگدیش چندر بوس، شاعر بھی ہیں اور سائنسداں بھی، اس بارہ میں وہ ہندوستان کے حقیقی سپوت ہیں ہندو بالطبع فلسفی مزاج ہوتا ہے اس کو اس کی کمزوری سمجھئے یا طاقت کہ وہ اپنی قوت خیال کی بدولت حقیقت کو تلاش کرتا ہے لیکن "بوس" نے تخیلی تجربات سے حقیقت کی تلاش کی اُنھوں نے اپنے طریقوں میں مشرقی تخیل اور مغربی منطق کی تقلید کی۔

غالباً اُن کے وسیع مطالعہ اور سر رابندر ناتھ ٹیگور سے دوستانہ تعلقات کی بنا پر یہ عجیب امتزاج پیدا ہوا ہے کیونکہ ایک طرف تو "بوس" کو اُن طریقوں اور تجربوں کا شوق ہے اور دوسری طرف "ٹیگور" کو ادبی فنی دونوں خصوصیات حاصل ہیں۔

ایک مرتبہ بہت دن ہوئے کہ بوس کے پاس ٹیگور کا ایک خط پہونچا جس میں اُنھوں نے ان کو اسے بلایا تھا کہ وہ کچھ دن اُن کے ساتھ اُن کے دیہاتی مکان میں گزاریں اس خیال سے کہ شاعر ہر روز ایک قصہ لکھ کر شام کے وقت اُن کو سنایا کرے گا۔

"ٹیگور" اُس وقت تک یورپ اور امریکہ میں روشناس نہ تھے اگرچہ وہ ہندوستان کے امراء

ان کو متعارف کر دینے کی غرض سے بوس نے ایک مختصر سا قصہ لکھا اور اس کا ترجمہ امریکہ کے ایک مجلہ میں بھیجا جو وہاں سے واپس کر دیا گیا بعد میں پھر اُسی قصہ کو شاہکار تسلیم کرکے اس پر نکتہ چینیاں کی گئیں۔

آج بھی سر جگدیش چندر بوس، اسی طرح پودوں کے انکشافات حال میں مصروف ہیں لیکن ان کی محنت کے دنوں کی وہ تنہائی اور فرصت اب کہاں اب ایک جماعت ایسے طالبعلموں کی ان کو گھیرے رہتی ہے جو غریب ہیں اور اپنی زندگیاں تحقیقات میں بسر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اُن کے لئے آسانیاں بہم پہونچانے کے خیال سے "بوس انسٹیٹیوٹ" کا افتتاح کیا گیا ہے، ادارہ کے کالمنوں پر بھی بجلی کی تڑپ کی علامت بنی ہوئی ہے، اگر ہاں کی چھت پر ایک چمکدار کنول کی تصویر بنی ہوئی ہے جو اجنٹا سے حاصل کی گئی ہے اور جس کے کناروں پر نمونہ کا خوش ذکی الحس پودہ بنا ہوا ہے جس نے اپنے راز کا انکشاف بمقابلہ دوسرے پودوں کے آسانی کے ساتھ کرایا اور جو انسان کے مقابلہ میں دس گنا ذکی الحس ہوتا ہے۔

دیواروں پر علم الاصنام کے مرقع بنے ہوئے ہیں ہندوستانی مکتبین کے سب سے بڑے نقاش نند لال بوس کے قلم سے کندہ کی ہوئی "تلاش" کی تصویر موجود ہے ادارہ گزشتہ سنہ میں قایم کیا گیا ہے اس کا انتظام زندگی کے ہر شعبہ کے بنیادی اتحاد پر روشنی ڈالتا ہے۔

"بوس" کہتے ہیں کہ خواہ کتنے ہی ماہرین فن اس کی تحقیق میں جان توڑ کوشش کیوں نہ کریں قدرت کی حقیقت کا ادراک ناممکن ہے اس لئے کہ وہ ہر لمحہ ایک نئی شان کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔

علمی تحقیقات بھی اسی طرح ناتمام رہے گی جس طرح کہ مقصد حیات لامحدود ہے۔

بہار

مولفہ الیاس احمد ایم۔ اے۔ ایل۔ بی۔ منصف سہارنپور

گلدستہ "بہار" فارسی اور اردو شعرا کے چوٹی کے کلام نسوسا غزلوں کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے۔ یوں سمجھئے کہ شعرا کی پاکیزہ زبان میں حسن و عشق کی مکمل داستان ہے۔ اس داستان کے آغاز عشق سے لیکر انجام عشق تک جتنے عنوانات قائم ہو سکتے ہیں قائم کئے گئے ہیں اور ہر عنوان کے تحت میں چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار درج ہیں عنوانات سیکڑوں ہیں۔ اس گلدستے کے ہوتے ہوئے شاید ہی کسی کے دیوان کی ضرورت ہو۔ علم و ادب میں یہ گلدستہ ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے مصرعہ: "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت معہ محصول ڈاک عہ ضخامت ۲۳۶ صفحات ۔ ملنے کا پتہ:۔ منیجر صاحب۔ دارالمصنفین۔ اعظم گڑھ۔ یو۔پی

جگر مرادآبادی کی شاعری پر تنقیدی نظر

جگر مرادآبادی مشہور غزل گو شاعر ہیں اور اُردو شاعری سے ذوق رکھنے والی جماعت میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو جگر سے واقف نہ ہو۔ اُن کی غزلیں مختلف ادبی رسایل و اخبارات میں عرصہ سے شائع ہو رہی ہیں۔ انکا ایک دیوان "داغ جگر" اس سے قبل شائع ہو چکا تھا مگر اس میں ان کی شاعری کے ابتدائی نقوش تھے، ان کی غزل سرائیوں کا سلسلہ اس کے بعد بھی برابر جاری ہے اس لئے ضرورت تھی کہ جگر کے ان تمام نغموں کو ایک جگہ سمیٹ لیا جائے۔ چنانچہ اب شعلۂ طور کے نام سے جگر کے کلام کا مجموعہ شائع کیا گیا ہے۔

اس مجموعہ کے شروع میں خود جگر نے کچھ اپنے قلم سے اپنے کلام کی نسبت لکھا ہے، لیکن ان چند سطروں کو پڑھکر جگر کی نثر نویسی کے متعلق بہت خراب رائے قائم کرنا پڑتی ہے۔ فقرے اُلجھے ہوئے، جملے بے ربط، مطلب غیر واضح یہ ہے خصوصیت ان کی تحریر کی۔ ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:۔

"تلک کی موت پر جو نظم ہے اس میں سے بعض تخیل کے متعلق محض اس خیال سے کہ ایسا نہ ہو کہ "مورخ ادبی" میرے عقاید مذہبی کو بھی ویسا ہی سمجھنے لگے اس لئے یہ ظاہر کئے دیتا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم پورے شباب کے عالم میں کہی گئی جبکہ نہ مجھے مذہب کی خبر تھی اور نہ اپنی، اس لئے اس میں بیجا غلو اور بعض شدید قسم کی لغزشیں ہو گئی ہیں میں نے بہت چاہا کہ یہ نظم دستیاب ہو جائے لیکن نہیں ہو سکی، اس لئے احتیاطاً اسقدر لکھ دیا گیا"۔ اصل یہ ہے کہ جگر محض ایک "مرد شعر گو" ہیں اور وہ بھی کھوئے ہوئے اس لئے اُن سے نثر میں سلجھی ہوئی عبارتوں کی توقع محض بے سود ہے۔

اس کے بعد جناب سید سلیمان صاحب ندوی نے جگر کا تعارف "نودار د شاعر" کی سرخی سے کرایا ہے، لیکن ایک سخن شناس کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک منقبت نویس کی حیثیت سے، اس تعارف میں بعض بعض مقامات پر الفاظ اور جملے یقیناً خوبصورت ہیں مگر وہ جگر کی شاعری پر منطبق نہیں ہوتے لیکن سید صاحب سے ہمیں اس "تحسین ناشناس" کی کوئی شکایت نہیں کیونکہ ایک صاحب جبہ و دستار مرد متقشف کو "بادۂ شاعری" کے ذایقہ سے واسطہ ہی کیا؟ بہرحال اس مضمون کا مقصد نہ تو جگر کی "نثری ژولیدہ بیانیوں" سے بحث کرنا ہے اور نہ جناب سید سلیمان صاحب

کی منقبت خوانیوں کا جایزہ لینا، البتہ ہمیں اس مقالہ کے ذریعہ سے جناب جگر کی شاعری پر ناقدانہ نظر ڈالنا ہے اور ان کی شاعری کے محاسن و معائب ناظرین کے سامنے پیش کرنا۔

جگر کے اعظم گڈھی عقیدتمندوں نے ان کی شاعری کو تغزل کا "نقش آخر" ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اور اسی ضمن میں جگر کے بعض معاصرین پر موازنہ کے پردہ میں طعن و تشنیع کے دار بھی کرڈالے ہیں لیکن ہمیں ان کی ان غیر محتاط مدحت سرائیوں سے متاثر ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے "غزلیہ شاعری" ہی کے ذریعہ سے سہی تاہم جگر اردو کا خدمت گزار ہے اور اس لئے اس کے ساتھ کسی قسم کی بے انصافی کرنا ہمارے مسلک میں نازیبا ہے۔ اس میں کسی شک کی گنجایش نہیں کہ جگر ایک خوشگو شاعر ہیں، ان کے بعض اشعار دلپذیر ہوتے ہیں، صاحبانِ ذوق انھیں پڑھ کر سرور و انبساط حاصل کرتے ہیں، لیکن ان کی دلپذیری اور تاثیر کا راز ان کے خیالات کی بلندی یا ان کی "متصوفانہ حیثیت" میں مضمر نہیں ہے۔ کیونکہ حقیقت میں جگر نہ تو کوئی بلند خیال شاعر ہیں اور نہ "معارفِ تصوف" کے محرم راز۔ انھوں نے اپنی غزل گوئی کے لئے کوئی نیا راستہ بھی نہیں بنایا ہے۔ زیادہ تر وہی فرسودہ خیالات ہیں جنھیں پرانے اور موجودہ شعرا مختلف عنوانوں سے ادا کرچکے ہیں، وہی رندی اور سرمستی کے افسانے ہیں، وہی عشق و محبت کی داستانیں، وہی ہجر و وصل کے قصے، وہی گل و بلبل کی حکایتیں۔ البتہ جگر کے انداز تخیل میں شگفتگی اور اسلوب ادا میں رنگینی ضرور پائی جاتی ہے اور جہاں کہیں ان دونوں کا امتزاج حسن کے ساتھ ہوجاتا ہے تو نشاط انگیزی اور سرور بخشی کی کیفیت مخصوصیت سے ان میں پیدا ہوجاتی ہے۔

محاسن ذیل میں جگر کے چند اشعار لکھے جاتے ہیں جن سے اس خصوصیت کا اندازہ ہوسکے گا۔ ؎

جب نگاہیں اٹھ گئیں اللہ ری معراج شوق ❊ دیکھتا کیا ہوں کہ وہ جانِ بہار آہی گیا

خیال میں "نفسیاتی واقعیت" موجود ہے۔ فی الحقیقت شوق جب اپنی انتہا پر پہونچ جاتا ہے تو نگاہوں کو ہر طرف معشوق ہی معشوق نظر آتا ہے۔ تخیل کی اس شگفتگی کے ساتھ طرز ادا بھی کافی رنگین ہے۔

؎ ہنسی پھر اڑنے لگی عشق کے فسانے کی ❊ نقاب الٹ دو، بدل دو فضا زمانے کی

جب تک حسن کا جلوۂ جہاں سوز بے نقاب نہیں ہوتا عشق کی بے تابیوں اور بیقراریوں کا مذاق اڑایا ہی کرتا ہے۔ زنانِ مصر نے زلیخا پر جو لعن و طعن کی تھی وہ اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے، اس فضا کو حسن کی کرشمہ زائیاں ہی بدل سکتی ہیں۔ حضرت یوسف جب زنانِ مصر کے درمیان میں بے نقاب چلے آئے تو بجائے ترنج کاٹنے کے انھوں نے اپنی انگلیاں قلم کرڈالیں اور اس طرح لعن و طعن کی فضا بدل گئی۔ خیال بھی لطیف ہے اور اسلوب ادا بھی پاکیزہ۔

اے محتسب نہ پھینک، مرے محتسب نہ پھینک ❊ ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے

نہایت پاکیزہ شعر ہے۔ اگرچہ اس شعر میں کسی نازک خیالی سے کام نہیں لیا گیا، لیکن اسلوب بیان کی بلاغت نے

اسے جگر کی شاعری کا خاص کارنامہ بنا دیا ہے۔ ایک میخوار ہے وہ شراب سے شغلہ کر رہا ہے، محتسب آ پہونچا اُس نے جام شراب چھین لیا اور اسے پھینک دینے پر آمادہ ہے۔

غریب بادہ نوش اپنی اس جان حیات کو بچانا چاہتا ہے۔ پہلے محتسب کو مخاطب کرکے کہتا ہے "اے محتسب نہ پھینک" لیکن جب وہ اس عرض کو نہیں سنتا تو بیچارہ اس کی خوشامد کرتا ہے اور نہایت لجاجت سے کہتا ہے "مرے محتسب نہ پھینک" مگر جب وہ یہ منت سماجت بھی نہیں سنتا تو عالم بے اختیاری میں کہہ اٹھتا ہے "ظالم شراب ہے" لیکن جب وہ شراب پھینکنے کے لئے بالکل آمادہ ہی ہو جاتا ہے اور جام کو زمین پر پٹخنے کے لئے ہاتھ اونچا کرتا ہے تو وہ گھبرا کر چیخ اٹھتا ہے "ارے ظالم شراب ہے"

اس شعر میں جو بلیغ ترتیب رکھی گئی ہے اور جس جس طریقہ سے میخوار نے اپنا طرز تخاطب بدلا ہے اس کی نظیر مشکل سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

؎ وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں وہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

اس شعر میں بھی "نفسیاتی واقعیت" موجود ہے۔ اگر کوئی اپنا حبیب چلا جاتا ہے تو عرصہ تک تصور کی نگاہوں کو یہی نظر آتا ہے کہ "وہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں" اس میں بھی شک نہیں کہ جگر نے تصور کی اس کرشمہ زائی کی محاکات نہایت ہی اچھے اسلوب سے کی ہے۔

؎ کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ میں اپنا ساغر اٹھاتا ہوں تو کتاب اُٹھا

میخوار کو ساغر شراب سے زیادہ کس شے میں برق تجلی کی چمک نظر آ سکتی ہے؟ وہ اپنے زعم میں یہ سمجھے ہوئے ہے کہ کتاب میں یہ جلوے نظر نہیں آ سکتے اس لئے وہ واعظ کو چھیڑ رہا ہے اور کہتا ہے۔ اے واعظ دیکھنا ہے کدھر سے برق جلوہ چمکتی ہے۔ تو اپنی کتاب اٹھا میں اپنا ساغر اٹھاتا ہوں۔ خیال کی شوخی نے شگفتگی پیدا کر دی ہے اور اسلوب کے انشائیہ پیرایہ نے اس میں چار چاند لگا دئے ہیں۔

؎ دل پہ میرے گرائی تھیں تم نے ہی بجلیاں مگر آؤ نظر کے سامنے تجھ کو ہے اشتباہ سا

دل پر بجلیاں گرانے کا خیال تو بہت ہی فرسودہ ہے لیکن عاشق کا اس سے یہ کہنا کہ مجھے اشتباہ سا ہے کہ تمہیں نے میرے دل پر بجلیاں گرائی تھیں تم ذرا میری نظر کے سامنے آؤ تو میں دیکھ کر یہ معلوم کروں کہ میرے دل پر بجلیاں گرانے والے تمہیں ہو یا کوئی اور" بہت لطیف خیال ہے۔ معشوق کو یوں باتوں میں بہلا کر اپنے سامنے دوبارہ آنے کی ترغیب دینا اور اس خوبصورت عنوان سے شگفتگی خیال کا بہترین نمونہ ہے۔

؎ شمیم عطر بیز آئی نسیم خوشگوار آئی تم آئے سامنے یا سو بہاروں کی بہار آئی

محبوب کو شمیم عطر بیز اور نسیم خوشگوار سے تشبیہ دینا اور آخر میں اسے سو بہاروں کی بہار قرار دینا نہایت ہی

شگفتہ تخئیل ہے اور اسلوب ادا بھی اچھا خاصہ رنگین ہے۔

ان کی وہ آمد آمد اپنا یہاں یہ عالم — اک رنگ آرہا ہے اک رنگ جا رہا ہے

خیال اور اسلوب بیان دونوں کے لحاظ سے یہ شعر نہایت پاکیزہ ہے۔ "اک رنگ آرہا ہے اک رنگ جا رہا ہے" زبان کا بہترین نمونہ ہے۔

ناظرین نے اشعار بالا سے اس کا اندازہ لگا لیا ہوگا کہ جگر کے رنگ شاعری کی "انفرادیت" کے اصل عناصر کیا ہیں ناظرین کی لطف اندوزی کے لئے جگر کے چند مزید اشعار درج کئے جا رہے ہیں جن میں ان کا یہ انفرادی رنگ پورے طور سے جھلک رہا ہے۔

دل گلستاں تھا تو ہر شے سے ٹپکتی تھی بہار — یہ بیاباں جب ہوا، عالم بیاباں ہو گیا
تاریک ہوتی جاتی ہے رہ رہ کے کل فضا — پھر بھی مریض ہجر امید سحر میں ہے
جھلملاتے ہوئے تاروں کا یہ اللہ رے فیض — سامنے سے کوئی پردا سا ہٹا دیتا ہے
گوش مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ — سن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے
یہ بزم دل خس و خاشاک پر نہیں موقوف — اُجڑ کے بھی وہی رونق ہے آشیانے کی
آرزو و شوق تو ہیں انجمن در انجمن — اب ترا جلوہ گلستاں در گلستاں چاہئے
تم نے کیوں انجمن ناز میں تیور بدلے — دل دھڑکنے کی صدا ہے کوئی فریاد نہیں
لطافت مانع نظارۂ صورت سہی لیکن — دھڑکن دل کا کہتا ہے وہ گزرے ہیں ادھر ہو کر
مری نگاہ شوق بھی کچھ کم نہیں مگر — پھر بھی ترا شباب ترا ہی شباب ہے
غنچے اس کے ہیں گل اس کے ہیں بہاریں اسکی — خون سے اپنے بنا لے جو گلستاں کوئی
معراج شوق کہئے یا حاصل تصور — جس سمت دیکھتا ہوں تو مسکرا رہا ہے
نظر صیاد کی کیا برق بھی ہو تو لرز اُٹھے — ابھی آتا نہیں تنکوں کو جان آشیاں ہونا
اللہ ری مجبوری آداب محبت — گلشن میں رہے اور گلستاں نہیں دیکھا
میں اپنی اس نظر کی رعنائیوں کے صدقے — جو شکل ہے حسیں ہے جو شیزہ ہے جواں ہے

جگر کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد اس اعتراف میں کوئی تکلف نہیں ہو سکتا کہ اس میں شگفتہ اشعار و پاکیزہ انداز بیان کی مثالیں کافی پائی جاتی ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ خامی و بے ربطی بھی کچھ کم نہیں ہے۔

معائب جگر کی شاعری میں سب سے بڑا نقص جو نمایاں طور سے نظر آتا ہے وہ ان کی بے دردی کی "تصوف گوئی" ہے۔ "وحدت الوجود"، "مقام حیرت" وغیرہ متصوفانہ مسایل کی بے داد پہیلیوں میں مبتلا ہو کر

وہ "شعریت" سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور نہایت ہی روکھے پھیکے بدمزہ شعر کہنے لگتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جگر اسی دنیا کے انسان ہیں۔ حسن وعشق اور مے و میخانہ ان کے مذاق کی اصل چیزیں ہیں وہ انھیں سے متعلق جذبات و کیفیات کی مرقع کشی کامیابی سے کر سکتے ہیں لیکن جب انھیں مسایل تصوف کی اُلجھی ہوئی زلفیں سلجھانے کا سودا ہوتا ہے تو ان کی رندانہ طبیعت کا شانہ جواب دیدیتا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ جو کچھ فرماتے ہیں اس میں عرفان حقیقت کے جلوے نظر نہیں آتے۔ متصوفین جو کچھ نظم و نثر میں لکھ گئے ہیں انھیں کو مختلف عنوانات سے دھرا دیتے ہیں ان کے یہی وہ زمزمے ہیں جن کے تال سر کا پتہ نہیں چلتا۔ جگر کا ایک مشہور شعر ہے:-

عشق ہے نصف الحقیقت کیوں پریشاں کیجئے　　　یعنی ہم پر رحم کر کے خود پہ احساں کیجئے

اس امر سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ اس شعر کے الفاظ اور اس کا انداز بیان کسقدر غیر شاعرانہ ہے اس امر پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس شعر کا مفہوم کیا ہے؟

غالباً شاعر نے دنیا کو حسن وعشق سے مرکب مانا ہے اور دنیا کی حقیقت کا نصف حصہ حسن کو قرار دیا ہے اور نصف حصہ عشق کو۔ تصوف کا یہ گورکھ دھندا تیار کرنے کے بعد وہ حسن سے یہ کہتا ہے کہ عشق کو پریشان نہ کرو کیونکہ وہ "نصف الحقیقت" ہے اگر اُسے پریشان کیا گیا تو تم پریشان ہوگے کیونکہ اگر کسی مرکب حقیقت کا ایک جز پریشان ہوگا تو دوسرا اس سے محفوظ نہیں رہے گا۔ اسی خیال کو "یعنی" کے ذریعہ سے دوسرے مصرع میں یوں دھرا دیا ہے کہ مجھ پر رحم کر کے خود پہ احسان کیجئے کیونکہ جب تم مجھ پر رحم کروگے تو اپنے پر رحم کروگے کیونکہ ایک جز کے اطمینان سے دوسرے جز کو اطمینان نصیب ہوگا۔

اگر فی الحقیقت شاعر کا یہی مطلب ہے تو لوازم بعید کے واسطہ کی وجہ سے اس میں بدترین قسم کی تعقید معنوی پیدا ہوگئی اس کے علاوہ تصوف کے نقطۂ نظر سے تو عالم کی حقیقت اصلیہ صرف حسن ہے عشق ہو یا اور کوئی چیز اس کے مختلف شئون و مظاہر ہیں۔ ایسی حالت میں عشق کو کیوں نصف الحقیقت مان لیا گیا ہے۔ شعر سے کہیں پتا نہیں چلتا۔ جگر نے ایک دوسری جگہ محبت کو اصل حقیقت کہہ ڈالا ہے۔

محبت اصل حقیقت ہے اسکو کیا کرتے　　　ہم التجا جو نہ کرتے وہ التجا کرتے

اور تیسری جگہ خود حسن ہی کو حقیقت قرار دے دیا ہے۔

حسن خود عشق ہو خود جلوہ ہو خود ذات وصفات　　　ایک یہی لفظ حقیقت ہے کل افسانوں کی

یہ صحیح ہے کہ ایک غزل گو شاعر کسی مستقل خیال کی تبلیغ نہیں کرتا وہ ایک ہی غزل کے ایک شعر میں ایک خیال ادا کرتا ہے اور دوسرے میں اس سے بالکل متضاد خیال، مگر ایک صوفی شاعر کو مضامین "تصوف" نظم کرتے وقت عام متغزلین کی اس عام روش پر نہیں چلنا چاہئے۔ ان کا تصوف کے خاص مسایل کے متعلق

جو نظریہ ہے اسی کو مختلف عنوانوں سے پیش کرنا چاہئے۔ یا کہ کبھی عشق کو اصل حقیقت بنا دیا اور کبھی حسن کو اور کبھی اس حقیقت کا تجزیہ کرکے عشق کو نصف الحقیقت بنا دیا اگر مختلف حیثیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس "اختلاف" کی اجازت بھی دے دی جائے تو ان حیثیتوں کی طرف ان اشعار میں کسی خاص اشارہ کا ہونا لازم تھا یہاں تو ایسا کیا گیا ہے کہ پہلے ان دعوؤں کو تسلیم کرلیا گیا ہے اور پھر ان پر شعری نتائج متفرع کئے گئے ہیں۔ ایک فہمیدہ شخص انھیں پڑھ کر شاعر کی ژولیدہ خیالی پر حیران رہ جاتا ہے۔

جگر کا دوسرا شعر ہے:-

حقیقت کو حقیقت کے مقابل دیکھنے والے سنبھے بھی دیکھ میری ہستی دل دیکھنے والے

اس شعر کا بھی کوئی مفہوم نہیں پیدا ہوتا اور پھر اس کے الفاظ کو اس کے اسلوب بیان کو شعریت سے تو کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ جگر صاحب کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو اس میں بھی ایک علمی مسئلہ کے انکشاف کی کوشش کی گئی ہے فرماتے ہیں:-

علم کے جہل سے بہتر ہے کہیں جہل کا علم میرے دل نے یہ دیا درس بصیرت مجھ کو

یہ مسئلہ مشہور ہے کہ جو شخص نہیں جانتا ہے لیکن وہ یہ جانتا ہے کہ وہ نہیں جانتا تو وہ بہتر ہے ایسے شخص سے جو نہیں جانتا ہے اور یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ نہیں جانتا ہے یا اپنے نہ جاننے کے باوجود۔۔۔ یہ سمجھتا ہے کہ وہ جانتا ہے۔ اگر جگر صاحب کے دل حقیقت آشنا نے یہی درس بصیرت دیا ہے تو وہ پہلے مصرعہ سے نہیں نکلتا کیونکہ اگرچہ "جہل کا علم" "جہل بسیط" کے مفہوم کی طرف اشارہ کردیتا ہے یعنی یہ بتا دیتا ہے کہ وہ اپنی جہالت کو جانتا ہے لیکن "علم کے جہل" والے ٹکڑے سے "جہل مرکب" یعنی اس امر کی طرف، کہ وہ اپنے نہ جاننے کو نہیں جانتا یا نہ جاننے کے باوجود یہ جانتا ہے کہ وہ جانتا ہے کوئی اشارہ نہیں نکلتا۔

"جہل کا علم" جس قسم کے معنی دیتا ہے اگر اسی کی مناسبت سے دوسرے مرکب اضافی یعنی "علم کے جہل" کے معنی لئے جاتے ہیں تو یہ مطلب نکلتا ہے کہ وہ جانتا ہے لیکن اپنے جاننے کو نہیں جانتا۔ یعنی "علم الجہل" "جہل العلم" پر فوقیت رکھتا ہے۔ اگر جگر کے دل نے یہ درس بصیرت دیا ہے تو اس میں جدت تو ضرور پیدا ہوجاتی ہے۔ کیونکہ حکماء کے اس مسلک سے کہ جہل بسیط جہل مرکب پر فوقیت رکھتا ہے جگر نے عدول کیا ہے۔ مگر اس انحراف کے لئے ثبوت کی ضرورت تھی وہ شاعرانہ ہی سہی۔ لیکن اگر اس بحث سے ہم قطع نظر بھی کرلیں اور یہ مان لیں کہ شعر صحیح علمی مفہوم ادا کر رہا ہے تو بھی یہ سوال ہوگا کہ آخر اس شعر میں شعریت کیا ہے؟

ایک بڑی بحر میں جگر صاحب فرماتے ہیں:-

جینے تک ہیں ہوش کے جلوے آگے ہوش کی مستی ہے موت سے ڈرنا کیا معنی موت بھی جزو ہستی ہے

یہ شعر بھی درحقیقت ایک پہیلی ہے جس کا بوجھنا آسان نہیں ہے۔ ہم نے مانا کہ زندگی تک عقل و ہوش کی جلوہ آرائیاں ہیں لیکن اس دوسرے ٹکڑے کا کیا مطلب ہے کہ "آگے ہوش کی مستی ہے"

اگر جگر اس کے قایل ہیں کہ مرنے کے بعد قطرہ دریا میں فنا ہوجاتا ہے یعنی خدا میں مل جاتا ہے تو پھر ہوش کی مستی کا کچھ مفہوم نہیں رہتا۔ عقل و ہوش مطلق (خدا) سے واصل ہوجانے کے بعد اس کی مستی یعنی بے خبری بے معنی ہے۔ اگر مستی کا کوئی اور مفہوم ہے تو اس کا شعر میں کہیں سراغ نہیں ملتا اور اگر جگر صاحب صوفی ہونے کے بجائے اس نظریے کے قائل ہیں کہ نفس کو فنا نہیں ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی باقی رہتا ہے تو انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس حالت میں نفس کے ادراکات میں اضافے ہی کا پہلو پیدا ہوتا ہے کیونکہ مادی شوائب سے وہ مجرد ہوگیا ہے۔ ایسی حالت میں نفس کی بیداری ہی کی صورت نکل سکتی ہے۔ "ہوش کی مستی" بے معنی ہوجاتی ہے۔ ہوش کی مستی سے اس کی بیداری مراد لینا انتہائی تحکم ہوگا جسے روا نہیں رکھا جاسکتا۔ اسی طرح موت کو جزو ہستی بنانا بھی غلط خیال ہے۔ موت ہستی کے انعدام سے عبارت ہے اس لئے یہ ہستی کا جز نہیں بن سکتی۔ موت المرت کی اصطلاح سے بھی میں ناواقف نہیں ہوں لیکن حقیقت میں وہ بھی ایک بے معنی بات ہے تصوف کے اقتضاءات سے خدا ہی حقیقت ہستی ہے۔ اس لئے اگر موت جزو ہستی بن جاتی ہے تو عدم خدا کا جزو قرار پاجاتا ہے جو ایک نہایت مہمل بات ہے۔ اسی غزل میں دوسرا شعر ہے:۔

معنیٔ صورت، صورت معنی، فکر و نظر کے دھوکے ہیں   فکر و نظر تک رہ جانا فکر و نظر کی پستی ہے

اس شعر کا بھی کوئی حاصل نہیں۔ فکر و نظر کی پستی سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اگر فکر و نظر میں رفعت ہے تو وہ سابق کی خرابی میں مبتلا نہ ہوگی اور وہ سابق کی خرابی کیا ہے؟ فکر و نظر تک رہ جانا گویا مطلب یہ ہوا کہ اگر فکر و نظر میں رفعت ہے تو اسے فکر و نظر سے واسطہ نہ ہوگا یعنی وہ ایک ہی وقت میں فکر و نظر سے کام بھی لے گا اور نہیں بھی لے گا۔ شاید اسی کو ارتفاع نقیضین کہتے ہیں۔ اور اگر دونوں مقامات پر فکر و نظر سے علیحدہ علیحدہ چیزیں مراد ہیں تو انکا شعر سے پتہ نہیں چلتا۔ اسی طرح معنی صورت اور صورت معنی کو فکر و نظر کے دھوکے بتانا محض تحکم ہی تحکم ہے۔ ان دونوں میں نہ صرف عام فلسفے کے لحاظ سے بلکہ فلسفۂ تصوف کے لحاظ سے بھی حقیقت پیدا ہوسکتی ہے۔ ان کو بغیر کسی وجہ کے بیان کئے ہوئے فکر و نظر کے دھوکے بتا دینا شاعری نہیں اس قسم کے بے معنی اشعار سے ذوق سلیم کو سخت تکلیف پہونچتی ہے۔

"وحدت الوجود" کی بھول بھلیوں میں مبتلا ہوکر غالب نے یہ صغریٰ کبریٰ تیار کئے تھے:۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا   ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

غالب سا نازک خیال اور باریک بین شاعر" وحدۃ الوجود" کے چکر میں پھنس کر ان بدمزہ مضامین کے سوا کوئی اچھا مضمون پیدا نہیں کر سکا تو غریب جگر کس شمار میں رہے۔ آپ کے وحدۃ الوجودی تخیل کا کارنامہ ملاحظہ ہو:-

کن کہتے ہی جلوؤں کی یہ کثرت نظر آئی ۔۔۔ اللہ کو اللہ کی صورت نظر آئی

اللہ کو اللہ کی صورت کا نظر آنا ایک وحدۃ الوجودی لطیفہ کی ضرور حیثیت رکھتا ہے مگر شعریت سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔

جگر نے تصوف کے دام میں گرفتار ہو کر اپنی شاعری کو داغدار بنا لیا ہے۔ اس مذاق کے ماتحت انھوں نے بہت سے ایسے اشعار کہہ ڈالے ہیں جن کے معنی کی چولیں اگر بعید تاویلوں کے ذریعہ سے بٹھا بھی لی جائیں تو ان میں شعریت کا کوئی چٹخارہ نہیں ملتا۔ آپ کا جی چاہے تو ان اشعار کو تصوف کا کارنامہ قرار دے لیجئے۔ لیکن میں تو انھیں جگر کی شاعری کے ناصیہ کا داغ سمجھتا ہوں۔ فرماتے ہیں:-

نگہ شوق و دعوئے دیدار ۔۔۔ اس حجاب الحجاب نے مارا

حجاب الحجاب تصوف کی اصطلاح سہی لیکن شعریت کے گلے کے لئے کند چھری ہے۔

کب تک آخر مشکلات شوق آساں کیجئے ۔۔۔ اب محبت کو محبت ہی پہ قرباں کیجئے

محبت کو محبت ہی پر قربان کرنا نہ صرف بدمزہ بلکہ بدمذاقی کا ثبوت ہے۔

شان رحمت کو نہیں درکار کوئی پیش کش ۔۔۔ احتیاطاً اکتساب کفر و ایماں کیجئے

شعر کا مفہوم غنیمت ہے لیکن احتیاطاً اور اکتساب کے الفاظ نے اس کی شعریت پر چھری چلا دی۔

عشق میں مقصود اصلی کو مقدم کیجئے ۔۔۔ شرح و تفصیلات پر یعنی نظر کم کیجئے

مقصود اصلی مقدم اور شرح و تفصیلات کی شعریت قابل ملاحظہ ہے۔

دل پہ جو گزرے سو گزرے عشق کی ضد ہے یہی ۔۔۔ آج اتنا چھیڑئے ان کو کہ گریاں کیجئے

عشق کی یہ ضد کہ معشوق کو گریاں کرے کوئی شاعرانہ لطف نہیں رکھتی۔

جگر کے کلام میں سوقیانہ اور مبتذل اشعار

شعلۂ طور میں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں ہے جن میں سوقیت اور ابتذال پایا جاتا ہو، چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

آؤ مل جاؤ مسکرا کے گلے ۔۔۔ ہو چکا جو عتاب ہونا تھا

پاس جانا دل بیتاب سنبھل کر شب وصل ۔۔۔ کیسی بل کھاتی ہوئی باد صبا پھرتی ہے

لاکھ سمجھایا جگر کو ایک بھی مانی نہ بات ۔۔۔ دھن لگی تھی کوچۂ قاتل کی میرے یار کو

دل وہ چھوٹا وہ چلا بچکے تیری نظروں سے ۔۔۔ تیرے صدقہ تیرے قربان نہ جانے پائے

دونوں ہی جفا جو ہیں جگر عشق ہے یا حسن — ایک یار نے لوٹا ہے تو ایک یار نے مارا
یوں جگر توڑتے ہیں آپ جو پیمانِ وفا — ابھی کچھ یاد بھی ہے یاد بھی ہے یاد بھی ہے
ایک بوسہ اس لب جاں بخش کا — عمر بھر کے واسطے انعام ہے

نزع و میت وغیرہ سے متعلق اشعار

سلیمان صاحب ندوی نے اپنے تعارف میں ایک جگہ فرمایا ہے کہ "جگر آجکل کے بعض طالب اثر شاعروں کی طرح نہیں جو لاش و مدفن و سورۂ یٰسین و نوحہ و بین و میت و نزع وغیرہ کا ایک تیر کمند صفت پھینک کر بالقصد مرغ اثر کو شکار کرنا چاہتے ہیں"۔ لیکن کیا سید صاحب کے اس بیان میں کچھ صداقت ہے؟ اس کا جواب ذیل کے اشعار دینگے

خدایا خیر کرنا نبض بیمار محبت کی — کئی دن سے بہت برہم مزاج ناتوانی ہے
ہاں نہ آجائے اگر منہ کو کلیجہ تو سہی — تم نے دیکھا ہی نہیں دم توڑتے بیمار کو
نہ جانے دل میں وہ کیا سوچتے رہے پیہم — میرے جنازے پہ تا دیر سر جھکائے ہوئے
ہو چکے حسرت و امید و الم سب رخصت — اب نہیں کوئی مریض شب ہجراں کے قریب

شعلۂ طور میں الفاظ و محاورات کی غلطیاں

جگر کے کلام میں غلط الفاظ اور غلط ترکیبیں کثرت سے موجود ہیں۔ اغلاط کے متعلق جگر نے اپنے مقدمے میں یہ لکھا ہے "اکثر غلطیوں کا مجھے احساس ہے بعض غلطیاں ایسی بھی ہیں جنھیں میں نے دانستہ اختیار کیا ہے بعض ایسی بھی ہیں کہ وہ خود اپنی جگہ محاسن ہیں اکثر ایسی بھی ہوں گی جن کا مجھے علم نہیں یا جن کو ناقدانہ نظر سے نہیں دیکھ سکتا اس لئے میں خوش ہوں گا اگر مجھے میری غلطیوں پر تنبہ کر دیا جائے"

ذیل میں ان کی چند واضح غلطیاں درج کی جاتی ہیں اب اس کا جگر صاحب خود فیصلہ کریں کہ آیا یہ وہ غلطیاں ہیں جنھیں انھوں نے دانستہ اختیار کیا ہے یا وہ ہیں جو ان کے خیال میں خود اپنی جگہ محاسن ہیں یا پھر وہ ایسی ہیں جن کا ان کو علم نہ تھا۔ جگر صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں:-

عشق معصوم صفت حسن ثقاہت دشمن

ثقاہت غلط لفظ ہے۔ ثقہ سے جگر نے ثقاہت بنایا ہے مگر انھیں شاید یہ معلوم نہیں کہ ثقہ میں "ہ" اصلی نہیں ہے بلکہ یہ لفظ اصل میں وثق تھا شروع کا "و" عربی قواعد کے لحاظ سے ثقہ کی وہ "ت" بن گیا جو حالت وقف میں "ہ" ہو جاتی ہے اس لئے "ثقہ" سے "ثقاہت" بنانا صحیح نہیں ہے اس کے مصدر وثوق و وثاقت ہیں۔

ستم کا عدو مستحق ہو گیا — میرا دل سراپا قلق ہو گیا

بھلا کر خود کو غافل رحم کا تو مستحق ہو گا　　کہ گل بوٹے بھی بن جائینگے جب سادہ ورق ہو گا

"قلق اور ورق" کا قافیہ "مستحق" "ح" کے فتحہ کے ساتھ بنایا گیا ہے حالانکہ صحیح لفظ مستحق "ح" کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ استحقاق مصدر لازم ہے اس لئے اس کا اسم مفعول نہیں بن سکتا۔

نگاہِ اہلِ دل بھی رہ گئی زیر و زبر ہو کر　　کہاں پہونچے میرے اجزائے ہستی منتشر ہو کر

اس شعر میں بھی منتشر "ش" کے زبر (فتح) کے ساتھ اسم مفعول کی صورت میں استعمال کیا گیا ہے۔ انتشار لازم ہے اس لئے اس کا اسم مفعول نہیں بن سکتا۔

جگر بعض مقامات پر بے محل الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔

چیخی ہے کس انداز سے کس کرب و بلا سے　　دل ٹوٹ گیا نالۂ بلبل کی صدا سے

شعر بالا میں کرب کا لفظ تو صحیح تھا لیکن اس میں بلا کا اضافہ بالکل بے محل ہے۔

دوسرا شعر ملاحظہ ہو:۔

آنکھیں بنی ہوئی ہیں میخانۂ تصور　　اک مست آرہا ہے اک مست جارہا ہے

تصور کا لفظ یہاں قطعاً بے موقع ہے آنکھوں کا کام تصور نہیں ہے اس لئے ان کو میخانہ تصور نہیں بنایا جا سکتا۔

بعض مقامات پر جگر نے ردیف کا غلط استعمال کرکے زبان سے اپنی قابل افسوس بے خبری کا ثبوت دیا ہے۔ آپ کی غزل کا ایک مطلع ہے:۔

عاشقی یاس کی محکوم ہوئی جاتی ہے　　بیکسی اب میرا مفہوم ہوئی جاتی ہے

اس مقام پر ردیف میں "ہوئی" یائے معروف کے ساتھ ہے اور صحیح ہے لیکن اسی کے بعد یہ شعر ملتا ہے

دل ہوا خاک تپِ غم سے مگر دل کی جگہ　　ایک خلش سی مجھے معلوم ہوئی جاتی ہے

یہاں ردیف میں "ہوئی" یا یائے معروف بالکل ہی غلط ہے اس جگہ "ہوئی" کا کوئی محل نہیں ہے۔ صحیح یوں ہے:۔

اک خلش سی مجھے معلوم ہوئے جاتی ہے

یعنی "ہوئے" یائے مجہول ہونا چاہئے۔

اسی طرح اس شعر میں بھی غلطی کی ہے۔

دل دھڑکنا بھی غنیمت ہے تری فرقت میں　　کہ خبر تو مجھے معلوم ہوئی جاتی ہے

یہاں بھی معلوم ہوئے جاتی ہے کا موقع ہے "ہوئی جاتی ہے" اور "ہوئے جاتی ہے" کے مفاہیم

میں جو واضح فرق موجود ہے اس پر نظر نہ کرنے سے بار بار اس غلطی کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ جگر نے بعض مقامات پر مرکب اضافی بھی غلط استعمال کئے ہیں۔ مثلاً:۔ ع خود اپنے حسن صفائی پہ مبتلا ہوں میں
صفائی بظاہر اردو کا لفظ معلوم ہوتا ہے اس لئے اس کی طرف قواعد کے لحاظ سے ایک شاعر کو حسن کے مضاف کرنے میں احتیاط برتنا چاہئے اسی طرح اس مصرع میں ع ۔ "مجرم عشق بھی ہے ملزم فریاد بھی ہے"۔
"ملزم فریاد" کی ترکیب اضافی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ ملزم بمعنی مجرم اردو لفظ ہے اس لئے فریاد کی طرف اسکی اضافت صحیح نہیں۔

بعض مقامات پر محاورات کے استعمال میں بھی بہت زیادہ آزادی برتی ہے فرماتے ہیں:۔

نگاہِ قہر کے صدقے جھکی نہ غیر کی سمت مجھی پہ تیز ہوئی یہ مجھی پہ لال ہوئی

نگاہ کا لال ہونا خلاف محاورہ ہے۔

انھیں ہے عشق سے بیشک مگر یہ کون کہے وہ خود حسین ہے اسکو نہ کیوں غرور آئے

غرور آنا محاورہ نہیں ہے۔

برسائی آنسوؤں کی جھڑی چشم یار نے کیا اُٹھکے کھدیا میری خاکِ مزار نے

جھڑی لگتی ہے برسائی نہیں جاتی۔

ثقیل اور غیر شاعرانہ الفاظ کا استعمال جگر نے کثرت سے ایسے الفاظ اور ترکیبیں بھی استعمال کی ہیں جو اردو کے لئے حد سے زیادہ غیر مانوس ثقیل اور غیر شاعرانہ ہیں، مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

پوچھ اس مست سے انداز دلِ نشتر و رمِ کیف

نشتر و رم کیف کی ترکیب کس قدر بھدی اور غیر مانوس ہے، نشتر کا لفظ بھی اس مقام پر مناسب نہیں معلوم ہوتا نشتر کے بجائے انتشار کا لفظ جگر کو استعمال کرنا چاہئے تھا۔

ع:۔ عشق جب معروفِ اصلاحاتِ روح و تن میں تھا

اصلاحات روح و تن کی ترکیب نہایت ہی غیر شاعرانہ ہے۔

ع:۔ تو پلائے جا تو پلائے جا اسی چشم جام بجام سے

چشم جام بہ جام کی ترکیب نہ صرف غیر مانوس بلکہ بے معنی بھی ہے اسی بحر میں ایک جگہ "شوق نام بنام کی ترکیب بھی استعمال کی ہے اس ترکیب کی بھی یہی حالت ہے۔

تحیر ہے نگاہوں کو تو اجد ہے رگِ جاں کو

تواجد کا اُردو میں استعمال صحت ذوق کی علامت نہیں!

جگر نے بعض الفاظ تو بہت ہی عجیب وغریب استعمال کئے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ انھیں اپنی اختراع قرار دیں لیکن وہ ہیں نہایت ہی مکروہ۔

ع اب کہاں ویسی جنوں آرائیاں قیس تک تھیں قیس کی لیلائیاں
منزلِ عشق اے خدا کی پناہ ہر قدم کربلائیاں توبہ
عشق کی بڑھنے تو دو بربادیاں کام آئیں گی یہ صحرا زادیاں

لیلائیاں، کربلائیاں، صحرازادیاں، کانوں کو نہایت ہی ناگوار معلوم ہوتے ہیں اور میں ان الفاظ کو جگر صاحب کی بدعت سئیہ میں داخل کرنے پر مجبور ہوں۔

اصل یہ ہے کہ جگر کے کلام میں طرح طرح کی خامیاں اور نقائص موجود ہیں، لیکن ان کمزوریوں کے باوجود وہ ایک خوش گو شاعر ضرور ہیں۔

اگر جگر نے طبیعت کی جودت اور روانی کو اپنے ادبی مرشد اصغر گونڈوی کے قدموں پر نہ ڈال دیا ہوتا تو ان کا کلام اس قسم کے عیوب سے پاک رہتا۔ جگر کی شعری گمراہیوں کو اعظم گڈھی احباب کی پُر غلو قصیدہ خوانیوں اور یونیورسٹی کے نوجوانوں کی بے سمجھی ہوئی ستائشوں نے اور زیادہ ترقی دے دی ہے، ان میں ایک خاص قسم کا غرور پیدا ہوگیا ہے اور اب وہ اپنی غلطیوں پر نظر ڈالنا بھی گناہ سمجھنے لگے ہیں ان کا خیال ہوگیا ہے کہ ان کی زبان سے صحیح وغلط جو کچھ نکل جائے وہی اُردو کی شریعت شعر وادب میں جائز ہوجانا چاہئے۔ کاش کہ وہ ان نقایص کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں اور اُردو کی غزل گوئی کی آرایش کا حقیقی سامان بنیں۔

سید اختر علی تلہری

(نگار) "شعلۂ طور" عرصہ سے میری نگاہوں کے سامنے ہے لیکن اسوقت تک اس کو پڑھنے اور اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقعہ مجھے نہیں ملا۔ اتفاق سے یہ مضمون جناب سید اختر علی صاحب کا اس موضوع پر موصول ہوگیا جو ایک حد تک میری رائے کے موافق ہے۔

جہاں تک بزم مشاعرہ وشعرخوانی کا تعلق ہے اس وقت دو قسم کے شاعر نظر آتے ہیں ایک وہ جو محافل میں اپنی غزلیں گاگا کر پڑھتے ہیں اور دوسرے وہ جو اس فن سے ناواقف ہیں اور یونہی بغیر کسی لحن وموسیقی کے اپنا کلام سنایا کرتے ہیں۔

قسم اول کے شعراء زیادہ مشہور ہیں، زیادہ کامیاب ہیں اور مشاعرہ میں کافی داد حاصل کر لیتے ہیں، کیونکہ غنا اور اسی کے ساتھ حرکات رقصیہ کا شمول باصرہ کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور اس طرح ذہن انسانی دو جگہ تقسیم ہو کر نفس مفہوم شعر کی طرف زیادہ توجہ نہیں کر سکتا۔

جگر بھی اسی نوع کے مغنی شعراء میں شامل ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان کی شہرت کا بڑا سبب ان کی خوش الحانی ہے۔ ایسے شاعروں کو کبھی اپنا کلام مجموعہ کی صورت میں شائع کرنے کی جرات نہ کرنا چاہئے جب کسی گوئیے شاعر کی غزل "محفل شعر" سے علحدہ یوں پڑھی جاتی ہے تو محض شعر ہونے کے لحاظ سے اس پر نگاہ جاتی ہے اور بہت سی ایسی غلطیاں جو ترنم وغنا کی دھن میں خود شاعر کو بھی نظر نہیں آتیں، سامنے آجاتی ہیں۔ لیکن چونکہ جگر صاحب نے اس نکتہ کو نہیں سمجھا اور اپنا مجموعہ شایع کر دیا اس لئے ان کو برا نہ ماننا چاہئے اگر مشاعرہ کی سی داد انھیں نہ مل سکے۔

میں چونکہ اسوقت کوئی تبصرہ ان کے کلام پر نہیں کر رہا ہوں، اس لئے مجھے جزئیات سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں لیکن مختصراً اسقدر ضرور عرض کر دوں گا کہ جتنا اچھا شعر ان کی زبان سے ادا ہوتا ہے اتنا اچھا ان کے دماغ سے پیدا نہیں ہوتا۔

ہر چند ان کے کلام میں ایسے اشعار بھی پائے جاتے ہیں جو یوں بھی بغیر گائے بجائے داد حاصل کر سکتے ہیں لیکن ایسے اشعار زیادہ ہیں جو جگر صاحب ہی کی زبان سے سُنے جانیکے قابل ہیں۔

فاضل تبصرہ نگار نے زیادہ تر ان اشعار سے بحث کی ہے جو "تصوف" سے متعلق ہیں اور انھیں کے اغلاط واستقام کو پیش کیا ہے، حالانکہ اس رنگ کے اشعار اگر اغلاط سے پاک ہوں تو بھی وہ کوئی چیز نہیں ہیں اور خود ان کا "متصوفانہ ادعا" بجائے خود اس بات کا ضامن ہے کہ ان میں جتنا اہمال بھی پایا جائے کم ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ خالص تغزل کو پیش نظر رکھ کر جگر صاحب کو بتایا جاتا کہ ان کی لغزشیں کس قسم کی ہیں۔

سید سلیمان صاحب کے "تعارف نامہ" کے متعلق جو کچھ اختر صاحب نے لکھا ہے تقریباً وہی بعض دیگر رسایل میں بھی دیکھا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کا "تعارف" عام طور پر پسند نہیں کیا گیا۔ لیکن شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ سید صاحب نے "شعلۂ طور" کے متعلق جو اظہار خیال کیا ہے، اس سے مقصود یہ نہ تھا کہ جگر کے حسن کلام پر مہر توثیق ثابت کیجائے بلکہ مدعا یہ تھا کہ جگر ایسے مشہور شاعر کے کلام کی تعریف کر کے اپنے آپ کو "سخن فہم" ظاہر کیا جائے

مگر افسوس ہے کہ غریب سید کو اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی اور دنیا نے ان کی تحریر کو بے جا تملق ہی سمجھا۔

شعلۂ طور میں جگر نے اصغر صاحب گونڈوی کے حضور جو "تراوش سجدہ" پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ہستی کے تمام کوائف حتٰی کہ موجودہ "رندی و ہوسناکی" بھی اصغر صاحب ہی کا طفیل ہے۔ لیکن اس میں انھوں نے شاید صرف مبالغہ و فرط عقیدت سے کام لیا ہے، ورنہ سوائے اُس حصۂ شاعری کے جس میں جگر صاحب نے تصوف و رموز تصوف کا اظہار کیا ہے کوئی اور بات ہوشیاری کی جگر صاحب کی زندگی یا شاعری میں ایسی نہیں پائی جاتی جسے اصغر صاحب کی صحبت و ارادت کا نتیجہ سمجھا جائے۔

میں ممنون ہوں گا اگر اختر صاحب شعلۂ طور پر دوبارہ نظر ڈالکر زیادہ تفصیل و بسط کے ساتھ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ یہ مضمون ان کا بہت تشنہ و نا مکمل ہے۔ نیاز

باب الاستفسار

خوردبینی کتابت

(جناب سید زوار حیدر صاحب ۔ مسیل پور)

آپ نے بھی سنا ہوگا کہ پانی پت اور دہلی میں کوئی صاحب چاول پر "قل ہو اللہ" لکھ لیتے ہیں اور اتنی صاف کہ ہر شخص پڑھ سکتا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ سوائے ہندوستان کے یہ صنعت کہیں اور نہیں پائی جاتی۔ براہ کرم مطلع فرمائیے کہ کیا ان کا یہ دعویٰ صحیح ہے۔

(نگار) اس خطاطی کو خوردبینی کتابت کہتے ہیں کیونکہ وہ خوردبین ہی کی مدد سے لکھی جاتی ہے اور پڑھی بھی اسی طرح جاتی ہے، میں نے بھی ان چاولوں کو دیکھا ہے لیکن مجھ پر زیادہ حیرت طاری نہیں ہوئی کیونکہ اس قسم کی خطاطی کے اس سے بہتر نمونے اب بھی پائے جاتے ہیں اور اس سے قبل بھی پائے جاتے تھے اُن حضرات کا یہ دعویٰ کہ سوائے ہندوستان کے کہیں اور یہ فن نہیں پایا جاتا۔ بالکل غلط ہے۔

غالباً ۱۹۳۲ء پاپائے روم کو کسی چینی نے جو حال ہی میں عیسائی ہوا تھا ایک مجسمہ اس کا پیش کیا جو ایک چاول میں طیار کیا گیا تھا۔ یہ مجسمہ باعتبار شباہت نہایت مکمل چیز تھا اور اس قدر باریک کہ بغیر خوردبین کی مدد سے کوئی اسے دیکھ ہی نہ سکتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب چیز جاپان کے کسی معتقد کی طرف سے پیش کی گئی اور وہ ایک ریشمی رومال تھا جسے ریشم کے کیڑے ہی نے بُنا بھی تھا۔ اس شخص نے ریشم کے کیڑے کو اس طرح تانے بانے کی صورت سے حرکت کرنے پر مجبور کیا کہ اس سے رومال طیار ہو گیا۔

چند سال اُس طرف کی بات ہے کہ فرانس کی اکاڈیمی کے سابق صدر موسیو جولیاں کو وہیں کے ایک شخص نے گیہوں کا ایک دانہ پیش کیا جس پر ۲۲۱ الفاظ تحریر تھے۔ اب سے تقریباً پندرہ سال قبل مصر کی نمائش زرعی میں سوریا کے کسی خطاط نے ایک انگوٹھی پیش کی جس کے نگینہ پر سورۂ فاتحہ لکھی ہوئی تھی

اور مرغی کا ایک انڈا پیش کیا جس پر سلطنت عثمانیہ کی پوری تاریخ منقوش تھی۔

تاریخ میں اس قبیل کی چیزوں کا ذکر جابجا پایا جاتا ہے جس سے اس فن کے مہارت کا اظہار ہوتا ہے۔ سترھویں صدی میں پولینڈ کا ایک شاعر تھا جو کلیسا میں راہبانہ زندگی بسر کرتا تھا اس نے یونان کے مشہور شاعر ہومر کی مشہور کتاب الیڈ کو اتنے چھوٹے کاغذ پر لکھا تھا کہ اسے موڑ کر ایک اخروٹ کے چھلکے کے اندر رکھ سکتے تھے۔

سولھویں صدی میں ایک لوہار نے (سونار نہیں) ملکۂ الزبتھ کے حضور میں سونے کی ایک زنجیر نذر پیش کی جس میں پچاس کڑیاں تھیں لیکن یہ زنجیر اتنی باریک تھی کہ تاوقتیکہ اسے کسی سفید یا سیاہ کاغذ پر نہ رکھا جائے نظر نہ آتی تھی۔ یہ زنجیر مکھی کے پاؤں میں باندھ دی گئی تو وہ اسے آسانی سے لے اڑی اور مطلق کوئی وزن اسنے محسوس نہیں کیا۔

سولھویں صدی کے آخر میں اسپین کے ایک شخص جوزیف نے گیہوں کے ایک دانہ کی گاڑی طیار کی اور اس قدر تکمیل کے ساتھ کہ خوردبین کی مدد سے دیکھنے پر گاڑی کے اندر کی کرسیاں بھی نظر آتی تھیں۔

سویڈن کے ایک شخص نے جس کا نام مور بجاریں تھا، ہاتھی دانت کی بارہ قابیں اتنی چھوٹی طیار کیں جو سیاہ مرچ کے اندر آسکتی تھیں۔

الغرض یہ فن نہ صرف ہندوستان کے لئے مخصوص ہے اور نہ دہلی و پانی پت کے یہ حضرات اس کے تنہا مالک سمجھے جاتے ہیں۔ حیدرآباد میں سید صادق حسین صاحب غبار جو مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر صدر اعظم کے پیشکار تھے (اور اب پنشن پاتے ہیں) خوردبینی کتابت میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ مجھے خیال ہے کہ انھوں نے مجھے ایک کارڈ دکھایا تھا جس پر گلستاں یا شاید دیوان حافظ تحریر تھا۔

اس میں شک نہیں کہ اس فن کے لئے نہایت صحیح نگاہ غیر معمولی ہاتھ کا لوچ اور صد درجہ صبر درکار ہے سو اگر یہ باتیں آپ کو حاصل ہو جائیں تو آپ ایک چاول پر قل ہو اللہ کیا پوری سورۂ فیل لکھ سکتے ہیں، حیرت کی کونسی بات ہے۔

خواب میں تصنیف و تالیف

(جناب محمد عبدالکریم خانصاحب ۔ جمشید پور)

خواب اور تعبیر خواب کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ نیز یہ کہ خواب کی حالت میں انسان کے حواس

اتنے درست رہ سکتے ہیں کہ وہ تصنیف و تالیف کرسکے۔ میرے ایک دوست کا دعویٰ ہے کہ انکے
بہترین اشعار وہی ہوتے ہیں جو نیند کی حالت میں کہے جاتے ہیں۔ براہ کرم اپنی رائے سے مطلع فرمایئے۔

نگار) نیند، موت کی بہن کہلاتی ہے۔ کیونکہ ایک مرے ہوئے انسان اور سوئے ہوئے انسان میں بظاہر کوئی فرق نہیں ہوتا۔ البتہ ایک نیم شعوری کیفیت ضرور باقی رہتی ہے اور یہی خواب دیکھنے کا باعث ہوا کرتی ہے۔ پھر اکثر و بیشتر خواب تو انہیں واقعات سے متعلق ہوتے ہیں جو بیداری میں انسان دیکھتا ہے گو ان کی صورت بدلی ہوئی ہو۔ لیکن بعض خواب ایسے بھی ہوتے ہیں جو اختباری یا انتباہی کہلاتے ہیں یعنی ان میں آئندہ کے متعلق کوئی خبر یا ہدایت ہوا کرتی ہے، اس قسم کے خواب ہمیشہ خود خواب دیکھنے والے کی انتہائی تمنا اور قوائے عزم و ارادہ کی ایک کیفیت کا انعکاس ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ کا بحالت قیام مدینہ یہ خواب دیکھنا کہ آپ معہ اپنے اصحاب کے [illegible] تمام میں داخل ہو رہے ہیں اس قسم کا خواب تھا جو بعد کو پورا ہو کر رہا۔

اس کے متعلق سب سے زیادہ مشہور و قدیم تاریخی و مذہبی خواب ہے جس کی تعبیر حضرت یوسف نے بیان کی تھی۔ فرعون نے دو خواب دیکھے تھے ایک یہ کہ دبلی گائیں موٹی گایوں کو کھائے جاتی ہیں اور دوسرا خشک و سبز خوشوں کی بالوں کا اور حضرت یوسف نے ان کی تعبیر بیان [illegible] ہو گئی۔ اسی طرح دانیال نبی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ آپ تعبیر رویا میں کمال رکھتے تھے۔

اب رہا خواب کی حالت میں کوئی ذہنی اکتساب یا تصنیف و تالیف سو اس کی بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ سب سے پہلے تو آپ اسی مذہبی روایت کو لیجئے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیدنا سلیمانؑ نے علم و حکمت کی تمام باتیں خواب ہی میں طلب کی تھیں۔ لیکن اگر اسے عہد قبل تاریخ کی بات سمجھ کر رد کر دیا جائے تو اس کے بعد بھی بہت سے واقعات اس قسم کے مل سکتے ہیں۔

ابن فارض مصر کا مشہور صوفی شاعر تھا اور اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ تمام قصاید نیند کی حالت میں کہتا تھا اور جب بیدار ہوتا تھا تو قلمبند کر لیتا تھا۔ پھر نفس شاعری کے لحاظ سے اس کا یہ مرتبہ تھا کہ تمام اکابر فن نے اسے اپنے زمانہ کا بہترین شاعر مانا تھا۔

انگریزی کے مشہور شاعر کولرج سے غالباً آپ واقف ہوں گے کہ وہ کس مرتبہ کا شاعر تھا اور خصوصیت کے ساتھ اس کی نظم "کوبلائی خاں"[۱] تو انگریزی لٹریچر میں بڑے معرکہ کی چیز سمجھی جاتی ہے۔ آپ کو یہ سنکر شاید

۱؎ بلاد چین کا حکمراں تھا اور بہ لحاظ ترقی و تہذیب اس کا عہد چین کا عہد زریں سمجھا جاتا ہے۔

حیرت ہو گی کہ اس نے یہ نظم خواب ہی کی حالت میں کہی تھی۔ جلال الدین رومی اور رابندر ناتھ ٹاگور کے بھی بعض اشعار نیند میں ہوئے ہیں اور لطف یہ ہے کہ حالت نوم میں جو اشعار ہو جاتے ہیں وہ بہت زیادہ لطیف ہوتے ہیں۔

شعر و شاعری کی طرح موسیقی دانوں نے بھی اپنے بعض لحن خواب ہی کی حالت میں ایجاد کئے ہیں چنانچہ موزا کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے خواب میں شیطان کو ایک گیت گاتے سنا جس نے اسے مبہوت کر دیا۔ جب جاگا تو اس نے اپنی سارنگی پر ٹھیک کیا۔ یہ لحن بہترین لحن سمجھا جاتا ہے اور اس کا نام ہی "لحن شیطان" پڑ گیا۔

ایک اثری عالم ہیلپرخت کے سامنے اثریات بابل کے سلسلہ میں بعض ایسے مباحث آ گئے کہ وہ پریشان ہو گیا، اتفاق سے ایک دن نیند میں اسے قدیم بابل کا ایک راہب نظر آیا جس نے اس کی تمام گتھیاں سلجھا دیں۔ جب وہ جاگا اور خواب کے ہدایات کے مطابق عمل کیا تو خواب کی ایک ایک بات کو صحیح پایا، آخرکار اس نے ہدایات خواب کی مطابق تحقیق شروع کی اور آخرکار اثرات بابل کے مسئلہ میں بڑا مستند عالم سمجھا جانے لگا۔

فرانس کے مشہور فلسفی ڈیکارٹ سے کون واقف نہیں، جدید یورپ کا سب سے بڑا معلم سمجھا جاتا ہے۔ اس نے تین خواب دیکھے تھے۔ ایک ۱۰ نومبر سنہ ۱۶۱۹ء کو جس میں "روح القدس" نے تمام خزانے علم کے اس کے سامنے کھول کر رکھ دئے، دوسرے خواب میں ایک گولا پھٹتے ہوئے سنا جس سے اس کی آنکھ کھل گئی اور ذہن اتنا روشن ہو گیا کہ تمام حقایق اس پر واضح ہونے لگے۔ تیسرے خواب میں اس کو دو کتابیں ملیں ایک قاموس جو تمام علوم پر حاوی تھی، اور دوسری جملہ براہین فلسفہ پر۔

پوانکاریہ (مشہور سیاست داں) سے اکثر لوگ واقف ہوں گے لیکن یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس کا ایک چچازاد بھائی تھا جو اپنے زمانہ کا بہت بڑا ریاضی داں تھا۔ چنانچہ جس وقت انیشٹین (نظریۂ اضافیت کا موجد) پیرس گیا اور اپنے لکچر شروع کئے تو اس پوانکاریہ نے اس پر اعتراض وارد کئے۔ اسی ریاضی داں کا واقعہ ہے کہ اس نے ایک بار خواب میں بہت سے الجھے ہوئے مسایل ریاضی کے سلجھائے۔

یہی واقعہ دوسرے فرانسیسی ریاضی داں کونڈرسیہ کو پیش آیا اور اس نے بھی ریاضی کے بعض پیچیدہ مسایل بہ حالت خواب حل کئے۔

انگریزی کے مشہور مصنف اسٹفنسن کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے ڈاکٹر جیکال اور مسٹر ہائڈ، خود اسٹفنسن کا بیان ہے کہ اس روایت کے پہلے تین باب اس نے خواب میں لکھے تھے۔ ایک بار اس نے پورا قصہ حالت خواب میں مرتب کیا تھا۔ الغرض اس قسم کے بہت سے واقعات تاریخ میں نظر آتے ہیں اور اس لئے اگر آپ کے دوست خواب میں شعر کہتے ہیں تو کوئی تعجب نہیں۔

رضا شاہ پہلوی کی داستان ترقی

(جناب مرزا جہانگیر بیگ صاحب ۔ ناظم)

کیا آپ مختصراً اس امر پر روشنی ڈال سکتے ہیں کہ رضا شاہ پہلوی کی سیادت سے قبل ایران کی حالت کیا تھی اور رضا شاہ کیوں اور کس طرح تخت ایران پر قابض ہو سکے۔

(نگار) سنہ ۱۹۰۷ء میں انگلستان و روس نے باہم ایک معاہدہ کر کے ایران کے تین ٹکڑے کر دئے تھے۔ ایک وہ جس پر روس نے اپنا اقتدار قائم کر رکھا تھا اور اس میں اصفہان اور یزد شامل تھے۔ بعد کو اندجان بھی اس کے دائرۂ اثر میں آگیا۔

دوسرا ٹکڑا سلسان اور کرمان کا برطانیہ کے زیر اثر تھا، ہرچند یہ حصۂ زمین اپنی پیداوار و زرخیزی کے لحاظ سے چنداں قابل لحاظ نہ تھا جیسا روسی ٹکڑا لیکن فوجی نقطۂ نظر سے بہت اہم تھا کیونکہ یہاں سے ہندوستان اور بحر عمان کی حفاظت بخوبی ہو سکتی ہے۔

تیسرا ٹکڑا درمیان کا غیر جانبدار قرار دیا گیا تاکہ روس و برطانیہ کے درمیان تصادم نہ ہو سکے۔ اسی معاہدہ کی رو سے ایران کی مالی حیثیت کی تحقیق بھی ضروری سمجھی گئی جس سے مقصود صرف یہ تھا کہ سوائے روس اور انگلستان کے کسی اور حکومت سے ایران قرض نہ لے سکے۔

گزشتہ جنگ عظیم تک تو روس اور انگلستان دونوں نے اس معاہدہ کی پابندی کی، لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو روس نے اپنا دائرۂ اثر وسیع کرنا چاہا اور ادھر جرمنی و ترکی نے صوبۂ ارزنجان کی طرف اقدام شروع کیا۔ پھر جب روس میں انقلاب رونما ہوا تو بالشیوک حکومت نے تمام قدیم معاہدے کالعدم کر دئے اور سنہ ۲۱ء کے عہدنامۂ ماسکو کی رو سے ایران پر جو قرض تھا اس کو بھی چھوڑ دیا۔ برطانیہ بھی مجبور ہوا کہ وہ غصب کئے ہوئے علاقہ کو چھوڑے لیکن اسی کے ساتھ ایران سے ایک اور معاہدہ کی طرح ڈالی جس سے مقصود خلیج فارس میں مرکزی اثر پیدا کرنا تھا۔ لیکن بعد کو ایران کی مجلس ملی نے اس معاہدہ کو بھی منسوخ کر دیا اور اس طرح ایران اغیار کے اثرات سے پاک ہو کر آزاد ہو گیا۔ اسی اثنار میں رضا خاں پہلوی نے تین ہزار کی جمعیت سے طہران پر قبضہ کر کے سید ضیاء الدین طباطبائی کی سیادت میں وزارت وطنی قایم کی اور وزارت حربی کی خدمات خود اپنے سر لے لیں (فروری سنہ ۲۱ء) رضا شاہ

کی فوجی زندگی معمولی سپاہی کی حیثیت سے شروع ہوئی تھی لیکن اپنی قابلیت و شجاعت، ذہانت و ذکاوت کے بدولت جنرل کے مرتبہ تک پہونچ گئے تھے۔

وزارت حربیہ کا کام سنبھالنے کے بعد فوجی تنظیم کا کام شروع کردیا اور مصارف فوج کے لئے وزارت مالیہ کے بعض شعبے بھی وزارت حربیہ میں شامل کر لئے۔

اس کے بعد اکتوبر ۱۹۲۳ء میں احمد شاہ قاچار کو جو نہایت کمزور بادشاہ تھا مجبور کرکے وزارت عظمیٰ کے خدمات رضاخاں نے خود حاصل کرلیں اور ۲۸ اکتوبر کو وزارت ملی کی طرف سے احکام نافذ کئے گئے کہ احمد شاہ قاچار ایران چھوڑکر یورپ چلاجائے چنانچہ نومبر میں براہ بغداد و بیروت وہ فرانس چلا گیا اور وہیں ۱۹۳۰ء میں انتقال کیا۔

احمد شاہ کی روانگی کے بعد سوال یہ پیدا ہوا کہ فرمانروا کس کو بنایا جائے۔ رضاخاں کے لئے آسان تھا کہ وہ تخت ایران پر قابض ہوجاتا لیکن چونکہ وہ فی الحقیقت ملک کی ترقی چاہتا تھا اور اسے تاج کسریٰ سر پر رکھنے کی تمنا نہ تھی اس لئے اس نے قیام جمہوریت کی طرح ڈالی اور جس وقت ملک کو یہ معلوم ہوا تو اکثر افراد نے اس کو بہت پسند کیا اور ۲۱ مارچ ۱۹۲۴ء (جو ایرانیوں کا یوم نوروز ہے) اعلان جمہوریت کی تاریخ مقرر کی گئی، لیکن اسی اثناء میں علماء دین کی مخالفت شروع ہوگئی تھی اور انھوں نے جمہوریت کو شریعت شیعی کے مطابق ناجایز قرار دیدیا تھا۔ چونکہ ایران میں اسوقت مجتہدوں کا بڑا اثر تھا اور ان کی طرف سے کسی فتوی کا صادر ہوجانا اہل ایران کے لئے گویا حکم خدا کا نازل ہونا تھا اس لئے رضاخاں نے یہ دیکھ کر کہ اہل مذہب کی مخالفت اس وقت کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اعلان جمہوریت کو ملتوی کردیا۔

ایکسال کے بعد جب رضاخاں کا تسلط پورے ملک پر اچھی طرح قایم ہوگیا تو اس نے اکتوبر ۱۹۲۵ء میں احمد شاہ قاچار اور اس کے خاندان والوں کے لئے خلع حکومت ایران کا اعلان کرکے دستوری حکومت کی تجویز پیش کی اور عنان صدارت بدستور اپنے ہاتھ میں رکھی۔

مجلس نوابین نے ۸۰ رایوں سے اس تجویز کو منظور کیا اور جمعیۃ وطنیہ مختلف جماعتوں کے ۲۰۰ نمایندوں پر مشتمل قرار دی گئی۔

دسمبر ۱۹۲۵ء میں جمعیۃ وطنیہ نے بالاتفاق نظام ملوکیت کا پھر استرداد چاہا اور اس طرح رضاخاں پہلوی رضا شاہ ہوگیا۔

سوشلسٹوں سے!

(ایک امریکن سرمایہ دار کا نقطۂ نظر)

میں ایک سوشلسٹ سے خطاب کرنا چاہتا ہوں ۔ عام سوشلسٹ سے! میرا خطاب کارل مارکس یا ٹراٹسکی سے نہیں ہے ۔ بلکہ میں ان لاکھوں آدمیوں میں سے ایک کو مخاطب کرنا چاہتا ہوں جن کے نزدیک دنیا تمام صرف روٹی اور مکھن کا ہے ۔ اب سوال یہ ہے کہ اشتراکیت دراصل ہے کیا چیز۔

ہر سوشلسٹ یقین رکھتا ہے کہ یہ عالم ایک مخصوص نظام کے ماتحت چل رہا ہے ۔ وہ کسی انفرادی ہستی رکھنے والے خدا کا اعتقاد نہیں رکھتا وہ مادیت پسند ہے اور اس کا عقیدہ ہے کہ جب آدمی مرجاتا ہے تو وہ ہمیشہ کے لئے مرجاتا ہے۔

تم تعاونی مشترکہ دولت (Cooperative Commonwealth) پر بھی اعتقاد رکھتے ہو ۔ یعنی ایسی دنیا کے قائل ہو جہاں ہر شخص ہر چیز کا مالک ہوگا ۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے ۔ بے شک سوشلزم کی یہ ایک مختصر تعریف ہے جس پر شاید تم حرف گیری نہ کر سکو۔

اچھا تو تم ایسی تعاونی مشترکہ دولت پر اعتقاد رکھتے ہو جہاں ہر شخص کی کمائی ایک مشترکہ برتن میں ڈالدی جائے اور ہر شخص اپنے کام یا ضروریات کے مطابق اس میں سے نکال لے ۔

اچھا میں اس پر بھی بحث نہ کروں گا ۔ میں ایک ایسے نظام معاشرت کا تصور کر سکتا ہوں جہاں ایک ملکیت پر ہر شخص کا مساوی حق ہے ۔ مگر میں یہ پوچھوں گا کہ کیا کوئی ذی فہم سوشلسٹ یہ سمجھتا ہے کہ آیندہ دس پشتوں میں کوئی ایسا نظام معاشرت پیدا ہو سکے گا ۔

تم ایک ایسے نظام معاشرت پر عقیدہ رکھتے ہو جہاں سوسائٹی کا ادنیٰ طبقہ بھی اعلیٰ طبقہ پر اپنا اثر رکھیگا اور جہاں تمام تعلیم یافتہ جماعت کو کام کرنا پڑے گا ورنہ فاقہ ہوگا ۔

اچھا، میں اس باب میں موقع لینے کو تیار ہوں، میں فاقہ کرنے پر آمادہ ہوں، میں یہ نہیں مانتا کہ جب

اجتماعیت ہو جائے گی تو کام ایک کھیل ہو جائے گا اور کام جب کھیل ہو جائے تو وہ کام نہیں رہتا۔ کام کی تنہا خصوصیت یہی ہے کہ ہم اُسے کرنا نہیں چاہتے کیونکہ جب نفسیاتی نقطۂ نظر سے لکڑی چیرنا گات کھیلنے کی طرح تفریح کا مشغلہ ہو جائے گا تو لکڑی چیرنا "کام" نہ رہ جائے گا۔ لیکن جہاں تک ہم سمجھ سکتے ہیں "کام" ہمیشہ کام رہیگا، اور مجھے اس کی خواہش نہ ہوگی۔

آج کل اجتماعیت تمھاری زندگی پر جس حد تک اثر ڈالتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ محض ایک خواب ہے ایک تصور ہے اور کچھ نہیں، میں سوشلسٹوں کو جانتا ہوں۔ ان میں سے بعض کو میں اپنے چاروں طرف آج بھی پاتا ہوں۔ جو بہت اچھے لوگ ہیں مگر جب سے میں نے ان کو جانا ہے وہ بیدار نہیں ہوئے ہیں۔ وہ کبھی بیدار نہ ہوں گے اور نیند ہی میں مرجائیں گے۔ مجھے اس پر اعتراض نہیں ہے بلکہ مجھے اس پر مسرت ہے مرنے کا یہ بہت عمدہ طریقہ ہے اور زندہ رہنے کا بھی بہت اچھا راستہ! مجھے اس پر کچھ اعتراض نہیں لیکن میں جو کچھ کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ ایک "نصب العین" پر زندہ ہیں۔ وہ ایک نظریہ پر جی رہے ہیں، وہ ایک ایسے مذہب پر زندگی گزار رہے ہیں جس کا حقیقی اور جسمانی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

عملی اجتماعیت (Practical Socialism) کوئی سیاسی نظریہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک مذہبی اُصول ہے۔ تم ایک مذہبی اُصول پر اُسی طرح قایم ہو جس طرح ایک عیسائی سائنسداں اپنے مذہبی اُصول پر۔ تم ایک تنگ خیال اور فرقہ وارانہ اُصول پر اُس طرح جی رہے ہو جس طرح ایک میتھوڈسٹ (Methodist) ایک تنگ خیال اور فرقہ وارانہ اُصول پر جیتا ہے اور جب تم اپنی دوررس نگاہوں سے ایک آدمی کو دیکھتے ہو اور کہتے ہو "کیا تم سوشلسٹ ہو؟" تو مجھے انجمن نجات دہندہ (Salvation Army) کا وہ ممبر یاد آجاتا ہے جو تمھاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا ہے "کیا تم کو مسیح سے محبت ہے؟"

میں بحث کی خاطر یہ ماننے کو طیار ہوں کہ کبھی مستقبل بعید میں دنیا ایک ایسا نظام معاشرت قائم کرنے میں کامیاب ہو سکیگی جس میں ہر شخص عام راحت کا خیال کرے گا اور جہاں وہ اپنی کمائی دوسروں کی کمائی کے ساتھ ملاکر برابر کا حصہ لینے کو تیار ہو جائے گا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا ہم اُسوقت خوش رہ سکتے ہیں۔ کیا دنیا کی سب سے بڑی بُرائی یہ دولت کی غیر مساوی تقسیم ہے۔

میں نے بارہا اس مسئلہ پر غور کیا ہے اور ہمیشہ اسی نتیجہ پر پہونچا کہ روٹی اور مکھن کا سوال ہی زندگی کی کل کائنات نہیں ہے۔ کیونکہ جب ہم اُس کی طرف سے مطمئن ہو جاتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ زندگی کا کوئی جزو نہیں تھا۔ میں اب بھی قرضدار بننے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ میں سونے کی اینٹیں خرید سکتا ہوں اور اُسے پھینک سکتا ہوں۔ میں اب بھی ایسے لوگوں کو پاتا ہوں جو مجھ سے زیادہ اچھی حالت میں ہیں اور میں محسوس

کرتا ہوں کہ مجھے اب بھی کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔ میں نے زندگی کی حقیقی چیزوں کو جہاں تک روپیہ کی رسائی نہیں ہے نہیں چھوا ہے اور یہ چیزیں مجھے پریشان کرتی ہیں۔ یہ وہ معمولی چیزیں ہیں جو انسان کے جسم میں نہیں بلکہ دماغ میں چکر لگاتی ہیں۔ وہ ایسے مسئلے ہیں جو انسان پر اور کسی چیز سے زیادہ اثر ڈالتے ہیں۔

تم سوشلسٹ، آج اجتماعیت کے بارہ میں گفتگو کرتے ہو۔ اگر دوسرے حصہ میں کوئی ایسا آدمی ہو جو کسی مظاہرہ سے یہ دکھا سکے کہ انسان ہمیشہ زندہ رہیگا تو کسی شخص کو اجتماعیت میں ایک منٹ کے لئے بھی دلچسپی نہ رہیگی موت اور زندگی کے یہ ابدی مسئلے، اقتصادی مسئلوں کے مقابلہ میں اتنے زبردست ہیں کہ اگر ان کا کوئی حل ہو تو کوئی شخص اقتصادی مسائل کا خیال بھی نہ کرے۔

تم سوشلسٹ لوگ کہتے ہو کہ اگر اجتماعیت ہوتی تو لوگوں کو یہ مصیبتیں نہ ہوتیں۔ نہیں، ضرور ہوتیں! ان کو سرطان کا سامنا کرنا پڑتا اور میں، اتنا ہی غریب ہوتا جتنا ایک معمولی مزدور جو سوشلسٹ نہیں ہے۔ تم لوگ اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا رکھتے ہو کہ تم لوگ کام کرتے ہو۔ تم سوشلسٹ ہو۔ میں بمقابلہ اس کے کہ مجھے سرطان یا دق ہو جائے یہ زیادہ پسند کروں گا کہ میں ایک معمولی مزدور کے برابر غریب ہو جاؤں۔ مگر پھر بھی جب میں اپنے چاروں طرف دیکھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ کوئی شخص عرصہ تک بدحالی میں خوش نہیں رہ سکتا۔

درحقیقت ایک شخص یہ خیال کرتا ہے کہ زندگی میں یہ مادی چیزیں ہی وقعت رکھتی ہیں۔ مگر دراصل انکی کوئی وقعت نہیں ہے۔ جب ایک آدمی اچھی طرح سے سکونت پزیر ہو جاتا ہے اور اپنے لئے ایک نفیس مکان بنوا لیتا ہے تو سب سے بڑی تقریب جس میں وہ شرکت کرتا ہے خود اُسی کی تجہیز و تکفین ہے۔

اِس دنیا میں کھانے کے متعلق کبھی مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی البتہ یہ کہ میرے پاس وہ بہت زیادہ رہا اس سے مجھے گٹھیا بھی ہو سکتی تھی اور تم غریب لوگ خوش ہو کیونکہ تمھیں گٹھیا نہیں ہے۔ یہ تکالیف اور مصیبتیں زندگی کا ضروری جزو ہو گئی ہیں جن کا اجتماعیت علاج نہیں کر سکتی اور یہ ابدی پریشانیاں ہیں جو ہمیشہ رہتی ہیں مجھے مچھر دق کرتے ہیں اور اسی طرح مسلحین قوم، اور تمام وہ بیوقوف آدمی جو دوسروں کے معاملات میں دخل دیتے ہیں۔ پھر جب اجتماعیت ہو جائے گی تو ایسے لوگوں کو اور موقع ملیگا کیونکہ اُسوقت ان کو اور کوئی کام کرنا ہی نہ ہوگا۔

کارل مارکس کا قول ہے کہ "آسمان کی بادشاہت خود تمھارے اندر ہے" اگر اسی کا نام سوشلزم ہے تو میں تم سے پوچھتا ہوں کہ وہ کب آنے والی ہے۔ اگر وہ آگئی تو مجھے اس پر اعتراض نہ ہوگا۔ مگر یہ کہنا کہ وہ آسکتی ہے، تمام تاریخ انسانی اور ان مسلمہ حقایق سے انکار کرنا ہے جو انسان سائنس اور زندگی کے بارے میں سیکھ سکتا ہے۔ انسانوں کی قوم ایک پشت میں نہیں بنائی جا سکتی۔

دولتمند آدمی — اگر وہ سمجھدار ہیں۔ اور ان میں سے اکثر واقعی نہیں ہوتے — دنیا میں فوری اجتماعیت سے مرعوب نہیں ہوتے۔ ان کو ایسی بدنظمی اور ابتری کا (جو آج کل دنیا پر چھائی ہوئی ہے) خوف نہیں ہے۔ میں اس مسئلہ میں ان کا ہم آہنگ نہیں ہوں۔ میں غیر جانبدار ہوں۔ امن سے زیادہ ہر دوسری چیز بہتر ہے۔ وہ انقلاب فرانس سے بھی اسی طرح خائف رہے۔ سوشلزم، اس انقلاب کا نتیجہ نہیں تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سے بہتر ایک چیز ادر ظہور پذیر ہوئی مگر اجتماعیت کا خواب پورا نہیں ہوا۔ تم کو سوشلسٹ حکومت ایسی بھی نہیں مل سکی جو ۲۴ گھنٹہ تک قائم رہتی۔ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں اور تم سوشلسٹ اس کو شاید نہیں جانتے کہ تمھیں ایسی کوئی زندگی نہیں مل سکتی جو عرصہ تک قائم رہ سکے۔

تبدیلی اس طرح نہیں ہوا کرتی۔ بیشک تم اپنے لائحۂ عمل کے مطابق زمین پر سوشلزم قائم کرو، لیکن وہ برت کے گیند کی مدت حیات تک قائم رہے گی۔

مکتوبات نیاز

میرے عزیز دوست

آپ نے جس جوش محبت سے میرا حال پوچھا ہے اس کا اقتضا تو یہی تھا کہ میں واقعی تباہ حال ہوتا اور بندے اور در خورِ التفات رہتا لیکن افسوس ہے کہ زندہ ہوں، خوش ہوں اور ایسی پُر سکون زندگی بسر کر رہا ہوں

تو گوئی موجے از دریائے نو رست

یہ تو میں نے اس لئے لکھ دیا کہ اگر آپ یہ تحریر کسی اور کو دکھائیں تو اس کو مجھ پر رشک آئے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں میرا اب اتنا حصہ بھی نہیں ہے جتنا آپ کا عقبیٰ میں فرق صرف اتنا ہے کہ آپ اس منزل پر پہونچے ہیں "اسباب بادہ نوشی" کی فراوانی سے اور میں اپنی "تشنہ لبی و بے سرو سامانی" سے آپ ہی بتائیے کہ روز کی جگرکاوی و دماغ پاشی، یہ سد رمق سے زیادہ کبھی نہ بڑھنے والی آسودگی اور اس کو بھی جانے دیجئے، یہ یکساں شام و سحر یہ روز صبح اٹھنا اور رات کو سو جانا ــــ آخر ہے کیا؟ اس میں کیا خاک لطف ہے کہ کوئی شخص جینے کی تمنا کرے۔

ہائے غالب! جب اس سے محشر میں باز پرس ہوئی کہ یہ جو تو نے ساری عمر سیاہکاری میں بسر کر دی تو اس سے تجھے کیا ملا۔ اس نے جواب دیا کہ یہ میں کچھ نہیں جانتا، مجھے تو اتنا معلوم ہے کہ اگر میں ساری عمر روزہ و نماز میں بسر کر دیتا تو آپ بہت خوش ہو کر زیادہ سے زیادہ یہی کرتے کہ فردوس عنایت کر دیتے، لیکن آپ ہی بتائیے کہ مجھے وہاں کیا خاک لطف آتا۔

صبوحی خورم گر شراب طہور ، کجا زہرۂ صبح و جام بلور
دم شبرو و ہائے مستانہ کو ، یہ ہنگامہ غوغائے مستانہ کو
دراں پاک میخانۂ بے خروش ، چہ گنجائش شورش نائے و نوش
سیہ مستی ابر و باراں کجا ، خزاں چوں نباشد بہاراں کجا

....

نظر بازی و ذوقِ دیدار کو، — بفردوس روزن بدیوار کو؟
نہ چشم آرزومند دلالۂ — نہ دل تشنۂ ماہ پرکالۂ

رنگینی حور سو اس کی بھی یہ کیفیت ہے کہ

گر بزد دم بوسہ اینش کجا — فریبد بہ سوگند و نیش کجا
برد حکم و نبود لبش تلخ گوئے — دہد کام و نبود دلش کامجوئے

یعنی جنت میں شراب ملی بھی تو کیا نہ وہاں شور نوشانوش ہے، نہ رندوں کا جوش و خروش، نہ گھٹاؤں کا لطف ہے نہ بادِ نسیم کے جھونکوں کا مزہ، نہ جھانک تانک کا موقعہ ہے نہ کسی کی آوازِ خلخال کا انتظار۔ رنگینیٔ حور سو ایسے معشوق کو لیکر کوئی کیا کرے جو نہ جھوٹی قسم کھانا جانتی ہو اور نہ دست درازی کے وقت بدن چرانا جسے نہ اظہارِ مدعا پر گالیاں دینا معلوم ہو اور نہ اندازِ سپردگی میں کسی خواہش لطف کا احساس۔

سنا آپ نے، یہ ہے تمام عمر کے زہد و اتقا کا نتیجہ۔ فردوس یا بقول غالب ایک پاک میخانہ! میخانہ اور پاک، سبحان اللہ! — تو پھر آپ ہی بتائیے کہ اس دنیا میں جبکہ زندگی تمام صرف ایک باقاعدہ مشین کی سی گردش کا ہو جینے کے کیا معنی ہیں۔ جس آیندہ توقع پر یہ سب کچھ گوارا ہو سکتا تھا اس کا حال بھی آپ نے سُن لیا۔

آپ کا ذکر نہیں کہ جب چاہا سُو سُو کر دن کو رات بنا لیا اور شرابیں پی پی کر رات کو دن۔ میں اپنی کہتا ہوں اور آپ سے پوچھتا ہوں کہ باوجود اس علم کے آپ کی یہ "دل پُرسیاں" چھیڑ نہیں تو اور کیا ہے؟

آپ کو کیا خبر کہ اس دو من دو سیر کے نہ ہل سکنے والے وزنی جسم کے اندر کتنا بے چین و متحرک دل چُھپا ہوا ہے۔ دل بیقرار، دماغ بیقرار، فطرت بیقرار۔ لیکن ایک زبان سے جو نہیں کہتا تو دنیا سمجھتی ہے کہ میں جامد و بیحس ہوں، قانع و متوکل ہوں۔ استغفر اللہ! — امسال کی بارشیں! معاذ اللہ۔ خدا جانے کتنی بار جی چاہا کہ "دامن کے چاک اور گریباں کے چاک" کو ملا دیجئے۔ لیکن سوائے اس کے کہ میں اور میرا دربان دونوں کا "مدار گھر کی گھاس کھودنے" پر رہا ہو، ان سیلاب انگیزیوں سے اور کوئی لطف نہ اُٹھا سکا۔ حد یہ ہے کہ آپ تک بھی نہ پہونچ سکا۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ ایک چیز قاضی کیلئے تو حلال ہوتی اور میرے لئے حرام — آپ ستمبر میں کشمیر جا رہے ہیں اور مجھے بھی دعوت دے رہے ہیں۔ شکریہ، لیکن افسوس ہے کہ کشمیر میں میرے لئے اب کوئی کشش باقی نہیں رہی، اگر وہ جنت بھی ہے تو میری دیکھی بھالی ہوئی ہے — گو کھنگالی ہوئی نہیں۔ ہاں اگر آپ "کالے پانی" چل سکتے ہیں تو بیشک میں طیار ہوں۔ یہیں وہاں کوئی دیکھے گا تو سہی۔ ایسی جگہ جانے سے فائدہ جہاں خود اپنی اوقات سے نفرت ہو جائے — سنا ہے کہ میر صاحب قبلہ کا مزاج ناساز ہے۔ اگر آپ کو کچھ حال معلوم ہو تو اطلاع دیجئے۔ مجھے ان سے خاص علاقہ ہے اور میں ان کی صحت و عافیت کا ہمیشہ متمنی رہتا ہوں، کیونکہ اب ہماری بزم میں وہی ایک رہ گئے ہیں، جن کو گالیاں دینا آتا ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ اُٹھ گئے تو پھر محبت سے کوئی "تو" کہنے والا بھی نظر نہیں آتا۔ خود جا کر دریافت کیجئے اور اطلاع دیجئے کہ خدانخواستہ مرنے والے تو نہیں۔

مطبوعات موصولہ

قنوطیت - فلسفۂ یاس | ڈاکٹر میر ولی الدین ام۔ اے۔ پی ایچ ڈی نے جو جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد میں فلسفہ کے پروفیسر ہیں۔ نظریۂ یاس یا قنوطیت پر یہ تصنیف شائع کی۔

قنوطیت ترجمہ کیا جاتا ہے انگریزی لفظ " Pessimism " کا جسے اہل مصر "تشاؤم" کہتے ہیں اور جس کے ضد Optimism کو "تفاؤل" یہاں اس کا ترجمہ رجائیت کیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آخر میں "ت" کا اضافہ کرنے سے ایک اصطلاحی رنگ ضرور پیدا ہوتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ "قنوطیت اور رجائیت" دونوں اصل مفہوم پر حاوی نہیں ہیں

قنوط و رجا کے معنی یاس و اُمید کے ہیں، جو " Pessimism اور "Optimism" کا نتیجہ تو ضرور کہلائے جا سکتے ہیں لیکن حقیقی مفہوم کا اظہار ان سے نہیں ہوتا۔ ان کا اصل مفہوم ہے زندگی کے تاریک و روشن پہلو پر نگاہ کرنا جو "تشاؤم و تفاؤل" ہی سے پوری طرح ظاہر ہوتا ہے۔ بہر حال ڈاکٹر ولی الدین صاحب کی یہ کتاب اسی فلسفہ "تشاؤم" سے تعلق رکھتی ہے جسے انگریزی میں Pessimism کہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی تالیف میں زیادہ تر شوپنہور اور اس کے مشہور شاگرد ہارٹمین ہی کے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اس لحاظ سے کہ شوپنہور ہی پہلا وہ شخص ہے جس نے اس نظریہ کو ایک فلسفہ کی حیثیت سے پیش کیا درست بھی ہے، لیکن ضرورت تھی کہ سب سے پہلے تاریخی حیثیت سے اس نظریہ پر گفتگو کی جاتی اور بتایا جاتا کہ عہد تاریخ بلکہ ماقبل تاریخ میں اس کا سراغ کہاں تک ملتا ہے۔

اول تو علمی دنیا میں سرے سے فلسفہ[1] ہی نہایت نامعقول چیز ہے (میں نے لفظ نامعقول قصداً اس لئے استعمال کیا کہ ایک فلسفی سے زیادہ "معقولیت" کا مدعی اور کوئی نہیں ہوتا ہے) خواہ وہ کسی مبحث سے متعلق ہو۔

---

[1] ایک فلسفی و سائنس دان کا فرق کسی زبردست نقادِ مغرب نے یہ بتایا ہے کہ:-

A Scientist knows nothing about anything & a philosopher knows everything about nothing.

چہ جائیکہ فلسفۂ قنوطیت سوائے ہادمِ انسانیت ہونے کے اور کوئی خدمت انجام ہی نہیں دیتا۔ اس لئے ایسی کتابوں کی اشاعت اگر اس خیال سے کی جائے کہ دنیا کو اس احساس سے پاک کرنا ضروری ہے تو بہت مبارک خیال ہے، لیکن اگر مقصود اس کی حمایت وعنایت ہے تو اس سے زیادہ مضرت رساں چیز کوئی اور نہیں ہوسکتی خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے لئے جو پہلے ہی سے "توکل وقناعت" کے مارے ہوئے بیدست وپا پڑے ہوئے ہیں۔

فلسفۂ قنوطیت کا یہ نظریہ کہ "دنیا ہیچ ست وکار دنیا ہمہ ہیچ" بہت قدیم چیز ہے اور اس کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے جب انسان نے حوادثِ فطرت وعناصر کے مقابلہ میں پے در پے شکست حاصل کرنے کے بعد اپنی تسکین کے لئے نہ صرف اس دنیا کی کامرانی ومسرت کو لغو قرار دیا بلکہ اسی کے ساتھ ایک اور خیالی دنیا (موت کے بعد کی) پیدا کر کے اپنے "ناکردہ گناہوں" کی تکمیل کو اس سے وابستہ کیا۔ گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہئے کہ فلسفۂ قنوطیت اور مذہب کی پیداوار تقریباً ساتھ ہی ساتھ ہوئی ہے اور اس لئے دنیا کے اکثر مذاہب (خصوصاً بودھ اور مسیح مذہب) نے دنیا سے نفرت کرنے کا درس دیا ہے اور یہاں کے لذائذ ونعائم کو غیر فانی وناپائیدار قرار دے کر ان سے احتراز کی ہدایت کی ہے۔

"بین الدفتین" اس کا اولین سراغ قدیم عبرانیوں کے صحیفۂ ایوب تک پہونچتا ہے جس سے مسیحی تعلیم بھی متاثر ہوئی اور اس طرح دنیا میں باقاعدہ رہبانیت کو اساس مذہب قرار دینے کی بنیا پڑی۔ دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے اس نظریہ کی مخالفت کی اور اسی عالم میں "جنات عدن" حاصل کرنے کی تعلیم انسان کو دی، لیکن چونکہ بربنائے مصلحت مسیحی ویہودی روایات کا سدّ باب اول اول مناسب نہیں تھا اور رسول اللہ اسوقت موجود نہ تھے جب اس مصلحت اندیشی کی ضرورت باقی نہ رہی تھی، اس لئے یہودیوں اور مسیحیوں کی دیگر روایات کے ساتھ "درسِ قنوطیت" کی روایت کا بھی مسلمانوں میں رواج ہوا اور اسلام کے بعض کاہل وناکارہ لوگوں نے اپنے مطلب کے موافق پاکر اس کا کافی پروپاگنڈا کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مستقل گروہ صوفیہ کا پیدا ہوگیا جس نے اس نظریہ کا دوسرا نام "توکل وقناعت" رکھا اور اسی پر اس کی تمام "کارگاہ بیکاری" کا انحصار ہے ــــ نظریۂ قنوطیت کے زیر اثر اگر ایک طرف یہ راہبانہ ومتصوفانہ ذہنیت پیدا ہوئی تو دوسری طرف ایک جماعت (لیکن بہت محدود ومختصر) ایسی بھی رونما ہوئی جس نے اس عالم شر کے نقصانات کی تلافی افادی نظریہ سے کی چنانچہ خیام، لیوپارڈی، ہین اور بائرن کی شاعری اسی قسم میں شامل ہے، یعنی اگر ایک طرف اس نظریہ نے مذہب کی صحیح صورت کو مسخ کیا تو دوسری طرف ایک نوع کی لامذہبیت بھی اس نے پیدا کی جس میں خدا اور اسکے قدرت کی طرف سے مایوسی ومجبوری کی کیفیت پائی جاتی ہے۔

شوپنہور اور اس کے شاگرد ہارٹمین سے قبل اس خیال نے کوئی منظم علمی صورت اختیار نہیں کی تھی لیکن انھوں نے اس کو فلسفہ کی ایک مستقل شاخ کی حیثیت سے پیش کیا اور اہل علم نے اس طرف توجہ کی۔ ان دونوں کی تعلیمات کا خلاصہ صرف اس قدر ہے کہ دنیا ناقابل فہم چیز ہے اور انسان اس کے سمجھنے سے عاجز ہے۔ یہی فلسفہ فارسی کے بعض صوفی شعراء کا بھی ہے لیکن فرق اتنا ضرور ہے کہ شوپنہور کی نگاہ " دنیا و مافیہا" سے آگے نہیں جاتی اور انھوں نے جو کچھ کہا ہے اس کا تعلق " ماوراء سرحد ادراک" سے ہے۔ الغرض نظریۂ قنوطیت نے عملی دنیا اور مادی عالم کو نقصان پہونچانے کی بہت کوشش کی، لیکن چونکہ فلسفہ کے مقابلہ میں سائنس نے اپنے لئے زیادہ جگہ پیدا کر لی تھی اس لئے اس کا رنگ جم نہ سکا اور سوائے اس کے کہ کبھی کبھی تفریح کے سلسلہ میں اس کا ذکر آجائے اور کوئی اہمیت اسے حاصل نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے اچھا کیا کہ یہ رسالہ لکھ کر فلسفۂ قنوطیت کی علمی حیثیت کو بھی اُردو داں طبقہ کے سامنے پیش کر دیا، ورنہ جس حد تک عمل کا تعلق ہے مسلمانوں سے زیادہ ماہر اس نظریہ کا اور کون ہو سکتا ہے۔

اس کتاب کی قیمت درج نہیں لیکن فاضل مصنف سے فتح دروازہ حیدرآباد دکن کے پتہ پر مراسلت کرنے سے معلوم ہو سکتی ہے۔

دل صد پارہ مجموعہ ہے جناب طالب صفوی کے منتخب اشعار کا۔ جناب محمد عباس صاحب طالب صفوی جو شمس آباد (فتحگڈھ) کے رئیس ہیں علم و ادب کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں اور انکے اوقات کا اکثر حصہ علمی تحقیقات ہی میں صرف ہوتا ہے، لیکن میرے لئے یہ بالکل جدید انکشاف ہے کہ وہ شاعر بھی ہیں اور نہایت اچھے شاعر۔ جناب طالب ابتدا میں لکھتے ہیں کہ :-

"میں عقیدتاً غالب پرست ہوں، لیکن غالب کے تتبع کو مشکل نہیں محال سمجھتا ہوں اس لئے مومن کے تتبع کی کوشش کرتا ہوں اگرچہ اس کافر کا تتبع بھی دشوار ہے" ۔ اور انتخاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب طالب نے اس تتبع کی دشواری کو بڑی حد تک آسان کر کے دکھا دیا ہے، چنانچہ بعض اشعار ملاحظہ ہوں :-

تم اور مجھ کو دیکھ کے خوش ہو، محال ہے ۔۔۔ کیوں مسکرائے سچ کہو کیا یاد آگیا
سمجھتا ہوں کہ ملنے میں عدو سے مصلحت کیسی ۔۔۔ مگر ناچار اس کو بھی تمھاری مصلحت سمجھا
جب ان کا نام آیا تو گھبرا کے چپ ہوئے ۔۔۔ وارفتگی میں کھلنے کو تھے رازداں سے ہم
فریب جستجو دیکھو انھیں ڈھونڈھا وہاں جاکر ۔۔۔ جہاں مجھ کو یقیں تھا ان کا ہونا غیر ممکن ہے
میں اور درخورِ کرم یار، کیا کہوں، ۔۔۔ ہو بات اعتبار کی تو اعتبار آئے

یہ مجموعہ ۲ر آنہ کے ٹکٹ بھیجکر جناب طالب سے ملسکتا ہے۔

سوگوارِ شباب

اے بہارِ صنفِ نازک، اے محبت کی پری!
اے شبیہِ دلربائی، اے امینِ دلبری!

اُف! ترا حسنِ کمل اور تباہی آشکار
جلوۂ جنت بداماں اور بلاؤں کا شکار

پیکرِ عیش و محبت اور یوں سیماب وار
ہر نفس موجِ پریشاں، ہر نظر بے اختیار

نوجوانی اور غموں کے سیل میں غرق و تباہ
دل میں حرماں کی بھڑکتی آگ، لب پر سرد آہ

کلفتوں سے روح بوجھل، غم سے سینہ پاش پاش
پاؤں میں لغزش، تنفس میں مسلسل ارتعاش

زخم خوردہ دل، زباں خاموش، آنکھیں اشکبار
خشک لب، مایوس نظریں، نوجوانی سوگوار

دم بخود احساسِ غم سے شوخیٔ حسن و جمال
شام کو سوجائے جیسے مہرِ تاباں کا جلال

یادِ ماضی سے جگر میں آگ سینے میں کسک
رات کی تاریکیوں میں جیسے جگنو کی چمک

روح میں مدفن خوشی کا، دل میں شوہر کا خیال
شوق مردہ، زندگی مایوس، راحت پائمال،

زندگی دوبھر غموں سے، بار احساسِ حیات
دن اسیرِ بیکسی، مایوسیوں میں غرق رات

حسن میں شوخی، نہ جلووں میں جوانی کا گلال
آنسوؤں میں حسرتوں کا ایک سیلِ لازوال،

مانگ میں سیندور کی رونق اور نہ افشاں کی چمک
ہاتھ میں مہندی، نہ پیشانی پہ بندی کی دمک

کوئی زیور ہے نہ زینت ہے نہ عطرِ مشکبار
ململی سی ایک ساری، اور وہ بھی تار تار

بیوگی میں لٹ گیا ہے زینتوں کا قافلہ
چوڑیاں ٹھنڈی ہیں اور چہرہ بھی ہے اترا ہوا

میری دیوی! دیکھتا ہوں میں یہ کیسا انقلاب
آہ کیا دن دوپہر بھی ڈوبتا ہے آفتاب

کل جھکی تھی تیرے آگے شادمانی کی جبیں،
کل ترا حسن مبارک تھا، بہارِ دلنشیں،

آج تیرا ہر نفس ہے، نوحہ خوانِ انقلاب
آج دنیا کو ہے تجھ سے احتراز و اجتناب

چھن چکا ہے تجھ سے گونے کی بہاروں کا سرور
لٹ چکا ہے تیرے دل سے شادمانی کا غرور

مٹ رہی ہے سوگ کے ہاتھوں تری تابندگی
اف یہ تیری زندگی ہے یا عذاب زندگی

ساس نندوں نے دیا ہے تجھ کو ڈائن کا خطاب
بوڑھے، بچے، سب ہی کہتے ہیں تجھے خانہ خراب

سختیاں، طعنے، مصیبت کوسنے، شکوے، گلے
ایک شوہر کے نہ ہونے سے ہزاروں غم ملے

جشن کے گھر میں تجھے آواز بھی دیتے نہیں
لوگ، تیرا شادیوں میں نام تک لیتے نہیں

عورتیں بچتی ہیں تیری بیوگی کی چھاؤں سے
بس چلے تو تجھ کو یہ ظالم کچل دیں پاؤں سے

چھا گیا ہے ملک پر وہموں کا سیلاب عظیم
گم ہے طوفانی فضاؤں میں، سراطِ مستقیم

تیرا حال زار ہے، ملکی تباہی کی شبیہ
تیری ہر ذلت ہے، قومی کم نگاہی کی شبیہ

نوجوانی میں، بلائے زندگانی ہے سماج
سچ تو یہ ہے قہر ہیں اس ملک کے رسم و رواج

میری دیوی! توڑ دے ان بندشوں کے جال کو
اور مٹا دے ملک سے انسانیت کے کال کو

بیوگی کو دوزخ فرسودگی میں جھونک دے
روک لے یوں غم کی اٹھتی آندھیوں کو روک لے

توڑ دے بندِ قدامت، رو کے طوفاں موڑ دے
چھوڑ دے اوہام کی پابندیوں کو چھوڑ دے

جھونک دے آلام، رسموں کی دہکتی آگ میں
محو ہو جا اے ستم کش! پھر خوشی کے راگ میں

حسرتوں کے سر کچل دے، اے خوشی کی سوگوار
حسن کو ہونے دے اب بھی خواب غم سے ہوشیار

موجزن ہونے دے سینے میں محبت کی ہوا
روپ بھرنے دے جوانی کو نئی سحر کا

شوخ نظروں میں جلا دے حسن کے رنگیں چراغ
آرزوؤں سے سجا لے، شوق کے پھولوں کا باغ

پیروی دینِ فطرت اپنے دل میں ٹھان لے
میں رسولِ عشق ہوں، تجھ سے جو کہدوں مان لے

فطرت واسطی

قیمت ۸ر

نرخنامۂ اُجرت اشتہار

	ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۱۰۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۱۰ روپیہ
آدھ صفحہ	۵۰ "	۲۵ "	۱۳ "	۸ روپیہ
چوتھائی صفحہ	۲۵ "	۱۳ "	۷ "	۴ روپیہ

۱- اُجرت بہرحال پیشگی لی جائیگی۔ وی پی کے ذریعے وصولی منظور نہیں
۲- جتنی مدت کے لئے اشتہار دیا جانا طے ہوا ہے اُس کی رقم پیشگی یکمشت لی جائے گی۔ ماہانہ ادائی کی صورت میں نرخ وہی ماہانہ رہیگا۔
۳- اشتہار فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کمیشن ذریعہ خط و کتابت طے ہو سکتا ہے

منیجر "نگار" لکھنؤ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر .... پانچ روپیہ
ششماہی ہندوستان کے اندر ...... تین روپیہ
سالانہ بیرون ہند .... بارہ شلنگ
ششماہی بیرون ہند .... ۷ شلنگ

نوٹ:- رسالہ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے ۲۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ بعد کو آٹھ آنہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔
حصول جواب کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے۔

"منیجر"

تصانیف نیاز فتحپوری

مجموعۂ استفسار و جواب دو جلد

ان دونوں جلدوں میں سنہ ۲۲ء سے لیکر سنہ ۲۹ء تک کے استفسار و جواب شائع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسائل شامل ہیں۔

قیمت:- جلد اول [illegible]
جلد دوم [illegible]
علاوہ محصول۔

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔
جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں مع تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے
علاوہ محصول۔

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۳۲- افسانے سنہ ۳۳ء تک کے درج ہیں زبان قدرت بیان اعلیٰ تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی آپکو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت چار روپیہ (للعہ)
علاوہ محصول۔

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخ و نفسانی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی۔ نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپکو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔

قیمت تین روپیہ (سے؍)
علاوہ محصول۔

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہوجاتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)

بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (مے) سالانہ پیشگی تو رہ

شمار (۵)	فہرست مضامین نومبر ۱۹۳۶ء	جلد (۳۰)

اڈیٹر :- نیاز فتحپوری

جلد (۳۰)	نومبر	شمار (۵)

ملاحظات

اسلام کا خواب اور تعبیروں کی کثرت

قارئین نگار میں سے غالباً ہر شخص واقف ہوگا کہ لجسلیٹو اسمبلی کیا چیز ہے ؟ وہ حکومت ہند کی مرکزی مجلس قانون ساز ہے جہاں اصلاح معاشرت وتمدن کے سلسلہ میں اکابر ملک باہم تبادلۂ خیالات کرتے ہیں اور پھر کسی ایک نتیجہ پر پہونچکر مختلف قوانین وضع کرتے رہتے ہیں۔

اس مجلس میں ہندوستان کے تمام اقوام اور ملک کے تمام صوبوں کے نمایندے شامل ہیں اور اس لئے جو قانون وہاں وضع کیا جاتا ہے وہ امن عام کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھکر وضع کیا جاتا ہے۔ پھر چونکہ ہندوستان میں امن کا سوال نہ تہذیب ومعاشرت سے متعلق ہے نہ سیاسیات واقتصاد سے بلکہ صرف "مذہب ومذہبیات" سے اس لئے لازم تھا کہ کسی نہ کسی دن یہ سوال بھی سامنے آتا اور قانونی حیثیت سے غور کیا جاتا کہ مذہب کسے کہتے ہیں اور وہ مقررہ اصول کونسے ہیں جن کی بنا پر ہم ایک ہندو کو ہندو اور ایک مسلمان کو مسلمان سمجھ سکیں۔ چنانچہ اکتوبر کی ابتدا میں اس بحث کی نوبت آہی گئی اور اس کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہئے تھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ آریہ اور سناتن دھرمیوں کی طرف سے کوئی جامع ومانع تعریف پیش نہیں کی گئی لیکن مسلمانوں کی طرف سے اس کا اقدام کیا گیا جس کے جواب میں ایک فاضل ہندو رکن اسمبلی نے اعتراض کیا کہ "تمام مسلمان کسی ایک مسلک سے وابستہ نہیں ہیں اور ہر جماعت دوسری جماعت کو کافر قرار دیتی ہے اسلئے مسلمان کوئی ایسی تعریف اسلام کی پیش نہیں کرسکتے جس کو سامنے رکھ کر ہم ایک کافر و مسلمان میں تمیز کرسکیں۔

مسلمانوں کی طرف سے اسلام کی جو تعریف بھی پیش کی گئی ہو ہمیں اس سے بحث نہیں لیکن میں علماء کرام سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اُن کے پاس اس اعتراض کا کیا جواب ہے، اور کیا واقعی وہ ایسے حدود متعین کرسکتے ہیں، جو کفر و اسلام کے درمیان خط فاصل کا کام دے سکیں؟۔

اسوقت ہندوستان کی ۸ کروڑ مسلم آبادی میں ایک قابل ذکر جماعت شیعوں کی ہے جو یقیناً غیر شیعی حضرات کو مسلمان نہیں سمجھتے، دوسرا گروہ احمدیوں کا ہے جو سوائے اپنے کسی کو مسلم قرار نہیں دیتے اور تیسرا بہت بڑا جتھا سنیوں کا ہے لیکن یہ بھی مختلف طایفوں میں منقسم ہے:۔ رضاخانی، دیوبندی، مقلد، غیر مقلد، اہل قرآن، اہل حدیث وغیرہ وغیرہ ــــ اور ان میں سے ہر جماعت دوسرے کو کافر کہتی ہے۔ اور ایسی صورت میں اس فاضل ہندو رکن کا یہ کہنا کہ اسلام کی کوئی تعریف پیش نہیں کیجاسکتی یقیناً بالکل حق بجانب ہے۔

اس واقعہ پر ایک جرنلسٹ صاحب یوں اظہار خیال فرماتے ہیں:۔

"اس میں شک نہیں کہ مسلمان اپنی اپنی سمجھ کے موافق اسلام کا ایک جداگانہ مفہوم قرار دیکر ایکدوسرے کو کافر بتاتے ہیں، مگر اس کفر کے معنے ہرگز حقیقی کفر کے نہیں ہیں کیونکہ ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ جو انسان صدق نیت سے اسلام کا کلمہ پڑھتا ہے وہ مسلمان ہے، کافر ہرگز نہیں ہوسکتا۔ وہ کُفر جس سے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو منسوب کرتا ہے اس کے معنے کچھ اور ہیں"۔

اسوقت تک تو نزاع صرف کفر و اسلام کی تھی لیکن اب ہمارے فاضل جرنلسٹ صاحب "حقیقی و غیر حقیقی کفر" کا ایک اور اضافہ اس میں کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اسلام کی تعریف اسی طرح ہوسکتی ہے کہ پہلے کفر کی تعریف متعین کردیجائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ سب سے مقدم حقیقی و غیر حقیقی کفر کی حقیقت معلوم کرنا ضروری ہے تاکہ اسی کے مطابق ہم ایک حقیقی و غیر حقیقی مسلمان کو آسانی سے پہچان سکیں۔

ان کا یہ کہنا کہ "ہر وہ انسان جو صدق نیت سے اسلام کا کلمہ پڑھتا ہے مسلمان ہے" اسوقت درست ہوسکتا ہے جب ہم کو پہلے یہ معلوم ہوجائے کہ اسلام کا وہ کلمہ کونسا ہے جس کا صدق نیت سے پڑھ لینا متفقہ طور پر تمام جماعتوں کے نزدیک مسلمان بنا دینے کے لئے کافی ہے۔ اگر اس کلمہ سے مراد صرف وحدانیت و رسالت کا اقرار ہو تو چاہئے کہ مسلمانوں کی تمام جماعتیں ایک دوسرے کو مسلمان سمجھیں، لیکن چونکہ حقیقت یہ نہیں ہے

اس لئے معلوم ہوا کہ وہ کلمہ جو ایک انسان کو مسلمان بناتا ہے ہر جماعت کے نزدیک کچھ اور ہے اور مسلمانوں کا وہ دور ختم ہو چکا ہے جب شیرازہ بندی کا اصول صرف "تعالوا الی کلمۃ" پر قائم تھا۔

اب مسلمان اور اس کے کلمہ کا تعلق خدا اور رسول سے باقی نہیں رہا ہے، بلکہ صرف اس بحث سے کہ ابوبکرؓ و علیؓ میں خلافت کا حقدار کون تھا، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ میں کس کو زیادہ فقہی علم حاصل تھا، ائمہ حدیث میں کون کس مرتبہ کا تھا بلکہ اس سے بھی نیچے اُتر کر یہ کہ سماع بالمزامیر اور زیارت قبور جائز ہے یا نہیں۔ اسوقت اسلام نام نہ پاکیزگی اخلاق کا ہے نہ وحدانیت و رسالت کے اقرار کا بلکہ صرف روایات پرستی کا، تقلیدی رسم و رواج کا اور اُس صنمیاتی لٹریچر کی پرستش کا جو جھوٹی حدیثوں اور موضوع روایتوں کی بدولت مسلمانوں کے یہاں بھی کسی بُت پرست قوم سے کم نہیں پایا جاتا۔ اسوقت مسلمانوں میں اہل حدیث، اہل قرآن، اہل دل وغیرہ تو بہت ہیں لیکن "اہل اللہ" کوئی نظر نہیں آتا اور اسی لئے اس رُکن اسمبلی کا یہ کہنا کہ اسلام کی کوئی تعریف پیش ہی نہیں کی جا سکتی بالکل درست ہے۔

یہی جرنلسٹ صاحب آیندہ چلکر لکھتے ہیں کہ:-

"حقیقتاً ہندو مذہب کی کوئی تعریف متعین نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ بودھ بھی ہندو جین بھی ہندو، سناتنی بھی ہندو، ساجی بھی ہندو اور چند سال بعد عیسائی بھی ہندو اور مسلمان بھی ہندو۔ مذہب والا بھی ہندو اور لا مذہب بھی ہندو۔"

ہمارے فاضل صحافی نے ہندو مذہب کے مذہب نہ ہونے پر اتنی زبردست دلیل سے کام لیا ہے کہ ان کے پنداً میں اس کا کوئی جواب ممکن ہی نہیں، حالانکہ اس سے زیادہ خوبی ایک مذہب کی کوئی ہو ہی نہیں سکتی کہ وہ اپنی تمام جماعتوں کو ایک شیرازہ سے وابستہ رکھتا ہے اور باوجود اختلافِ خیال ان کی ہیئت اجتماعی کو بگڑنے نہیں دیتا۔

ہندو مذہب کی یہ وسعت کہ "بودھ بھی ہندو، جین بھی ہندو، سناتنی بھی ہندو اور ساجی بھی ہندو"، انھیں پسند نہیں لیکن اسلام کی یہ تنگ نظری کہ "شیعہ بھی کافر، سنی بھی کافر، مولانا شبلی بھی کافر، میں بھی کافر وہ بھی کافر، یہ بھی کافر" بڑی قابل فخر بات ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندو مذہب کے سمجھنے میں مسلمان بڑی غلطی سے کام لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جس طرح اسلام نام مخصوص معتقدات و عبادات کا ہے اسی طرح ہندو مذہب بھی ہوگا، حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔

مسلمانوں میں یہ دستور ہے کہ اگر کوئی شخص اُن کے معتقدات کے خلاف کسی خیال کا اظہار کرتا ہے تو اسے کافر بنا کر اپنی برادری سے خارج کر دینا چاہتے ہیں لیکن ہندوؤں کے یہاں یہ دستور نہیں پایا جاتا۔ اگر کوئی مسلمان دوزخ و جنت کا قایل نہیں ہے یا حشر و نشر کو تسلیم نہیں کرتا تو اسے علماء دین کافر کہدیں گے لیکن ہندوؤں کے

یہاں ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور ایک ہندو خواہ وہ کچھ سمجھے اور کرے بدستور ہندو بنا رہتا ہے۔

ہندوؤں کا مذہب بالکل سوسائٹی کا ایک نظام ہے جس کا تعلق اُن کے کلچر سے ہے ان کی مخصوص تہذیب و معاشرت سے ہے نہ کہ معتقدات سے۔ وہ رام کا ماننے والا ہو یا وشنو کا، گنیش کی پوجا کرنے والا ہو یا ان میں سے کسی کی پرستش کا قایل نہ ہو، ہندو ہے اور وہ کبھی غیر ہندو نہیں ہوسکتا۔ اُن کے یہاں سوسائٹی کے اُصول کے خلاف قدم اُٹھانے والے کو صرف ایک مُجرم کی حیثیت دیتے ہیں نہ کہ دیس نکالا کی - یہاں تک کہ اگر کوئی ہندو گائے کا گوشت کھالے تو وہ بھی صرف ایک گناہ کا مرتکب کہلائے گا نہ یہ کہ وہ ہندو مذہب سے خارج کر دیا جائے برخلاف اس کے مسلمانوں کے یہاں یہ تشدد اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ بعض اکابر دین اور علمار کرام نے اس کو بھی کافر کہدیا ہے جو مسجد میں بجائے داہنے قدم کے پہلے بایاں قدم رکھدے، دوزخ و جنت، حشر و نشر کا انکار تو خیر بڑی چیز ہے

مذاہب عالم کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ مذہب بھی ملک کی دوسری پیداواروں کی طرح ایک پیداوار ہے جو بہ لحاظ ضرورت وقت و ماحول کے تحت میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور ایک مخصوص فضا، ایک متعین معاشرت، ایک متحدہ مرکز خیال پیدا کر کے سوسائٹی کو ایک خاص رنگ میں ڈھال دیتا ہے۔ پھر جب تک بانی مذہب یا اس کے چند دن بعد تک اس کے پُرجوش ماننے والے زندہ رہتے ہیں تو وہ مخصوص معتقدات بھی قایم رہتے ہیں جن کی بیک گراؤنڈ پر اتحاد عمل کے نقوش قایم کئے گئے تھے، لیکن جب امتداد زمانہ کے ساتھ وہ جوش کم ہو جاتا ہے اور عمل سے ہٹ کر فلسفۂ عمل پر غور کرنے کی فرصت نصیب ہوتی ہے تو اُصولِ مذہب کی طرف سے بھی لوگ بے پرواہ نظر آنے لگتے ہیں یہاں تک کہ آخرکار مذہب نام ایک مخصوص تہذیب کا رہجاتا ہے۔

اس وقت اس امر سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ اچھا ہے یا بُرا لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ ایسا ہونا ضرور ہے اور اس کے خلاف اربابِ مذہب کا قدم اُٹھانا کبھی مفید نہیں ہوسکتا۔

اسوقت تک خدا جانے کتنے مذاہب دنیا میں رونما ہوئے اور بلا استثنار سب کا یہی حشر ہوا۔ ہم کو نہیں معلوم کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں مذہب کی اُصولی تعلیم کیا تھی، حضرت یوسف کیونکر نماز پڑھتے تھے، بنی اسرائیل کے موجودہ مذہبی انحطاط کا حال بھی سب پر روشن ہے اور مسیحیوں میں مذہب کے مفہوم نے جو شکل اختیار کرلی ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ اسلام کا انحطاط بہ نسبت دیگر مذاہب کے اور زیادہ جلد شروع ہوا کیونکہ یہ یکسر عملی مذہب تھا اور جس عزم و قوت کے ساتھ اس کی بنیاد ڈالی گئی تھی اس کو قایم رکھنے کے لئے مسلسل زیادہ افراد نہ ملسکے سلطنت و حکومت کی خواہش ایسی نہ تھی جو خود سر و آزاد عربوں میں ایکبار پیدا ہونے کے بعد آسانی سے دور ہوجاتی چنانچہ ان میں مختلف رقیب جماعتیں پیدا ہوگئیں اور مذہب اسلام حکومت اسلام میں تبدیل ہو کر

اختلاف رقابت کا اچھا خاصہ اکھاڑا بنکر رگیا۔ پھر جب تک سلسلہ حکمرانی کا قایم رہا تو اور کچھ نہیں کم از کم عسکری روح تو ان میں پائی جاتی تھی، لیکن جب زمانہ نے اس سے بھی محروم کر دیا تو یہ خصوصیت بھی مفقود ہو گئی اور سوائے نزاع لفظی اور زبانی "تو تو میں میں" کے کچھ باقی نہ رہا۔ سلطنت پاس وہ تھی کہ اسی پر زور آزمائی کرتے علم کی طرف توجہ باقی نہ رہی تھی کہ اسی کے مسایل پر لڑتے جھگڑتے۔ صرف ایک مذہب بیچارہ مذہب رہگیا تھا اور آخر کار اس غریب کو اس رقیبانہ کشاکش کا شکار ہونا پڑا۔ اگر کسی نے زور سے آمین کہدی تو اس کے خلاف جہاد شروع ہو گیا، کسی نے "رفع یدین" کر لیا تو اسی پر دھاوا بولدیا گیا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ خدا اور اس کے احکام رسول اور ان کے کارنامے سب بالائے طاق رکھدئے گئے اور مذہب نام رہگیا صرف اس عملش کا کہ کیونکر زیادہ آسانی کے ساتھ ایک مسلمان کو اسلام سے خارج کیا جا سکتا ہے۔

الغرض اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کا مذہبی شیرازہ بالکل منتشر ہو چکا ہے اور اس کے یکجا ہونے کی امید کرنا قانون فطرت کے خلاف ہے، کیونکہ جس طرح ہر چیز کی ایک عمر ہوا کرتی ہے، بالکل اسی طرح مذاہب عالم کی بھی ہوتی ہے۔ جو مذہب ایکبار زوال پزیر ہوا وہ کبھی نہیں ابھرا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس کی جگہ دوسرے مذہب نے لیلی۔ سو یہ تو ممکن ہے کہ اسلام کا احیاء اب کسی اور صورت سے ہو لیکن اگر مسلمان یہ توقع رکھتے ہیں کہ انکا روایتی مذہب پھر فروغ پا سکے گا، تو ان کو بالکل مایوس ہو جانا چاہئے کیونکہ یہ بالکل اقتضائے زمانہ کے خلاف ہے۔ گزشتہ تیرہ سو سال کے اندر دُنیا بالکل بدل گئی ہے اور معتقدات کی جگہ حقایق نے لیلی ہے۔ اُسوقت ہم صرف اتنا کہکر کہ "یہ حکم خدا اور رسول کا ہے" ایک شخص کو خاموش کر سکتے تھے، لیکن اب دماغ انسانی، حکم سُننے سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ خدا کیا اور اس کا رسول کیا؟ پھر جب تک آپ اس کی اس خلش کو دور نہ کر دیں اس سے انقیاد واطاعت کی توقع رکھنا بیکار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر مذہب اپنے ساتھ کچھ دلایل بھی رکھتا ہے اور مذہب اسلام تو اس کا بہت زیادہ مدعی ہے، لیکن واضح رہے کہ ان تمام دلایل کو موجودہ ذہنیت کے مقابلہ میں پیش کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے مشین گن کے جواب میں پتھر کلا بندوق لیکر سامنے آجانا کہ اسے اقدام خودکشی تو کہہ سکتے ہیں لیکن مقابلہ نہیں کہہ سکتے۔

اہل مذاہب کا بڑا معرکہ آرا جواب علوم جدیدہ کے خلاف یہ ہوا کرتا ہے کہ جس چیز کا نام "یقین یا قطعیت" ہے وہ سائنس کو اسوقت تک خود ہی حاصل نہیں ہو سکی ہے اس لئے اس پر اعتماد کرنا کیونکر ممکن ہے۔ اگر ہم اس کو تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیں تو اس سے مذاہب کی حقانیت کیونکر ثابت ہو سکتی ہے۔ سائنس نے کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ وہ کسی ایسی منزل پر پہونچ گئی ہے جس سے آگے بڑھنا محال ہے۔ سائنس کی جدوجہد کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص جنگل کاٹ کر راستہ بنائے اور آگے بڑھتا جائے۔ اسے بالکل

نہیں معلوم کہ یہ راستہ کہاں جاکر ختم ہوگا اور نہ اسے یہ معلوم کرنے کی ضرورت۔ پھر ایسے شخص پر آپ یہ الزام تو رکھ سکتے ہیں کہ وہ منزل سے ہنوز بے خبر ہے، لیکن یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ اس نے خس وخاشاک دور کرکے کوئی راستہ بنایا ہی نہیں۔

بہرحال یہ بالکل طے شدہ امر ہے کہ جس حد تک روایات اور معتقدات کا تعلق ہے مذاہب عالم کے لئے اب دنیا میں کوئی جگہ باقی نہیں ہے اس لئے اگر وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو اس کی تدبیر صرف یہ ہے کہ قومیت یا نظام معاشرت کے اصول پر کاربند ہوں۔ یعنی ایک مسلمان کو مسلمان سمجھنے کے لئے یہ ضروری نہ قرار دیا جائے کہ وہ دوزخ وجنت کا بھی قایل ہے، حشر ونشر کا بھی معترف ہے، معجزوں پر بھی ایمان لانے والا ہے اور اس حدیث کو بھی صحیح باور کرتا ہے کہ کوہ قاف ایک زمرد کا سلسلۂ کوہستان ہے جس کے چاروں طرف فرشتے زنجیریں ڈالے ہوئے بیٹھے ہیں اور جب وہ زنجیروں کو جنبش دیتے ہیں تو کرۂ زمین پر زلزلہ آجاتا ہے۔

اسلام کی ابتدائی تعلیم جو کچھ رہی ہو اس سے بحث نہیں ہے دیکھنا یہ ہے کہ اس نے کس کلچر کو پیش کیا اور اسوقت جو قوم اس کلچر کی علمبردار ہے اس کو یقیناً مسلمان کہنا پڑے گا۔ مسلمان اور ہندو میں معتقدات کے لحاظ سے جو فرق ہے وہ یکسر نظر انداز کر دینے کے قابل ہے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ ان دونوں کے ذوق ومیلان میں کیا فرق پایا جاتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جو ہمیں ایک کو ہندو اور دوسرے کو مسلمان سمجھنے پر مجبور کرے گی اور اسی کا نام اساس قومیت ہے جس پر اسوقت سیاسات عالم کی تعمیریں استوار کی جارہی ہیں اور آیندہ کیجائیں گی۔

جب تک میں اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہوں، نہ دیوبند کے کسی مولوی کو یہ حق حاصل ہے کہ مجھے کافر کہے اور نہ جمعیتہ العلمار کا صدر اس کا مجاز ہے کہ وہ مجھے غیر مسلم قرار دے۔ میں اگر ان کے معتقدات کے لحاظ سے دوزخ وجنت کا منکر ہوں تو زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ میں خدا کا گنہگار ہوں اور قیامت میں اس کا جوابدہ ہوں گا، لیکن مسلم سوسائٹی سے علیحدہ کرنا کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔

اس لئے، اسوقت ضرورت اسلام کی تعریف پر بحث کرنے کی نہیں ہے بلکہ صرف یہ جاننے کی ہے کہ ہم کس کو مسلمان سمجھیں، سو اس کے لئے نہ کسی مولوی سے پوچھنے کی ضرورت ہے نہ فقہ وحدیث کی ورق گردانی کی بلکہ صرف اس شخص سے پوچھنے کی جس کا معاملہ درپیش ہے اور اگر وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے تو اس کا یہ قول اس باب میں قطعی فیصلہ کی حیثیت رکھتا ہے جس میں مطلق چون وچرا کی گنجایش نہیں۔

علی گڈھ کی اردو کانفرنس

۲۴ اکتوبر کو علی گڈھ میں اردو کانفرنس کا انعقاد ہونے والا ہے اور جسوقت نگار شایع ہوگا، کانفرنس ختم ہوچکی ہوگی اور جو کچھ اسے طے کرنا ہے وہ طے ہوچکا ہوگا۔ افسوس ہے کہ میں اپنی علالت کی وجہ سے شریک نہیں ہوسکا اور اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ وہاں کیا ہوا

تاہم اس کا یقین ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو نے جو پروگرام مرتب کیا ہوگا وہ یقیناً مفید ہوگا اور اگر ان کو اپنی ہی ایسے چند پرجوش کام کرنے والے اور میسر آجائیں تو ترویج و اشاعت زبان کا کام زیادہ وسعت کے ساتھ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

اگر میں اس جلسہ میں شریک ہوتا تو سب سے پہلے اس امر پر زور دیتا کہ اُردو کا نام بدستور یہی قایم رکھا جائے اور اس کو "ہندوستانی" کے نام سے موسوم نہ کیا جائے۔ مولوی عبدالحق صاحب کی بعض تحریروں سے مجھے یہ سمجھنے کا موقعہ ملا ہے کہ وہ اس تسمیۂ جدید کی طرف مایل ہیں، اگر یہ صحیح ہے تو کیوں نہ سب سے پہلے "انجمن ترقی اردو" کا نام بدلکر "انجمن ترقی ہندوستانی" رکھا جائے۔ لیکن کیا وہ ایسا کریں گے ؟ مجھے اس میں کلام ہے۔

دوسرا سب سے زیادہ اہم سوال یہ تھا کہ ملک کی موجودہ سیاسی فضا کے لحاظ سے تحفظ زبان اُردو کیلئے کونسے موثر طریقے اختیار کرنے چاہئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ گفتگو وہاں معرض بحث میں آئی یا نہیں۔ اگر نہیں آئی تو بھی اس پر غور کرنے کا وقت ہاتھ سے نہیں گیا ہے۔ اگر صوبہ وار کمیٹیاں اشاعت زبان کے لئے بنائی گئی ہیں تو اُن کے پروگرام میں خصوصیت کے ساتھ اس مسئلہ کو شامل کرنا چاہئے۔ کیونکہ اسوقت تک اُردو کے لئے جو کچھ ہو رہا تھا وہ اس حیثیت سے تھا کہ ہندو و مسلمان دونوں کی توجہ اسے حاصل تھی لیکن اب کہ ہندوؤں نے یہ رشتۂ اتحاد بھی مسلمانوں سے قطع کر لیا ہے، ضرورت ہے کہ مسلمان خالص سیاسی حیثیت سے بھی اس پر غور کریں، کیونکہ گاندھی جی کا اسقدر جلد ہندوستانی کو بدلکر "ہندی ہندوستانی" کر دینا جن "اندیشہ ہائے دور و دراز" کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے وہ ایسے معمولی نہیں ہیں کہ اگر آج ان کو نظر انداز کر دیا جائے تو کل ہمیں پھر اس کی فرصت مل سکے گی۔

اس وقت کانگرس نے جو فیصلہ اس باب میں کیا ہے وہ یہ ہے کہ ملک کی زبان "ہندوستانی" کے نام سے موسوم ہوگی اور حکومت کے کاروبار میں اُردو و ہندی رسم الخط دونوں رائج ہوں گے۔ چنانچہ اس اُصول کو پیش نظر رکھکر بعض حضرات نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ ہندو و مسلمان دونوں کو دونوں زبانیں سیکھنا چاہئے۔ پھر جس حد تک زبان سیکھنے کا تعلق ہے یقیناً اس تحریک کو غیر مفید نہیں کہا جا سکتا، لیکن سوال اُس اہمیت کا ہے جو ان دونوں زبانوں میں سے کسی ایک کو لازماً آیندہ چلکر اختیار کرنا ہے۔ پھر ایسی صورت میں جبکہ مسلمان کانگرس کی شرکت سے احتراز کرتے جاتے ہیں اور وہ بالکل ہندوؤں کی سیاسی جماعت سمجھ لی گئی ہے، اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کانگرس کا طرزِ عمل آیندہ بھی یہی رہیگا۔

بہر حال ہندی اُردو نزاع کا مسئلہ اب ملک کا نہایت اہم سیاسی مسئلہ بن گیا ہے اور ضرورت ہے کہ اسی حیثیت سے اس پر غور کیا جائے۔

سید سلیمان ندوی کی فنی و تاریخی غلطیاں

حیاتِ مالک میں

(بہ سلسلۂ ماسبق)

حدیث "عالم مدینہ" آں حضرت صلعم کی ایک بہت معروف حدیث ہے جس میں مدینہ کے علمی تفوق اور اسکے مرجع انام ہونے کے متعلق پیشین گوئی پائی جاتی ہے رواۃ حدیث نے بعض الفاظ میں اختلاف کیا ہے، اور اسی لئے محدثین نے اس کے مختلف معانی بیان کئے ہیں، سید صاحب نے یہ حدیث اس طور سے نقل کردی ہے گویا اسکے مصداق صرف حضرت امام مالک ہیں حالانکہ ائمہ حدیث و فقہا کے یہاں یہ مسئلہ سخت متنازع فیہ ہے۔

پہلے تو سید صاحب نے پوری حدیث جو مختلف طریقوں سے مروی ہے لکھی نہیں اصل حدیث میں متنازع فیہ فقرے "عالم المدینۃ" اور "عالم بالمدینۃ" ہیں سید صاحب لکھتے ہیں:-

عن ابی ہریرۃ عند الترمذی و ابن حبان والطبرانی وعن ابی موسی الاشعری عند الحاکم عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوشک ان یضرب الناس اکباد الابل فلا یجدون احداً اعلم من عالم المدینۃ

(ص ۳۷)

ترمذی، ابن حبان اور طبرانی کے یہاں، ابوہریرہ سے اور حاکم کے یہاں ابوموسی اشعری سے مروی ہے وہ آنحضرت سے روایت کرتے ہیں کہ عنقریب وہ زمانہ آئیگا جب لوگ طلب علم کے لئے اونٹ ہنکائیں گے لیکن مدینہ کے عالم سے زیادہ بڑا عالم وہ کسی کو نہ پائیں گے (ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن ہے)

ابوہریرہ کی روایات میں بھی الفاظ کے اختلافات ہیں بعض میں "اکباد الابل" کی جگہ "اباط الابل" ہے بعض میں "عالماً اعلم" کی جگہ "افقہ من عالم المدینۃ" ہے لیکن قابل ذکر وہ اہم اختلاف ہے جس کی بنا پر محدثین نے معنی مختلف بیان کئے ہیں یعنی "عالم المدینۃ" اور "عالم بالمدینۃ" بخاری نے موقوفاً ابن جریج کی وساطت سے ابوہریرہ کی روایت لی ہے اس میں "عالم المدینۃ" ہے امام نسائی نے مرفوعاً روایت کی ہے اسمیں بھی عالم المدینۃ

ہے جابر بن عبداللہ کی روایت میں "عالم بالمدینہ" مذکور ہے۔

اب آیئے "عالم المدینہ" اور "عالم بالمدینہ" کے فرق و امتیاز پر غور کریں قاضی ابو عبداللہ تستری فرماتے ہیں "عالم بالمدینہ" کے معنی ہیں خاص مدینہ کے عالم اور ظاہر ہے کہ امام مالک ہی کی وہ ذات ہے کہ مدینۃ النبی میں عمر بھر سکونت کی اس سے باہر نہیں نکلے، آپ کے حلقۂ درس میں مشرق اور مغرب سے شائقین علم اور تشنگان حدیث سفر کرکے آتے، اگر "عالم المدینہ" کی روایت لی جائے، تو اس کے معنی خاص مدینہ کے نہیں بلکہ مدینہ یا اس کے علاوہ بھی مراد ہو سکتا ہے اس صورت سے "عالم مدینہ" سے امام ابن مسیب کی ذات بھی مراد لی جاسکتی ہے، چونکہ یہ اپنے زمانہ میں مرجع انام تھے، اس کے بعد شیوخ امام مالک اس کے بعد خود امام مالک اس کے بعد آپ کے تلامذہ ارشد مراد ہو سکتے ہیں یا امام زہری، عمری، امام مالک سب اپنے اپنے زمانہ میں حدیث "عالم مدینہ" کے مصداق ہیں۔

سید صاحب نے ترمذی شریف کی جو حدیث پیش کی ہے اس میں "عالم المدینہ" ہے جس سے جمہور علماء کے نزدیک امام مالک مخصوص طور پر مراد نہیں ہو سکتے، سید صاحب کو اپنے استدلال میں وہ حدیث لانی چاہئے جس میں "عالم بالمدینہ" کا فقرہ ہے۔

اغلاط و علل

اب چند سطور میں ان غلطیوں کی ایک فہرست دیجاتی ہے جو سید صاحب کی کتاب میں پائی جاتی ہیں ایسی غلطیاں کیوں سرزد ہوئیں؟ ممکن ہے قدما کی جن کتابوں سے آپ نے نقل کی ہیں ان میں خود ہی تصحیف ہو۔ مگر سوال یہ ہے کہ ایک وسیع النظر مورخ کیا قدیم کتابوں سے استفادہ کرنے میں تصحیفات کو درست نہیں کر سکتا! تو پھر ایک کاتب اور ایک عالم میں فرق کیا رہا،

قاضی ابوبکر ابن العربی (متوفی ۵۴۳ھ) کی شرح موطا کا نام سید صاحب "القبیس" بتاتے ہیں حالانکہ اس کتاب کا صحیح نام "کتاب القبس علی موطا، مالک بن انس" ہے ابن فرحون لکھتا ہے،

وقال فی کتاب القبس انہ الف کتابہ المسمی انوار الفجر فی تفسیر القرآن فی عشرین سنۃ ثمانین الف ورقۃ وتفرقت بایدی الناس ...
(الدیباج ص ۲۸۲)

اور آپ نے "کتاب القبس" میں فرمایا کہ آپ نے ایک کتاب قرآن کی تفسیر میں "انوار الفجر" کے نام سے تالیف کی یہ کتاب بیس برس میں تمام ہوئی اس میں اسی ہزار اوراق ہیں۔ تمام لوگوں میں اس کی اشاعت ہوئی۔

ابن العربی کی دوسری مشہور شرح سے غالباً سید صاحب ناواقف تھے، کیونکہ اس کا کوئی تذکرہ آپ نے نہیں کیا اس شرح کا نام ہے "کتاب المسالک فی شرح موطا مالک"۔

المقتبس کے مصنف ابو محمد عبداللہ بن محمد (متوفی ۵۲۱ھ) کو آپ "بطلیموسی" لکھتے ہیں سید صاحب کے

شاید بطلانسہ مصر کی بنا پر تسامح ہو گیا حالانکہ "بطلیوس" اندلس میں ایک مقام کا نام ہے نواب صدیق حسن خاں نے اپنی ایک نہایت موقر تصنیف "البلغہ الی اصول اللغہ" (باب الفاء) میں ثعلب کوفی نحوی (متوفی ۲۹۱ھ) کی مشہور و معتبر لغات "فصیح" کے شارحین کے سلسلہ میں ابو محمد عبداللہ السید البطلیوسی کا تذکرہ کیا ہے حاجی خلیفہ نے بھی کتب انساب کے سلسلہ میں ایک جگہ ابی محمد عبداللہ بن محمد المعروف بہ ابن السید البطلیوسی (متوفی ۵۲۱ھ) کا تذکرہ کیا ہے کشف الظنون کا یہ نسخہ جرمن ترجمہ کے ساتھ کئی جلدوں میں شایع ہوا ہے تعجب معلوم ہوتا ہے کہ ایک جرمن مستشرق تو "بطلیوس" اور "بطلیموس" کا فرق و امتیاز سمجھ جائے اور ایک مشرقی علامہ کو اس میں تسامح ہو، علامہ ابن فرحون نے بھی "الدیباج" میں ان کو "من اہل بطلیوس" لکھا ہے، اس لئے "بطلیموسی" غلط ہے صحیح "بطلیوسی" ہے۔

"الموعب" کے مصنف کا نام ابوالولید بن صفار بتاتے ہیں اس کا صحیح نام قاضی ابوالولید یونس بن محمد بن مغیث معروف بہ ابن القصار قرطبی (متوفی ۴۲۹ھ) ہے۔

سید صاحب نے موطا امام مالک کے شروح کی فہرست میں "شرح ابن ابی صفرہ" اور "القرب" محمد بن ابی زمنین کا تذکرہ کیا ہے حالانکہ یہ دونوں موطا کی مستقل شرحیں نہیں ہیں بلکہ محمد بن احمد بن اسید بن ابی صفرہ (متوفی قبل ۴۲۰ھ) نے علی بن محمد بن خلف المعروف بہ ابن القابسی (متوفی ۴۰۳ھ) کی کتاب "الملخص" کی شرح لکھی ہے، الملخص موطا کی تجرید ہے، سید صاحب نے تجرید و اسناد کی فہرست میں قابسی کی کتاب کا نام درج کیا ہے لیکن ابن ابی صفرہ کے ذیل میں یہ نہ لکھا کہ انھوں نے ملخص ابن القابسی کی شرح لکھی ہے اسی طرح ابن القابسی کے سلسلہ میں یہ اہم تاریخی واقعہ دلچسپی سے سنا جائے گا کہ یہ مالکی محدث مادر زاد نابینا تھے، اسی طرح ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ بن عیسی بن ابی زمنین (متوفی ۳۹۹ھ) کی کتاب "القرب" بھی ابن مزین کی شرح موطا کی تلخیص ہے، یحیی بن زکریا بن ابراہیم بن مزین (متوفی ۲۵۹ھ) نے موطا پر تین کتابیں لکھیں سید صاحب نے ان کی صرف ایک کتاب کا تذکرہ کیا ہے اور وہ بھی اس غلطی کے ساتھ کہ "المستقصی" کو شروح کی فہرست میں درج کر دیا حالانکہ یہ حدیث موطا کے علل کے متعلق ہے، ابن مزین کی دوسری دونوں کتابوں کے متعلق سید صاحب نے کچھ نہیں لکھا حالانکہ انمیں ایک موطا کی شرح ہے دوسری کتاب کا نام "تسمیہ" ہے جو رجال موطا کے باب میں ہے،

سید صاحب نے قاضی محمد بن سلیمان بن خلیفہ کی شرح موطا کا ذکر کیا ہے لیکن اس کا نام نہ لکھا اور نہ کیفیت کے خانہ میں اس کی قدر و قیمت بتائی، ابو عبداللہ محمد بن سلیمان بن خلیفہ (متوفی ۵۰۰ھ) کی کتاب کا نام "المحلی" ہے، اس کے متعلق ایک لطیفہ یہ ہے کہ جب ابن خلیفہ نے یہ کتاب ابوالمطرف الشعبی فقیہ کے

سامنے پیش کی انھوں نے کہا کہ "ج" کے اوپر نقطہ دیدو، یعنی اس کا نام مخلی (بے مغز) رکھو، اسی لئے ابن فرحون کی روایت کے مطابق لوگوں نے اس کتاب کو بہ نظر استحسان نہ دیکھا۔

سید صاحب نے ابو الولید سلیمان الباجی (متوفی ۴۷۴ھ) کی تین کتابوں کا یوں سلسلہ کے ساتھ تذکرہ کیا ہے منتقی، الایما، استیفار اور اس کے بعد فرماتے ہیں یہ تین شرحیں ہیں جو ایک ہی شارح کے قلم سے ہیں۔

پہلے تو بہ نظر اول یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ مصنف نے اسی سلسلہ کے ساتھ ان کی تصنیف بھی کی جس طرح سید صاحب نے لکھا ہے یا پھر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ پہلی کتاب بڑی ہے اس کے بعد دوسری کتاب کا درجہ ہے اسکے بعد تیسری کتاب کا نمبر آتا ہے یا اس کے برعکس ہے، لیکن ان صورتوں میں سے کوئی صورت صحیح نہیں مصنف نے سب سے پہلے "استیفار" لکھی، پھر "منتقی" تصنیف کی سب سے آخر میں "ایما" مرتب کی، منتقی استیفار کی تلخیص ہے اور ایما، منتقی کا خلاصہ ہے لیکن سید صاحب نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ استیفار کے متعلق ابن فرحون لکھتا ہے۔

کتاب خصیص کثیر العلم لایدرک مافیہ الا من بلغ درجتہ ابی الولید فی العلم — بڑی جامع اور عالمانہ کتاب ہے اس میں جو کچھ ہے اسکو وہی سمجھ سکتا ہے جو علم میں ابو الولید کے مرتبہ کا ہو۔ (الدیباج ص ۱۲۱)

ابو مروان بن عبد الملک بن حبیب (متوفی ۲۳۹ھ) کی شرح موطار کے متعلق سید صاحب لکھتے ہیں کہ یہ موطار کی سب سے قدیم شرح ہے حالانکہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں کہ اس سے پہلے اصبغ بن الفرج بن سعید بن نافع مولی عبد العزیز بن مروان (متوفی ۲۲۵ھ) نے تفسیر غریب الموطا لکھی اگر اس پر یہ اعتراض ہو کہ یہ موطار کی شرح نہیں بلکہ لغات موطار کی تحقیق ہے تو یہ صحیح نہیں کیونکہ قرآن مجید کی شرحیں بھی مختلف اسلوب کے ماتحت لکھی گئیں، کسی نے نحوی و صرفی نقطۂ نظر سے تفسیر لکھی مثلاً جلالین، کسی نے احادیث و آثار جمع کئے، مثلاً ابن جریر طبری، کسی نے فلسفہ و کلام کی روشنی میں مطالب بیان کئے مثلاً فخر الدین رازی کی "تفسیر کبیر" اس کو جانے دیجئے، عبد اللہ بن نافع الصایغ (متوفی ۱۸۶ھ) نے موطار کی ایک شرح لکھی ہے اس کے بعد ابو طاہر احمد بن عمر (متوفی ۲۵۰ھ) نے موطار، بہ روایت ابن وہب کی شرح لکھی یہ تینوں شرحیں ابو مروان بن عبد الملک کی شرح سے پہلے لکھی گئیں ابو مروان بن عبد الملک کی شرح موطا کا نام بھی سید صاحب نے نہیں لکھا، اس کا نام "کشف المغطی" ہے علامہ سیوطی کی بھی ایک شرح اسی نام سے پائی جاتی ہے۔

سید صاحب نے ص ۷۱ میں دو اشعار نقل کئے ہیں اور ان کے متعلق فرماتے ہیں "عمر بن سعد انصاری نے اسوقت یہ شعر کسی کو خواب میں پڑھتے سنا" حالانکہ یہ اشعار "عمر بن یحییٰ بن سعید" نے خواب میں پڑھتے سنا تھا۔

سید صاحب فرماتے ہیں "والی مدینہ عبد اللہ بن محمد ہاشمی خود پیادہ پا شریک تھا اور نعش اٹھانے والوں میں خود بھی وہ داخل تھا" (حیات مالک ص ۷۰) والی مدینہ کا نام عبد اللہ بن محمد نہیں تھا بلکہ عبد العزیز بن محمد

بن ابراہیم بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس تھا۔

شروح موطا: سید صاحب نے اپنی کتاب کے آخر میں، غریب موطا، رجال موطا، اور شروح موطا وغیرہ کی ایک فہرست دی ہے لیکن یہی نہیں کہ یہ کشف الظنون اور تزیین الممالک کی محض نقل ہے بلکہ جن شروح کا حاجی خلیفہ قاضی عیاض، اور سیوطی نے تذکرہ نہیں کیا سید صاحب کی کتاب میں بھی ان کا پتہ نہیں اور طرہ یہ کہ ان کتابوں میں جو نام کتابت کے سبب غلط درج ہیں ان کی تصحیح بھی نہیں کی گئی، اسلئے یہ کتاب نقل و ترجمہ کی سطح سے زیادہ بلند نظر نہیں آتی، ذیل میں موطا کے شروح، رجال و مسانید اور متفرقات کی ایک تاریخ وار فہرست دیجاتی ہے جس سے پتہ چلے گا کہ سید صاحب کی کتاب تحقیق و استقراء کے اعتبار سے کس قدر ناقص ہے۔

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
شرح موطا،	ابو محمد عبداللہ نافع معروف بہ ابن الصائغ۔ متوفی ۱۸۶ھ	آپ بنی مخزوم کے غلام تھے، امام مالک کے راویوں میں تھے مدینہ کے مفتی تھے، ابن غانم کا بیان ہے کہ میں نے امام مالک سے دریافت کیا کہ آپ کے بعد کون آپ کی جگہ لیگا آپ نے فرمایا ابن نافع بعض کا خیال ہے کہ آپ محدث نہ تھے لیکن یحییٰ بن معین آپ کو ثقہ بتاتے ہیں امام مالک کے بڑے بڑے پیرؤں سحنون یحییٰ بن یحییٰ مصمودی وغیرہ نے آپ سے سماع کیا۔
شرح موطا،	ابو طاہر احمد بن عمر متوفی ۲۵۰ھ	آپ کے دادا سراج اندلس کے رہنے والے تھے آپ عراق اور اس کے بعد مصر میں آئے ابن وہب اور ابن عیینہ سے روایت کرتے ہیں، ابو زرعہ، ابو داؤد سجستانی نے آپ سے روایت کی مسلم نے بھی آپ کی روایت لی ہے۔
غریب الموطاء	ابو عبداللہ اصبغ بن الفرج متوفی ۲۲۵ھ	آپ کی سکونت فسطاط میں تھی، بہت بلند پایہ محدث وفقیہ تھے الدراوردی یحییٰ بن سلام عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم وغیرہ سے روایت کرتے ہیں امام مالک سے ملنے کے لئے مدینہ کا سفر کیا لیکن قسمت نے اس دن پہونچایا جس دن امام صاحب کی وفات ہوئی، ابن قاسم، ابن وہب اور اشہب کی صحبت سے استفادہ کیا آپ سے ذہبی، بخاری، ابو حاتم رازی

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
		محمد بن اسد الخشنی، ابن وضاح وغیرہ نے روایت کی ہے، ابن مواز، ابن حبیب، ابوزید قرطبی وغیرہ نے آپ سے فقہ پڑھی، آپ نے موطا کے لغات کی شرح لکھی۔
شرح موطا	محمد بن سحنون متوفی ۲۵۶ھ	یہ مالکی مذہب کے مشہور رکن امام سحنون کے فرزند تھے، اپنے والد سے فقہ پڑھی، فن مناظرہ اور فقہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے باپ کے بعد جانشین ہوئے اپنے وقت کے امام تھے، مختلف علوم وفنون پر دو سو کتابیں لکھیں، جن میں چار جلدوں میں موطا کی شرح بھی ہے۔
شرح موطا	یحییٰ بن زکریا بن ابراہیم بن مزین۔ متوفی ۲۵۹ھ	موطا پر ان کی تین کتابیں ہیں ان میں ایک شرح ہے دوسری رجال موطا پر ہے جس کا نام "تسمیہ" ہے تیسری کتاب حدیث موطا کے علل کے متعلق ہے اسی کا نام "مستقصی" ہے جسکو سید صاحب نے غلطی سے شرح کی فہرست میں درج کر دیا ابن مزین موطا کے حافظ تھے۔
شواہد	قاضی اسمٰعیل بن اسحاق متوفی ۲۸۲ھ	حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ کے گھرانہ کی طرح عراق میں بھی بنو حماد کا ایک علمی خاندان تھا جس میں بڑے بڑے ائمہ فن محدثین، وفقہا پیدا ہوئے قاضی اسمٰعیل اسی گھرانہ کا چشم وچراغ تھا بہت سی کتابیں لکھیں ان میں چار جلدوں میں "زیادات الجامع من الموطا" ہے دوسری کتاب "شواہد" کے نام سے دس جلدوں میں موطا کی شرح ہے، یہ بڑی عظیم الشان کتاب ہے، پانسو جز کو محیط ہے مصنف نے امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے رد میں بھی کتابیں لکھی ہیں۔
مسند الموطا	ابوالقاسم عبدالرحمن ابن عبداللہ بن محمد الغافقی الجوہری متوفی ۳۸۵ھ	آپ فقہ کے ساتھ حدیث میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، مالکی مذہب کے بلند پایہ اور مخصوص علماء میں گزرے ہیں آپ نے دو مسندیں لکھیں ایک میں موطا کی حدیثیں جمع کیں دوسری

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
		میں وہ حدیثیں نقل کیں جو موطا میں نہیں ہے ۔
الدلیل	ابو محمد عبد اللہ الاصیلی متوفی سنہ ۳۹۲ھ	مصنف نے افریقہ، مکہ، مدینہ، اور بغداد وغیرہ کا سفر کیا ابو زید مروزی سے دو مرتبہ بخاری کا سماع کیا آخری عمر اندلس میں بسر کی "دلیل" میں انھوں نے امام مالک، امام شافعی، اور امام ابوحنیفہ کے اختلافات بتائے ہیں ۔
النامی	احمد بن نصر الداؤدی الاسدی متوفی سنہ ۴۰۲ھ	آپ طرابلس کے رہنے والے اور مالکی مذہب کے ائمہ میں گزرے ہیں تلمسان میں سکونت اختیار کی، فقہ، ادب اور حدیث پر عبور تھا آپ نے "النصیحۃ" کے نام سے بخاری کی شرح لکھی، "النامی" موطا کی شرح ہے آپ سے ابو عبد الملک البونی، اور ابوبکر بن محمد بن زید نے استفادہ کیا ۔
الاستنباط	ابو عبد اللہ محمد بن یحیی بن محمد بن الحذاء التمیمی متوفی سنہ ۴۱۶ھ	ابن حذاء کے خاندان والے خود کو ابن حدا، دال مہملہ سے کہا کرتے تھے، مصنف بہت بڑے فقیہ، ادیب اور محدث تھے حدیث کا شوق بڑھا تو ابن زریب، ابن بطال، ابن سلیم، انطاکی، ابن عون اللہ، اور قلعی وغیرہ اکابر شیوخ سے ملاقات کی، بلنسیہ، تکلیہ وغیرہ بلاد اندلس میں سلطان کی طرف سے قاضی مقرر ہوئے موطا پر آپ نے دو کتابیں لکھیں ایک رجال موطا پر جس سید صاحب نے اسی کا تذکرہ کیا ہے لیکن کتاب کا نام نہیں لکھا اس کا نام "التعریف" ہے۔ ابن حذا کی شرح کے متعلق سید صاحب کی کتاب میں کوئی ذکر نہیں یہ کتاب اسی جز میں تمام ہوئی ہے اس کا نام "الاستنباط لمعانی السنن والاحکام من احادیث الموطا" ہے ۔
شرح موطا	ابو المطرف عبد الرحمن بن مروان ابن عبد الرحمن القنازعی متوفی سنہ ۴۱۳ھ	آپ قرطبہ کے رہنے والے اور بہت بڑے عابد و زاہد مجاب الدعوۃ تھے، اصیلی، اور ابی عمر بن الکوہی سے فقہ پڑھی، ابو عیسی قلعی اور ابن عون اللہ سے حدیث سنی، حج کیا پھر مصر میں اقامت کی

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
		آپ کی تالیفات مشہور ہیں ان میں قرآن کی تفسیر، مولفہ ابن سلام کا اختصار ہے دوسری کتاب وثایق ابن منہدی کا اختصار، تیسری کتاب موطار کی شرح ہے - جس کو ابن فرحون "مشہور مفید حسن التالیف" کہتا ہے،
رجال موطار	احمد بن ابی عبد اللہ ابن ابی عیسی المعافری- متوفی ۴۲۹ھ	اندلس کے ایک شہر طلمنکہ کے رہنے والے تھے، قرطبہ میں سکونت اختیار کی اقلعی اور ابن عون اللہ وغیرہ سے سماع کیا قرآن کی تفسیر اور امام مالک کے فضایل میں کتابیں لکھیں رجال موطار پر بھی ایک کتاب لکھی -
مسند الموطار	عبید بن احمد بن محمد بن عبد اللہ بن عفیر متوفی ۴۳۵ھ	قاضی ابن قصار وغیرہ سے استفادہ کیا حدیث کے امام تھے بخاری، مسلم، پر ایک کتاب "مسند الصحیح" لکھی، مسانید موطا، کے نام سے بھی ایک کتاب تالیف کی-
شرح موطا	ابو عبد الملک مروان بن علی البونی- متوفی قبل ۴۴۰ھ	آپ کی اصل اندلس سے ہے افریقہ کے ایک شہر بونہ میں سکونت اختیار کی، ابو محمد الاصیلی، قاضی ابو المطرف ابی الحسن القابسی وغیرہ سے استفادہ کیا فقہ و حدیث حافظ تھے، صالحین وعباد میں سے گزرے ہیں آپ سے حاتم طرابلسی اور ابن الحذاء وغیرہ نے روایت کی آپ کی اس شرح کے متعلق ابن فرحون "مفید حسن" لکھتا ہے
الانبار	احمد بن طاہر بن عیسی بن رصیص دانی. متوفی ۵۳۲ھ	قاضی ابو الفضل عیاض کا قول ہے کہ علم حدیث ان پر غالب آگیا، بہت سے شیوخ سے ملے رجال مسلم پر ایک کتاب لکھی، اسی طرح موطار پر "الانبا" تصنیف کی اور ابو علی الصدفی کی خدمت میں پیش کی آپ نے اسکی تعریف کی اور اسکو بسیط کرنیکی فرمایش کی چنانچہ شارح نے اسپر معلومات کا اضافہ کیا
شرح مشکل	ابو عبد اللہ محمد بن خلف بن موسی الاوسی متوفی ۵۳۷ھ	آپ ادب، کلام، طب، حدیث، مختلف علوم و فنون کے ماہر تھے ایک کتاب "النکت والامالی" امام غزالی کے رد میں لکھی انکی یہ شرح اور بخاری کے مشکل مقامات کی شرح ہے -

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
کتاب المسالک فی شرح موطار مالک	ابو بکر محمد بن عبد اللہ المعروف بہ ابن العربی المعافری متوفی سنہ ۵۴۶ھ	ان کی ایک شرح اور ہے اس کا نام کتاب القبس ہے شہر اشبیلیہ کے فقیہ جلیل اور علمائے اندلس کی آخری یادگار تھے آپ کے والد ابو محمد بھی اشبیلیہ کے فقہا اور رؤسا میں گزرے ہیں عبیدیین کے عہد میں آپ کو بڑی شان و شوکت جاہ و مرتبہ حاصل تھا جب ان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو آپ اپنے صاحبزادہ ابو بکر کے ساتھ جو سترہ برس کے تھے حج کیلئے تشریف لے گئے، قاضی ابو بکر مصر میں آئے، اور ابو الحسن الخلعی ابو الحسن بن مشرف مہدی الوراق ابو الحسن داؤد الفارسی سے ملے اس کے بعد شام تشریف لے گئے۔ اور ابو نصر مقدسی، ابو سعد زنجانی، ابو حامد الغزالی، ابو سعید الرہادی ابو القاسم بن حسن قدسی، امام ابو بکر الطرطوشی وغیرہ سے ملاقات کی پھر بغداد تشریف لے گئے اور ابن الطیوری، ابو الحسن علی بن ایوب بزاز وغیرہ اکابر رجال سے ملے، پھر مکہ کا سفر کیا اور ابو علی حسین بن علی طبری وغیرہ سے نیاز حاصل کیا پھر دوبارہ بغداد گئے اور ابو بکر الشاشی، ابو حامد طوسی، ابو بکر طرطوشی علماء اور علماء کی صحبتوں میں فقہ، اصول، حدیث کی تعلیم حاصل کی، پھر بغداد سے اندلس کے ارادہ سے سفر کیا اسکندریہ میں امام طرطوشی کے یہاں ٹھہر گئے، یہیں آپ کے والد نے سنہ ۴۹۳ھ میں وفات کی، پھر آپ اندلس کی طرف لوٹ گئے، موطا، پر دو شرحیں لکھیں ترمذی شریف پر "عارضۃ الاحوذی" کے نام سے ایک کتاب تالیف کی قرآن مجید کی ایک ضخیم تفسیر مرتب کی، حدیث و تفسیر کے علاوہ فقہ و کلام پر بھی آپ کی تصنیفات پائی جاتی ہیں۔
ما وقع فی الموطار	ابو محمد عبد الحق بن عبد الرحمٰن الازدی الاشبیلی معروف بہ ابن خراط متوفی سنہ ۵۸۱ھ	آپ نے اندلس کے سیاسی ہنگاموں کے باعث بجایہ میں آکر سکونت اختیار کی اور یہیں خطیب و امام کی خدمت انجام دیتے

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
		بہت بڑے فقیہ، محدث اور رجال کے ماہر تھے، اسی کے ساتھ ادب کا بھی بہت بلند ذوق رکھتے تھے، صحیحین اور صحاح ستہ کی دوسری کتابوں پر آپ کی تالیفات ہیں لغت پر ایک جامع کتاب لکھی، جو ہروی کی "کتاب الغریبین" کے مقابلہ میں پیش کیجا سکتی ہیں آپ نے اس تصنیف میں موطا کی ان حدیثوں کو جمع کیا ہے جو بخاری اور مسلم میں نہیں ہیں یہ کتاب صحیح مسلم سے بڑی ہے اس کا پورا نام ہے "ما وقع فی الموطا مما لیس فی مسلم والبخاری"
شرح موطا	ابو المجد عقیل بن عطیہ القضاعی طرطوشی متوفی ٦٠٨ھ	آپ اندلس کے بلاد غرناطہ، وسجلماسہ کے قاضی تھے اور ابو القاسم بن بشکوال سے آپ نے روایتیں کیں ان سے حدیثیں آپ نے پڑھی، ابن بشکوال نے آپ کو اجازت دی، آپ بہت بڑے شاعر بھی تھے، مقامات حریری کی شرح بھی آپ نے لکھی ہے اس کے علاوہ حدیث پر بھی عبور تھا ابن فرحون کہتا ہے کہ میں نے اپنے شیخ ابو عبد اللہ بن مرزوق کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک شرح دیکھی جو عقیل بن عطیہ کی تصنیف تھی،
نہج المسالک للتفقہ فی مذہب مالک	ابو الحسن علی بن احمد الغسانی متوفی ٦٠٩ھ	آپ وادی آش (اندلس) کے رہنے والے اور بہت بڑے ادیب اور شاعر تھے حدیث میں نظر وسیع تھی "نہج المسالک" دس جلدوں میں موطا کی شرح ہے اسی طرح صحیح مسلم کی شرح "اقتباس السراج" کے نام سے لکھی،
شرح موطا	ابو جعفر احمد بن محمد بن علی الانصاری الجیانی متوفی ٦٢٠ھ	یہ بہت بڑے فقیہ اور نحوی تھے، ابن فرحون کہتا ہے: — "ولہ شرح حسن فی الموطا" آپ نے اسکندریہ میں وفات کی۔
الرد علی ابن حزم	قاضی القضاہ ابو اسحٰق ابراہیم بن حسن بن عبد الرفیع الربعی التونسی متوفی ٧٣٤ھ	اپنے وقت کے علامہ اور نادرۂ روزگار تھے، امام ابن حزم ظاہری نے امام مالک کی حدیثوں پر اعتراض کیا ہے جو موطا میں ہیں ابو اسحٰق ابراہیم نے اسی کے رد میں یہ کتاب تالیف کی۔

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
کشف الغطا فی شرح مختصر الموطا	عبداللہ بن محمد بن ابوالقاسم بن محمد بن فرحون الیعمری متوفی ۷۶۹ھ	ابن فرحون کے ترجمہ میں ان کا حال لکھا جا چکا حافظ ابن عبدالبر اندلسی (متوفی ۴۶۳ھ) کی مشہور کتاب "التقصی" ہے جس میں موطا کے منقطع و مرسل وغیرہ احادیث کو جمع کیا گیا ہے اسی طرح "قابسی" (متوفی ۴۰۳ھ) اور ابوسلیمان خطابی (متوفی ۳۸۸ھ) نے "ملخص" کے نام سے موطا کی تجرید مرتب کی انھیں دونوں کتابوں یعنی ابن عبدالبر کی التقصی اور خطابی یا قابسی کی ملخص کو پیش نظر رکھ کر عبداللہ الیعمری نے ایک تیسری کتاب تالیف کی جس کا نام "الدر المخلص من التقصی والمخلص" ہے پھر "کشف الغطا" کے نام سے چار جلدوں میں اسی کتاب "الدر المخلص" کی شرح لکھی،
شرح موطا	محمد بن یحییٰ بن عمر بن احمد بن یونس المصری معروف بالقرافی متوفی ۱۰۰۹ھ	آپ کا شمار اس عہد کے شیوخ میں تھا علم و اصلاح دونوں اعتبار سے ممتاز تھے، آپ نے تاجوری، الاجہوری، الزین الجیزی سے علم حاصل کیا محدثین کی ایک جماعت جمال الدین یوسف ابن الشیخ زکریا خاتم المحدثین النجم الغیطی، اور ولی صالح عبداللہ ابن الصفا وغیرہ سے حدیث روایت کی، مصر میں مالکی مذہب کے قاضی تھے، لغات، حدیث، فقہ وغیرہ پر بہت سی کتابیں لکھیں ابن فرحون کی "الدیباج" کا ذیل لکھا "قول مانوس" کے نام سے قاموس پر حاشیہ لکھا، سید محمد مرتضیٰ واسطی بلگرامی نے اپنی شرح قاموس مسمیٰ "تاج العروس" میں بعض شروح قاموس کا نام لکھا ہے ان میں نور مقدسی، سعدی آفندی، ملا علی قاری المناوی، سید عبداللہ الحسنی (شاہ مین) کے ساتھ "قرافی" کا بھی نام لیا ہے مولانا صدیق حسن خاں (نور اللہ مرقدہ) نے "البلغہ الی اصول اللغہ" میں قاموس کی ایک شرح کا تذکرہ کیا ہے اس کا نام بھی "القول المانوس" ہے یہ قاموس کے مغلق الفاظ

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
		کی شرح ہے اسکے مصنف سعدی الرومی مفتی روم ہیں اسکے علاوہ قرافی نے "اوایل ابن حاجب" پر تعلیق لکھی مختصر شیخ خلیل کی شرح لکھی بابا تنبکتی "نیل الابتہاج" میں کہتے ہیں :- "بشرح عظیم سماہ عطاء اللہ الجلیل الجامع علیہ من شرح الجمیل" آپ نے موطار کی بھی شرح لکھی ہے -
کشف المغطا عن کتاب الموطار	مولانا وحید الزماں بن مولنا مسیح الزماں مہاجر مکی	یہ کتاب اُردو میں موطار کا ترجمہ ہے، اصل متن بھی ساتھ ہے لیکن اسناد کو ترک کر دیا گیا ہے افسوس ہے اگر سند کا بھی التزام رکھا جاتا تو یہ کتاب علماء و محققین کیلئے بھی بہت کارآمد ہوتی، مولنا وحیدالزماں ایک عرصہ تک حیدرآباد میں ایک منصب جلیل پر سرفراز رہے، آپ کو "نواب وقار نواز جنگ بہادر" کا خطاب ملا تھا، آپ بہت بڑے علامہ اتقاء و پرہیز گاری کا یہ عالم تھا کہ محض مذہبیت کے جوش میں ہندوستان سے ہجرت کی اور سنہ ۱۲۹ھ میں مکہ میں اقامت اختیار کی، آپ کے برادر بزرگ مولانا بدیع الزماں بھی آپ کے ساتھ ہجرت کر کے مکہ چلے گئے علامہ دھر حضرت نواب صدیق حسن خان والی بھوپال کا زمانہ تھا، آپنے دونوں بھائیوں کے لئے ایک سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا اور ترجمہ صحاح ستہ کی خدمت تفویض کی، دونوں بھائیوں نے ملکر صحاح ستہ کا سلیس اُردو میں ترجمہ کر ڈالا، مولنا وحیدالزماں نے بخاری کا بھی ترجمہ کیا ہے اسمیں اسناد کا بھی التزام رکھا ہے اسکا اُردو مقدمہ قابل دید ہے مولنا سید سلیمان صاحب کی "حیات مالک" کی اشاعت سے تقریباً چالیس برس قبل یعنی سنہ ۱۲۹۵ھ میں مولنا وحیدالزماں صاحب کا ترجمہ مرتب ہو چکا تھا، لیکن سید صاحب نے اسکے متعلق ایک لفظ بھی نہ لکھا، غالباً اسوجہ سے کہ یہ اُردو میں ہے اور ایک ہندوستانی عالم کی کتاب ہے، جو شاہ ولی اللہ کی طرح معروف نام نہیں۔ ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ "مصفی" اور "مسوّی" کا تذکرہ تو کیا جائے لیکن "کشف المغطا" کو درخور اعتناء نہ سمجھا جائے، یہ بدگمانی تو نہیں ہو سکتی کہ سید صاحب کو اس اُردو ترجمہ کا حال معلوم نہ تھا۔ عبدالمالک آروی

میر اور نظیر کا ایک ایک ہم مضمون قطعہ

ایک تقابلی مطالعہ

(راقم حروف نے اپنی تصنیف ہماری شاعری میں اختصار کلام کی مثال میں میر و نظیر کا ایک ایک ہم مضمون قطعہ پیش کر کے میر کے قطعے کو نظیر کے قطعے سے افضل ٹھہرایا ہے اور اس افضلیت کا خاص سبب اختصار کلام کو قرار دیا ہے۔ حضرت بیخود موہانی نے اپنے مختصر رسالے جوہر آئینہ میں میری اس رائے کے خلاف بحث کی ہے۔ اس مضمون میں اسی بحث پر ایک تنقیدی نظر ڈالی جاتی ہے)

(ادیب)

اختصار کلام کی تیسری مثال میں نظیر اور میر کے مندرجہ ذیل قطعے پیش کئے گئے ہیں:۔

ایک دن اِک استخواں پر جا پڑا میرا جو پاؤں
پاؤں پڑتے ہی غرض اُس استخواں نے آہ کی
دست و پا، زانو، سر و گردن، شکم، پشت و کمر
ابرو و بینی، جبیں، نقش و نگارِ خال و خط
رات کے سونے کو کیا کیا نرم و نازک تھے پلنگ
ایک ہی جھٹکا اجل نے آن کر ایسا دیا

کیا کہوں اُسوقت میرے دل میں کیا کیا دھیان تھے
اور کہا ظالم کبھی ہم بھی تو رکھتے جان تھے
دیکھنے کو آنکھ اور سننے کی خاطر کان تھے
لعل و مروارید سے بہتر لب و دندان تھے
دن کو خاطر بیٹھنے کی تخت اور ایوان تھے
پھر نہ تو ہم تھے نہ وہ سب عیش کے سامان تھے

ایسی بیرحمی سے مت رکھ پانوں ہم پر اے نظیر
او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر

یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پر غرور تھا

اور لکھا گیا ہے :-

"دونوں شاعروں نے ایک ہی طرح کا واقعہ بیان کیا ہے اور ایک ہی اثر لیا ہے۔ مگر جو زور اور جتنا اثر میر نے دو شعروں میں بھر دیا ہے اُس کا عشر عشیر بھی نظیر کے سات شعروں میں نہ سما سکا اس کے اور اسباب بھی ہوں گے، لیکن خاص سبب یہی ہے کہ میر نے اختصار سے کام لیا اور نظیر نے بیکار طول دیا۔ نظیر بھی اگر اختصار پر نظر رکھتے تو اُن کے قطعے میں بھی اثر کا ایک عالم ہوتا۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ اگر اُن کے قطعے سے شروع کے دو شعر اور آخر کا ایک شعر لے لیا جائے اور درمیان کے چار شعر نکال دئے جائیں تو یہ قطعہ بن جاتا ہے۔

ایک دن اک استخواں پہ جا پڑا میرا جو پانوں ‏ کیا کہوں اسوقت میرے دل میں کیا کیا دھیان تھے

پانوں پڑتے ہی غرض اس استخواں نے آہ کی ‏ اور کہا ظالم کبھی ہم بھی تو رکھتے جان تھے

ایسی بے رحمی سے مت رکھ پاؤں ہم پر اے نظیر
او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے

اب اس مختصر قطعے کا اُن کے اصل قطعہ سے مقابلہ کیجئے اور دیکھئے کہ اختصار سے کلام میں اثر کیونکر پیدا ہو جاتا ہے۔"

اِن قطعوں کے متعلق معترض نے جو خامہ فرسائی کی ہے وہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ تمہیدی ہے۔ دوسرے حصے میں نظیر کے قطعے کی شرح ہے۔ تیسرے حصے میں میر اور نظیر کے قطعوں کا موازنہ ہے۔ ذیل میں ہر حصے پر علٰحدہ علٰحدہ بحث کی جاتی ہے :-

تمہید

اس حصے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اصل بحث سے بہت کم تعلق رکھتا ہے۔ مگر چونکہ معترض کا بیان مغالطوں اور غلط فہمیوں پر مبنی ہے لہذا اُس کے ایک ایک جزو پر نظر کی جاتی ہے۔

ا۔ "ہم مؤلف کتاب کی خاطر سے کچھ دیر کے لئے مانے لیتے ہیں کہ نظیر کے قطعہ میں کچھ اشعار سست ہیں۔ مگر اس سے یہ نتیجہ کون نکال سکتا ہے اور کیونکر نکال سکتا ہے کہ اس کا سبب اشعار کی زیادتی ہے"۔ (صفحہ ۲)

مصنف کی عبارت کو ذرا غور سے پڑھئے اور سمجھئے کہ یہاں اشعار کی سستی اور چستی معرضِ بحث میں نہیں ہے

ن کا باکار اور بیکار، برمحل اور بے محل ہونا۔

۲۔ " اگر ضرورت ہو تو شعرا کو یہ نصیحت ضرور کی جا سکتی ہے کہ جب طبیعت مساعدت نہ کرے تو زبردستی شعر نہ کہو اور اگر ردی میں کہہ گئے ہو تو چست اشعار انتخاب کر لو" (صـ۲۵)

اکو یہ نصیحت کرنے والا " او خویشتن گم است کرا رہبری کند" کا مصداق ہو گا۔ قطعہ ایک مسلسل نظم ہوتا ہے۔ ل کی طرح مختلف مضامین کے اشعار کا بے ربط مجموعہ نہیں ہوتا کہ اس میں سے چست اشعار چھانٹ لئے ں اور سست نکال دئے جائیں۔ قطعہ میں محض اشعار کی چستی اور سستی کا لحاظ کافی نہیں ہے۔ بلکہ مقتضائے م اور تسلسل کلام اصل چیز ہے۔ معترض نے نظیر کے قطعے میں جو اشعار بدلے اور بڑھائے ہیں ان میں بقول ض " چستی بھی ہے، بلندی بھی ہے، زور بھی ہے، شور بھی ہے" مگر ان کے متعلق خود معترض ہی نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ " یہ تمام معجزہ آرائیاں یہ تمام قدرت نمائیاں بے محل ہیں"

۳۔ " اشعار کی چستی اور خوبی کو اختصار کی معجز نمائی سمجھنا دانائی نہیں" (صـ۲۵)

جو شخص اختصار کا مفہوم ہی نہیں سمجھتا اس کا اختصار کلام کے متعلق کوئی قول قابل اعتنا نہیں۔

۴۔ " قطعے اور قصیدے پانچ پانچ سو شعر کے ہوتے ہیں مگر ان میں سے ایک شعر بھی نکال ڈالنا آسان نہیں ہوتا" (صـ۲۵)

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ قطعے اور قصیدے معمولاً پانچ پانچ سو شعر کے ہوتے ہیں یا کم از کم یہ کہ ایسے نی قطعے اور قصیدے کوئی کمیاب چیز نہیں ہیں۔ مگر کیا معترض پانچ پانچ سو شعر کے دو چار قطعے بھی پیش کر سکتا ، پھر پانچ سو شعر کیا اگر پانچ ہزار شعر کا قطعہ ہو اور اس کا کوئی شعر بیکار نہ ہو تو وہ بھی اختصار کی حد میں آجائے گا ن اگر پانچ شعر کے قطعے میں ایک شعر بھی بے ضرورت ہو تو وہ اختصار کے دائرے سے خارج ہو جائے گا۔ اور شعر کا نکال ڈالنا ضروری ٹھہرے گا۔ معترض کو کوئی کیونکر سمجھائے کہ صرف اشعار کی کمی کا نام اختصار نہیں ہے۔

۵۔ " ہم دو مختصر سے قطعے نقل کرتے ہیں اور ہے کوئی جو ان میں سے ایک شعر بھی حذف کر دینے کی قدرت رکھتا ہو" (صـ۲۵)

ی تو یہ ہے کہ پانچ پانچ سو شعر کے قطعوں میں سے ایک شعر بھی نکال ڈالنا مشکل ہوتا ہو اور ثبوت میں پیش کئے جاتے ہیں طعے، یہاں مختصر قطعے پیش کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ میں اکیلا پانچ سو آدمیوں کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ اگر ن نہ ہو تو مجھے پانچ ہی آدمیوں سے لڑوا کے دیکھ لو۔ ظاہر ہے کہ پانچ سو شعر کے قطعے میں بے ضرورت اور محل اشعار کا امکان پانچ شعر کے قطعے سے کہیں زیادہ ہے۔ بہر حال معترض نے اس کھلے چیلنج کے بعد دو ے پیش کئے ہیں۔ ایک غالب کا وہ مشہور قطعہ ہے جس کا یہ آخری شعر ہر زبان پر ہے :-

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

اس قطعے کے متعلق ہم کو کچھ کہنا نہیں ہے۔ دوسرا قطعہ ہاتف اصفہانی کا ہے جو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:۔

(۱) خار بدرودن بمژگاں خارہ بشکستن بدست — سنگ خائیدن بدنداں کوہ ببریدن بہ چنگ
(۲) لعب بادنبال عقرب بوسہ بر دندان مار — پنجہ با چنگال ثعباں غوص در کام نہنگ
(۳) از سر پستان شیر شرزہ دوشیدن حلیب — وز بن دندان مار گرزہ نوشیدن شرنگ
(۴) تیرہ غوسے روز برگردن کشیدن خیز خیز — پیر زالے در بغل شب برگرفتن تنگ تنگ
(۵) طعمہ برکردن ز چشم از کام شیر گرسنہ — صید بگرفتن بہ جبر از بر تن غضبان پلنگ
(۶) تشنہ کام و پا برہنہ در تموز و سنگلاخ — رہ بریدن بے عصا فرسنگہا با پائے لنگ
(۷) نقشہا بستن شگرف از کلک مو بر آب تند — ثقبہا کردن پدید از خار تر بر خارہ سنگ
(۸) صدرہ آساں تر بود بر من کہ در بزم لئام — بادہ نوشم سرخ سرخ و جامہ پوشم رنگ رنگ

(۹) چرخ گرد از ہستی من گر برآرد گو برآر
دور باد ا دور از دامان نامم گرد ننگ

اس قطعے میں شاعر کو کہنا یہ ہے کہ مشکل سے مشکل اور خطرناک سے خطرناک کام کر ڈالنا میرے لئے اس سے کہیں آسان ہے کہ لذیذ غذا اور نفیس لباس کے لئے کمینوں کی ہم بزمی کا ننگ برداشت کروں۔ کسی نامطبوع فعل سے بیزاری کا اظہار کرنے کے لئے مشکل کاموں کو مقابلتہً آسان قرار دینا کلام میں زور پیدا کر سکتا ہے لیکن محالات کو ممکنات کی فہرست میں داخل کر دینا بے امتیازی ہے۔ لہذا اس قطعے میں سے پہلا اور ساتواں شعر نکال ڈالنا چاہیئے۔ چوتھے شعر میں جن کاموں کا ذکر ہے وہ ناپسندیدہ ضرور ہیں مگر کچھ ایسے دشوار یا خطرناک نہیں۔ اس کے علاوہ اس شعر کا دوسرا مصرع سوقیانہ اور خلاف تہذیب ہے۔ ان وجوہ سے یہ شعر بھی قابل حذف ہے۔ چھٹے شعر میں جس کام کا ذکر ہے وہ مشکل ضرور ہے، مگر جن کاموں کا ذکر اس سے پہلے کیا جا چکا ہے اُن کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ اس کے علاوہ قطعے بھر میں یہی ایک شعر ہے جس میں صرف ایک کام کا ذکر کیا گیا ہے ورنہ چار شعروں میں دو دو کام اور دو شعروں میں چار چار کام مذکور ہیں۔ غرضکہ ہر حیثیت سے یہ شعر دوسرے اشعار کے مقابلے میں سست ہے، اور کسی طرح کا فائدہ بھی نہیں دیتا ہے۔ لہذا اس شعر کو بھی حذف کر دینا چاہیئے۔ ان چار شعروں کو خارج کر دینے کے بعد پانچ شعروں کا جو قطعہ رہ جائے گا اُس میں زور اور اثر اصل قطعے سے زیادہ ہوگا۔ ملحوظ رہے کہ شاعر کو مشکل اور خطرناک کاموں کی فہرست بنانا تو

مقصود نہیں ہے۔ بلکہ پرزور انداز میں صرف یہ کہنا ہے کہ عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے کے لئے کمینوں کی مصاحبت کرنا میرے لئے سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔

شاعر نے اس قطعے میں سترہ مشکل کاموں کی فہرست پیش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں بہت کچھ اضافہ کیا جاسکتا ہے مگر یہ فہرست جس قدر زیادہ طولانی ہوگی اُتنا ہی ذہن سامع اصل مطلب تک پہونچتے پہونچتے زیادہ تھک جائے گا اور اُتنی ہی اُس کی توجہ زیادہ منتشر ہوجائے گی۔ مشکل کاموں کی ایک فہرست سُنتے چلے جاتے ہیں مگر کوئی خبر کسی طرح نہیں نکلتی۔ اس حالت میں کچھ دیر کے بعد جی اچاٹ ہونے لگے گا اور توجہ ہٹنے لگے گی۔ اور ادھر سامع کی توجہ ہٹی اُدھر کلام کی تاثیر گھٹی۔ اگر یہ حقیقت دلنشین ہوجائے کہ کلام کے اثر کا انحصار بہت کچھ سامع کی توجہ پر ہے تو اختصار کا فایدہ بھی سمجھ میں آجائے۔

ہاتف اصفہانی نہ کوئی بلند پایہ شاعر ہے نہ اُس کا یہ قطعہ اعلیٰ درجے کی شاعری میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس قطعے کے متعلق معترض کی یہ مبارز طلبی کہ "ہے کوئی جو اس میں سے ایک شعر بھی حذف کردینے کی قدرت رکھتا ہو" ایک اور ثبوت ہے اس امر کا کہ معترض قطعے کے ہر شعر پر الگ الگ نظر ڈالتا ہے۔ وہ شاعر کے مفہوم اور مقصود کو نظر میں رکھ کر ان اشعار کو ایک 'کل' کے اجزا کی حیثیت سے نہیں دیکھتا۔ اس کے علاوہ نقادوں کی اکثریت کے خلاف معترض کے ذوق کو اظہار کے اختصار میں لذت نہیں ملتی، کلام طول میں مزہ آتا ہے مذاق کے اس فطری اختلاف کو کون دور کرسکتا ہے۔

بہرحال دو مختصر قطعوں کا کیا ذکر اگر دو سو طولانی قطعے ایسے پیش کردئے جائیں جن میں ایک شعر بھی قابل حذف نہ ہو تو اس سے نہ زیر بحث قطعوں کی حالت میں کوئی فرق آئے گا نہ یہ حقیقت بدلے گی کہ اختصار سے کلام کے اثر کو تقویت پہونچتی ہے۔ کاش معترض کی سمجھ میں آجاتا کہ جن قطعوں میں سے ایک شعر بھی حذف نہ کیا جاسکتا ہو خواہ وہ کتنے ہی طولانی ہوں اختصار کلام کی صفت سے متصف ہوں گے۔

۶۔ "اب ہم ذرا دیر کے لئے مولف علام کی خاطر سے نظیر کے قطعے میں چست اشعار بڑھائے دیتے ہیں۔ اور انھیں قافیوں کا التزام رکھتے ہیں۔ اور 'اُس استخواں' کو نکالے ڈالتے ہیں۔

قطعہ

ایک دن اک استخواں پر جا پڑا میرا جو پانوں	کیا کہوں اسوقت میرے دل میں کیا کیا دھیان تھے
پانوں پڑتے ہی غرض اُس نے بھری اک آہ سرد	اور کہا ظالم کبھی ہم بھی تو رکھتے جان تھے
بارقہ در بر جبیں تھی صاعقہ در کف نگاہ	جلوہ پر ور آنکھ تھی اور نغمہ پرور کان تھے

اہلِ دل کو طور کے جلوے دکھاتی تھی ہنسی　　لب حجاب قدس تھے حسن ازل دندان تھے
جگمگاہٹ تخت کی وہ تھی کہ شرماتا تھا مہر　　آسماں بھی جن سے شرمندہ تھے وہ ایوان تھے
ایک اک گوشہ تھا گھر کا غیرتِ باغِ ارم　　جو تصور میں نہ تیرے آئیں وہ سامان تھے

ایسی بیدردی سے ہم پر پاؤں مت رکھ اے نظیر
آج ایسے ہیں کبھی لیکن خدا کی شان سے تھے

اب اس قطعے میں چستی بھی ہے بلندی بھی ہے زور بھی ہے شور بھی ہے اور ہمارے بڑھائے
ہوئے اشعار نظیر کے ابتدائی اشعار سے زیادہ رفیع المنزلت نظر آتے ہیں۔" (صفحہ ۲۷-۲۸)

اگر معترض کے اشعار میں چستی، بلندی، زور، شور، رفعت، یہ سب خوبیاں حقیقتہً موجود ہوتیں تو بھی نظیر کے قطعے پر اس کا کیا اثر پڑتا۔ بحث تو نظیر کے قطعے سے ہے نہ کہ معترض کی اصلاح سے۔ ایسی غیر متعلق باتوں سے تضیع اوقات کے سوا کیا فایدہ ؟

۷- " ذوقِ سلیم کہتا ہے کہ یہ تمام معجزہ آرائیاں یہ تمام قدرت نمائیاں بے محل ہیں۔ اس لئے
کہ قطعہ پابند ہے اپنے آخری شعر کا۔ اور وہ شعر اس قطعے کا یہ ہے۔

ایسی بیدردی سے ہم پر پاؤں مت رکھ اے نظیر
او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے

شاعر نے آخر میں کہا تو یہ کہا کہ ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے۔۔ اس لئے ضروری ہے کہ مصرع
ایسے لگائے جائیں کہ قطعہ اس مصرع پر تمام ہو سکے۔ ہم نے سب قافئے بٹھا دئے مگر جب
آخری شعر پر پہونچے تو آخری مصرع بدلے بغیر چارہ نہ ہوا" (صفحہ ۲۶)

معترض نے اپنے پیش کئے ہوئے اشعار میں کوئی معنوی تغیر نہیں کیا ہے۔ بقول معترض نظیر نے صاحب استخواں کو "حسین و جمیل" اور "صاحب جاہ بلکہ صاحب تخت و تاج" دکھایا ہے۔ جس کے یہاں "تمام سامان عیش مہیا تھے" معترض نے بھی الفاظ بدل کر بالکل یہی باتیں بیان کردی ہیں۔ جب معترض کے بدلے ہوئے مصرعوں کی معنوی حیثیت وہی ہے جو نظیر کے اصل مصرعوں کی تھی تو قطعے کا آخری مصرع نظیر کے مصرعوں سے مطابقت اور معترض کے مصرعوں سے مبائنت کیوں رکھتا ہے۔ معترض کے اشعار میں جو چیزیں خود بینی کی آنکھوں کو "معجزہ آرائیاں" اور "قدرت نمائیاں" دکھائی دیتی ہیں اُن کی حقیقت کیا ہے ؟ چند بے لطف مبالغے، چند بے محل استعارے، اور چند شتر گربہ ترکیبیں

نظیر کے قطعے کی شرح

معترض نے نظیر کے قطعے کے ہر شعر کی شرح کی ہے اور اس کے محاسن بیان کئے ہیں۔ ہم ذیل میں ترتیب وار ایک ایک شعر کے متعلق معترض کے بیان کا ضروری حصہ نقل کر کے اپنی رائے لکھتے ہیں

(۱)

ایک دن اک استخواں پر جا پڑا میرا جو پانوں
کیا کہوں اسوقت میرے دل میں کیا کیا دھیان تھے

"اس شعر میں کہتا ہے کہ میں نے اس ہڈی پر دیدہ و دانستہ پانوں نہیں رکھا تھا بلکہ جا پڑا تھا اس کی وجہ دوسرے مصرعے میں بتاتا ہے یعنی اسوقت میرے دل میں ہزاروں خیال تھے اور میں انھیں میں محو چلا جا رہا تھا کہ یہ واقعہ پیش آیا" (صفحہ ۲۸-۲۹)

اس شعر کے دوسرے مصرعے کا جو مطلب بیان کیا گیا ہے وہ سرسری نظر میں صحیح معلوم ہوتا ہے مگر یہ نہیں اس مصرعے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ہڈی پر پاؤں پڑ جانے کا سبب نہیں بلکہ نتیجہ ہے۔ یعنی کیا کہوں کہ ہڈی پر اچانک پیر پڑتے ہی کیسے کیسے خیال دل میں آئے۔ معترض کو شاید "تھے" کے لفظ سے غلط فہمی ہوئی، یہاں "تھے" بالکل وہی معنی دیتا ہے جو ذیل کے شعر میں "تھا" کا لفظ :-

دھواں سا جب نظر آیا سواد منزل کا
نگاہ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا

یعنی یہاں اس لفظ سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہڈی پر پانوں پڑتے ہی طرح طرح کے خیالات اس سرعت سے پیدا ہوئے گویا وہ دل میں موجود ہی تھے۔ بہر حال اگر معترض کا بتایا ہوا مطلب صحیح مان لیا جائے تو بھی اصل بحث پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

(۲)

پانوں پڑتے ہی غرض اس استخواں نے آہ کی
اور کہا ظالم کبھی ہم بھی تو رکھتے جان تھے

"دوسرے شعر میں بظاہر لفظ "غرض" بھرتی کا لفظ معلوم ہوتا ہے مگر ایسا نہیں ہے "کیا کہوں اسوقت میرے دل میں کیا کیا دھیان تھے" یعنی میں اپنے خیالات سے قطع نظر کرتا ہوں اور

اور واقعہ بیان کرتا ہوں۔" (ص۲۹)

یہاں تک تو صحیح ہے۔ لیکن اسی سلسلے میں معترض کہتا ہے۔

"ابھی تک اُس ہڈی نے صرف یہ کہا ہے کہ ہم جان دار تھے۔ یہ نہیں بتایا کہ حیوانات کے کس طبقے میں سے تھے۔" (ص۲۹)

یہ قول ایک مغالطے کی تمہید ہے۔ ہڈی کو یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی کہ "ہم جاندار تھے" کیا ہڈیاں بے جانوں کے بھی ہوتی ہیں؟ اگر وہ ہڈی یہ نہ کہہ دیتی کہ ہم جاندار تھے تو کیا مخاطب اُس گاجر کی ہڈی سمجھ لیتا؟ پھر جاندار کہنے کے بعد یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ "حیوانات کے کس طبقے میں سے تھے۔" اگر یہ نہ بتایا جاتا تو کیا مخاطب اتنی بڑی ہڈی دیکھنے کے بعد بھی صاحب استخواں کو کیڑا مکوڑا بچھو، پکھیرو سمجھ لیتا؟

(۳)

دست و پا، زانو، سر و گردن، شکم، پشت و کمر
دیکھنے کو آنکھ اور سننے کی خاطر کان تھے

"تیسرے شعر میں بھی شعر اول کی شرح ہے۔" (ص۲۹-۳۰)

تیسرے شعر کو شعر دوم کی توضیح تو سمجھ سکتے ہیں، مگر شعر اول کی شرح نہیں کہہ سکتے۔ کچھ عجب نہیں کہ 'شعر ماقبل' کی جگہ 'شعر اول' لکھدیا گیا ہو۔ انتخاب الفاظ میں ایسے مسامحات معترض سے اور بھی ہوئے ہیں۔

(۴)

ابرو و بینی جبیں نقش و نگار خال و خط
لعل و مروارید سے بہتر لب و دندان تھے

ا۔ "چوتھے شعر کے پہلے مصرعے میں حقیقت کے چہرے سے نقاب سرکنے لگا اور کھل گیا کہ یہ ہڈی کسی انسان کی ہے۔" (ص۳۱)

تیسرے شعر میں اگرچہ سینگ، دم، کھر، پنجے وغیرہ کا ذکر نہیں کیا گیا تھا مگر جن اعضا کا نام لیا گیا تھا یعنی ہاتھ، پاؤں، زانو، گردن، پیٹ، پیٹھ، کمر، آنکھ، کان، وہ چونکہ جانوروں کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے مخاطب نہ سمجھ سکا کہ وہ ہڈی کسی حیوان کی ہے یا انسان کی۔ چوتھے شعر کے پہلے مصرعے میں چار چیزوں کا ذکر ہے۔ یعنی بھوں، ناک، ماتھا، خال و خط۔ ان میں سے دو چیزیں یعنی ناک اور ماتھا انسان اور حیوان میں مشترک ہیں۔ خال و خط بھی اپنے ترکیبی معنی میں انسان سے مخصوص نہیں ہے۔ اب رہیں بھویں تو اگر وہ انسان سے مخصوص ہوں تو بھی اعضا کی طولانی فہرست میں اُن کا ذکر جس سرسری انداز سے کیا گیا ہے اُس سے صاف ظاہر ہے کہ

نہ ہڈی نے بھووں کو انسان کی امتیازی علامت قرار دیا نہ ہڈی کا مخاطب بھووں کے ذکر سے اس نتیجہ پر پہونچا کہ وہ ہڈی کسی انسان کی تھی۔ جبھی تو ہڈی کو آخر میں صاف صاف کہنا پڑا کہ "او میاں ہم بھی کبھی تری طرح انسان تھے"

ب۔ "دوسرے مصرعے نے یہ بتایا کہ ہم معمولی انسان نہیں تھے بلکہ حسین وجمیل انسان تھے۔ ہمارے ہونٹ اور دانت لعل وگوہر سے بہتر تھے۔" (صفحہ ۳)

ہڈی نے اپنے تیرہ اعضا ایک ایک کرکے گنوائے ہیں۔ مگر کسی عضو میں کوئی حُسن بیان نہیں کیا ہے محض ہونٹوں کی سرخی اور دانتوں کی آبداری سے اُس کا حسین وجمیل انسان قرار پانا مشکل ہے۔ اس کے علاوہ ہڈی کا مخاطب تو سمجھانے سے بھی کوئی بات بڑی مشکل سے سمجھتا ہے۔ وہ تخیل وتصور کی صلاحیت، انتقال ذہنی کی قوت، اور اخذ واستنباط کی طاقت سے قطعًا محروم ہے۔ وہ تو ہونٹوں اور دانتوں کی خوبصورتی سے بڈھے انسان کو حسین وجمیل کسی طرح نہ سمجھ سکے گا۔

(۵)

رات کے سونے کو کیا کیا نرم ونازک تھے پلنگ
دن کو خاطر بیٹھنے کی تخت اور ایوان تھے

"جب یہ کہہ چکا کہ انسان تھے تو یہ کہا جارہا ہے کہ صرف حسین ہی نہ تھے صاحب جاہ بلکہ صاحب تاج وتخت تھے۔ ہمارے یہاں تمام سامانِ عیش مہیا تھے۔" (صفحہ ۳)

یہاں تو سخن فہمی کی انتہا ہوگئی۔ شاعر کہتا ہے کہ رات کو سونے کے لئے پلنگ تھے اور دن کو بیٹھنے کے لئے تخت۔ رات اور دن، سونے اور بیٹھنے، 'پلنگ اور تخت' کا تقابل صاف ظاہر کر رہا ہے کہ یہاں 'تخت' سے تختِ شاہی مراد نہیں ہے۔ بلکہ لکڑی کے وہ معمولی تخت جو غریبوں کے گھروں میں بھی ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بادشاہ اپنے سامان عیش وعشرت اور اسباب شان وشوکت بیان کرتا تو کیا وہ پلنگ اور تخت کا ذکر کرتا؟ یہ چیزیں تو اُس کے نوکروں کے نوکروں کو بھی میسر ہوں گی۔ سچ ہے 'فکر ہر کس بقدر ہمت اوست'۔

(۶)

ایک ہی جھٹکا اجل نے آن کر ایسا دیا
پھر نہ تو ہم تھے نہ وہ سب عیش کے سامان تھے

ا۔ "چھٹے شعر سے تباہیوں اور بربادیوں کی ابتدا وانتہا کا سراغ ملتا ہے۔" (صفحہ ۳)

کسی شعر کی شان بڑھانے یا گھٹانے کی غرض سے اُس پر کوئی حاشیہ چڑھا دینا نقاد کی شان نہیں۔ اس شعر میں نہ تباہیوں کا ذکر ہے نہ بربادیوں کا۔ نہ اُن کی ابتدا کا سراغ ملتا ہے نہ انتہا کا۔ بلکہ موت کے صرف ایک جھٹکے کا

ذکر ہے جس نے چشم زدن میں متکلم کا کام تمام کر دیا۔

ب۔ "موت کے ایک جھٹکے میں نہ ہم رہے، اور نہ وہ عیش کے سامان رہے۔" (صفحہ ۳)

موت کے ناگہانی حملے سے کسی شخص کا یکایک ختم ہو جانا تو ایک معمولی حادثہ ہے۔ لیکن اُسی حملے کے نتیجے میں عیش کے تمام سامانوں کا فنا ہو جانا خلاف قیاس ہے۔ اسباب عیش سے متوفی کا متمتع نہ ہو سکنا اور چیز ہے اور اُنکا معدوم ہو جانا اور چیز ہے۔ ایسے ہی غلط خیال یا بر خود غلط لوگوں کی تنبیہ کے لئے عرفی شیرازی نے یہ شعر کہا تھا۔

گماں مبر کہ چو تو بگذری جہاں بگذشت
ہزار شمع بکشتند و انجمن باقیست

ج۔ "یہ شعر انسان کی مجبوری اور موت کی قدرت کا ایک بے نظیر مرقع ہے۔" (صفحہ ۳۰)

ممکن ہے کہ معترض نے اس مضمون کا اس سے بہتر شعر کبھی نہ دیکھا ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمارے شاعروں نے "انسان کی مجبوری اور موت کی قدرت" کے ایسے ایسے مرقعے پیش کئے ہیں جن کے سامنے زیر نظر شعر معمولی سے بھی کم درجے کا ٹھہرتا ہے۔

د۔ "'سب' سے مراد وہ سامان جو متکلم کی نظر میں ہیں، نہ اُتنے ہی جتنے اوپر بیان کئے گئے۔" (صفحہ ۳۰)

متکلم کو عیش کے جو سامان میسر تھے اُن کا ذکر اُس نے پانچویں شعر میں کر دیا ہے۔ چھٹے شعر میں 'وہ سب عیش کے سامان' کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں لفظ 'وہ' انھیں مذکورہ سامانوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے، نہ کہ اُن سامانوں کی طرف "جو متکلم کی نظر میں ہیں"۔

(۷)

لُہ بیرحمی سے ہم پر پاؤں مت رکھ اے نظیر
او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے

"آخر شعر میں التجائے رحم ہے اور اپنی امارت، وجاہت اور حسنِ صورت سب کا ذکر کر چکنے کے بعد کہتا ہے کہ اس بیدردی، اس بیرحمی سے ہم کو پامال نہ کر۔ ارے بھائی آخر ہم بھی کبھی، تیری طرح انسان تھے۔" (صفحہ ۳۰)

اوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ اس قطعے میں متکلم کے بیان سے نہ امارت و وجاہت نکلتی ہے نہ حسنِ صورت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس شعر کے پہلے مصرعے میں التجائے رحم ضرور ہے، لیکن دوسرا مصرع ہڈی کے اُس تمام بیان کو بیکار کئے دیتا ہے جو اُس نے بقول معترض خود کو انسان کی ہڈی بتانے کے لئے پیش کیا تھا۔

ہر شعر کی شرح کرنے کے بعد معترض نے اس قطعے کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے:۔

"اس میں ایک مسلسل تماشے کی شان پائی جاتی ہے۔ اور یوں خیال کی تصویر لفظوں میں نظر آنے لگتی ہے جیسے عالم تصور میں تصویر یار بتدریج نمایاں ہوتی ہے۔ یا دریا کی پری دریا سے اُبھرتے اُبھرتے بالائے آب نظر آنے لگتی ہے۔" (صفحہ ۳۰-۳۱)

س رائے کے متعلق صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ تصویر یار کا بتدریج نمایاں ہونا اور دریا کی پری کا دریا سے اُبھرتے بھرتے بالائے آب نظر آنے لگنا ایسے تماشے ہیں جو عالم تصور میں تو شاید ہی نظر آتے ہوں، عالم بیخودی کا حال معلوم یں۔ آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے۔

"یہ قطعہ میاں نظیر کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ بلکہ خود میاں نظیر اس میں جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ وہی اُن کی اُفتاد طبع، وہی سادگی مزاج، وہی فروتنی، وہی انکسار۔ مجبوری سے صاحب تخت و ایوان سب کچھ کہا۔ مگر آخر میں یہ کہکر چپ ہو رہے "او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے۔" (ص۳۱)

س عبارت میں بڑی ہوشیاری سے کام لیا گیا ہے۔ ناظرین کو یاد ہو گا کہ نظیر کے قطعے میں لفظ 'تخت'، جو مولی چوبی تخت کے لئے آیا ہے اُس کو معترض تخت شاہی سمجھ بیٹھا تھا۔ اب اُس کو خود احساس ہوا ہے کہ یہ عہ سادگی مزاج، فروتنی، اور انکسار کا آئینہ دار ہے، اور ان چیزوں کے ساتھ تخت شاہی کا کوئی جوڑ نہیں۔ تو ی غلط فہمی کی پردہ پوشی یوں کی ہے کہ "مجبوری سے صاحب تخت، و ایوان سب کچھ کہا مگر آخر میں یہ کہہ کر چپ ہو رہے او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے"۔ مگر سخن سنجی کے سامنے سخن سازی چل نہیں سکتی۔ ذرا یہ تو ارشاد ہو کہ ے قطعے پر جو عاجزی اور مسکینی کی فضا طاری ہے اُس کے بیچ میں تختِ سلطنت اور ایوان شاہی کا ذکر نے پر شاعر کیوں مجبور ہو گیا۔ اسی سلسلے میں معترض کہتا ہے :-

"دعویٰ ویسا دلیل ایسی۔ یہاں اختصار اور طول کو اثر سے کوئی رابطہ ہے نہ بے اثری سے کوئی تعلق۔" (ص۳۱)

منف کا دعویٰ یہ تھا کہ نظیر نے اس قطعے میں بیکار طول دیکر اثر کو کم کر دیا۔ اور دلیل یہ تھی کہ اگر اس قطعے سے شروع ے دو شعر اور آخر کا ایک شعر لے لیا جائے اور درمیان کے چار شعر نکال دئے جائیں تو اس طرح تین شعر دل کا نتصر قطعہ بن جائے گا وہ اثر میں اصل قطعے سے بڑھ جائے گا۔ مختصر اور طولانی دونوں قطعے سامنے موجود تھے معترض نے ان دونوں قطعوں پر انصاف کی نظر ڈالی ہوتی تو معلوم ہو جاتا کہ اختصار نے کلام کے اثر میں کتنا ضافہ کر دیا۔ اس سے زیادہ روشن دلیل اور کیا ہو سکتی تھی؟ بہر حال جو لوگ آفتاب کو دلیل آفتاب سمجھنے سے رنا معذور ہیں اُن کو آگے چل کر یہ سمجھانے کی کوشش کی جائے گی کہ اس قطعے میں اطناب مُمل اثر انگیزی امخل ہے۔ معترض کا قول ہے کہ "یہاں اختصار اور طول کو اثر سے کوئی رابطہ ہے نہ بے اثری سے کوئی تعلق"

گزارش ہے کہ یہاں کی تخصیص بیکار ہے۔ اختصار اور طول کو اثر اور بے اثری سے جو تعلق ہے وہ معترض کی سمجھ میں کہاں آیا جو یہیں آتا۔ اختصار کلام کی تین مثالوں میں سے ایک بھی تو معترض کی سمجھ میں نہ آئی۔ مگر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ جو شخص اختصار کا مفہوم ہی نہ سمجھا ہو وہ اختصار کی مثالیں کیونکر سمجھ سکتا ہے؟۔

میر اور نظیر کے قطعوں کا موازنہ

معترض کا قول ہے کہ "ان دونوں کا تقابل لایعنی سی بات ہے"۔ مگر اُس کا عمل خود اس قول کو باطل کئے دیتا ہے۔ ذیل کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

(۱) "یہ قطعہ میاں نظیر کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ بلکہ خود میاں نظیر اس میں جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ وہی اُن کی اُفتادِ طبع، وہی سادگی مزاج، وہی فروتنی، وہی انکسار ....
اب رہا میر کا قطعہ ..... اس قطعے میں بھی خود میر نظر آتے ہیں۔ وہی جلال، وہی تنگ مزاجی، وہی بانکپن" (ص۳۱-۳۲)

(۲) "سوز و گداز نظیر کے قطعے میں جلوہ گر ہے تو ہیبت و استحقار میر کے قطعے میں" (ص۳۲)

(۳) "نظیر کے قطعے میں نرمی اور نصیحت ہے۔ میر کے قطعے میں گرمی اور نصیحت ہے" (ص۳۲)

(۴) "میر کے قطعے میں غرور سے پہونچنے والی تکلیف کا اظہار ہے اور اپنی اہانت پر غصہ۔ نظیر کے قطعے میں پامال ہونے والی تکلیف کا اظہار ہے اور بیدردی کا شکوہ رحم کی التجا ہے" (ص۳۲)

(۵) "میر کا پاؤں پڑا ہے کاسۂ سر پر۔ نظیر کا پاؤں پڑا ہے ایک ہڈی پر جو خدا جانے کس کی اور کہاں کی تھی" (ص۳۲)

(۶) "نظیر نے ابتدا ہی سے یہ کہہ دیا کہ استخواں نے آہ سرد کھینچی اور پامال کرنے والے کے اس فعل کو بیدردی اور بیرحمی سمجھا .... (میر کے) یہاں اگرچہ پاؤں کاسۂ سر پر بے ارادہ جا پڑا تھا مگر سمجھا یہ گیا کہ غرور کے سبب سے یہ ٹھکراتا ہوا چلتا ہے" (ص۳۲-۳۳)

(۷) "میر کے قطعے میں ایک بات یہ بھی ہے کہ صاحب سر کی تنگ مزاجی کا آئینہ ہے .....
نظیر کے قطعے میں ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ اُس کو اپنی موجودہ بے بسی اور بے سر و پائی کا بھی احساس ہے" (ص۳۳)

(۸) نظیر کے قطعے میں اطناب ہے اور میر کے قطعے میں ایجاز" (ص۳۳)

(۹) "نظیر نے نہایت ہی نرمی سے اپنا صاحب تاج و تخت ہونا بیان کیا ہے۔ میر نے صرف سر کو سر پر غرور بتایا ہے" (ص ۳۴)

مندرجۂ بالا اقتباسات پر نظر کیجئے اور بتائیے کہ یہ تقابل نہیں تو اور کیا ہے۔ معلوم نہیں کہ معترض تقابل کا کیا مفہوم سمجھتا ہے۔ اگر دو چیزیں ہر حیثیت سے یکساں ہوں تو اُن میں تقابل ہو ہی کیونکر سکتا ہے۔

معترض نے دونوں قطعوں کے تقابل سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ یہ ہے:-

"جس نصیحت میں ناصح کے تیور بگڑتے ہوئے ہوں وہ دل پر اثر تو کرتی ہے مگر ناصح کی طرف سے نفرت بھی پیدا کرتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بات میر کے قطعے میں ہے۔ نظیر کے قطعے میں یہ اثر ہے کہ نفرت کی جگہ انفعال پیدا ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ گداز دل بھی۔ اور اس طرح کی نصیحت کا اثر زیادہ گہرا ہوتا ہے۔" (ص ۳۴)

اِس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ معترض کی رائے میں در دو اثر، عبرت و نصیحت، کے اعتبار سے نظیر کا قطعہ میر کے قطعے سے بہتر ہے۔ اس فیصلے پر سخن فہمی حیران اور مذاق سلیم انگشت بدنداں ہے۔ لطف یہ ہے کہ پہلے میر کے قطعے کے متعلق معترض خود ہی یہ فتویٰ دے چکا ہے کہ "اس کے لاجواب ہونے میں جسے شک ہو وہ کافر ہے"۔ کیا مفتی کی ذات فتوے کے حکم سے مستثنیٰ ہوتی ہے؟

معترض نے میر اور نظیر کے قطعوں کا جو موازنہ کیا ہے وہ بیشتر صحیح ہے۔ مگر اُس موازنے سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اس موازنے کے سلسلے میں معترض نے نو باتیں کہی ہیں۔ ان میں سے آخری بات جس غلط فہمی پر مبنی ہے اُس کی توضیح اوپر کی جا چکی ہے۔ اُس کو نکال کر آٹھ باتیں رہ گئیں۔ ان میں سے پانچویں اور آٹھویں بات تو اپنی اپنی مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ بقیہ چھ باتیں ایک ہی خیال کے مختلف اجزا ہیں۔ ہم اُن سب کا ایک جگہ جمع کئے دیتے ہیں۔ اس طرح حسب ذیل صرف تین باتیں باقی رہ جاتی ہیں:-

(۱) "میر کا پاؤں پڑا ہے کاسۂ سر پر۔ نظیر کا پاؤں پڑا ہے ایک ہڈی پر جو خدا جانے کس کی اور کہاں کی تھی"

(۲) "نظیر کے قطعے میں اطناب ہے اور میر کے قطعے میں ایجاز"

(۳) "نظیر کے قطعے میں صاحب استخوان ایک سادہ طبیعت، منکسر مزاج شخص ہے، جو پامالی کی تکلیف سے ایک آہ کھینچتا ہے اور اپنی بے بسی کو محسوس کر کے پامال کرنے والے سے ایسے لہجے میں رحم کی التجا کرتا ہے، جس میں نرمی اور سوز و گداز ہے۔ میر کے قطعے میں صاحب سر ایک تنک مزاج، متکبر اور جلالت مآب انسان ہے، جو اپنی اہانت سے برافروختہ ہو کر توہین کرنے والے سے ایسے لہجے میں

خطاب کرتا ہے، جس میں گرمی، ہیبت اور استحقار ہے۔"

یہ تین مقدمات ہیں جو خود معترض کے نزدیک مسلّم ہیں۔ اب ہم ان مقدمات پر بحث کر کے دکھاتے ہیں کہ ان سے زیر بحث قطعوں کے متعلق کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

مقدمۂ اول پر بحث انسان کے تمام اعضا میں سر کو جو امتیاز اور عظمت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اس کے کچھ فطری اور نفسیاتی اسباب بھی ہیں۔ انسان کا حقیقی کمال عبارت ہے علم و حکمت ذہانت و ذکاوت وغیرہ سے۔ اور ان سب کا مسکن سر ہے۔ انسان کا ظاہری کمال منحصر ہے حسن و جمال اور رعب و جلال وغیرہ پر۔ اور ان سب کا مظہر چہرہ ہے۔ پس ظاہر ہے کہ انسان کے صوری اور معنوی کمال کی نمایندگی سر سے زیادہ کوئی اور عضو کر ہی نہیں سکتا۔ یہی سبب ہے کہ قانون ائتلاف کی رو سے سر کے تخیل کے ساتھ انسانی کمالات کا خیال آجاتا ہے۔ یہ بات کسی اور عضو جسم کو میسر نہیں۔ اس کے علاوہ انسان کے معائب و محاسن کا آئینہ اور ایک انسان کو دوسرے سے ممیز کرنے کا ذریعہ بھی چہرہ ہی ہے۔ یعنی انسان کی شخصیت اور انفرادیت کا تعین چہرے ہی سے ہوتا ہے، اور چہرہ بھی سر ہی میں شامل ہے۔ اس لئے اگر کسی جزو سے کل انسان کا تصور کیا جا سکتا ہے تو وہ سر ہی ہے۔ کبر و نخوت، اوراک و احساس کو بھی سر کے سوا کسی دوسرے عضو سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلئے تذلیل و تحقیر، بیکسی و مجبوری، کے احساس کو بیجان کاسۂ سر کی طرف نسبت دینا قانون ائتلاف کی رو سے جایز ہے مگر کسی اور ہڈی کی طرف نسبت دینا جو زندگی میں بھی اس احساس کی قوت سے محروم تھی کسی طرح جایز نہیں یہی سبب ہے کہ موت کی چیرہ دستی، انسان کی بے بسی، زندگی کی ناپائداری وغیرہ کے بیان میں کاسۂ سر سے جو کام لیا جا سکتا ہے وہ کسی اور ہڈی سے نہیں لیا جا سکتا۔ اگر بحث و دلیل سے قطع نظر کیجئے تو صرف تجربہ یا مشاہدہ بھی بتا سکتا ہے کہ چلتے چلتے اچانک ایک انسان کے کاسۂ سر پر پاؤں پڑ جانا ایسا عبرت خیز حادثہ ہے جس سے ایک بے حس آدمی کے بھی رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ تجربہ اور مشاہدہ بھی نہ سہی۔ اس حادثے کا تصور ہی اس حقیقت کی تصدیق کر سکتا ہے۔ برخلاف اس کے کسی ایسی ہڈی پر پاؤں پڑ جانا" جو نہ معلوم کس کی اور کہاں کی تھی"، ایک ایسی بات ہے جو ہر شخص کو روز پیش آیا کرتی ہے۔ مگر اس سے کوئی ذی الحس شخص بھی متاثر نہیں ہوتا مختصر یہ ہے کہ اسی ایک فرق سے کہ "میر کا پاؤں پڑا ہے کاسۂ سر پر اور نظیر کا پاؤں پڑا ہے ایک ہڈی پر جو خدا جانے کس کی اور کہاں کی تھی" ان دونوں قطعوں کے اثر میں زمین آسمان کا فرق ثابت ہو جاتا ہے۔

مقدمۂ دوم پر بحث معترض کا قول ہے کہ "نظیر کے قطعے میں اطناب ہے"۔ اور اس قول کی شرح یہ ہے:-

"نظیر کا پاؤں پڑا ہے ایک ہڈی پر جو خدا جانے کس کی اور کہاں کی تھی اس لئے اُس نے پہلے

اپنے کو جاندار بتایا، پھر انسان، پھر خوبصورت انسان، پھر صاحب جاہ و دولت، اور آخر میں کہا
کہ ان باتوں سے قطع نظر کر کے صرف اتنا ہی سمجھ لے کہ ہم تیری طرح انسان تھے۔" (ص۲۳)

معترض نے ہڈی کے متعلق یہ فقرہ اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے" جو خدا جانے کس کی اور کہاں کی تھی" تاکہ نظیر کے قطعے میں جو بے ضرورت تفصیل ہے اُس کے لئے ایک ضرورت پیدا ہو جائے۔ مگر مقدمۂ اول پر جو بحث کی گئی ہے اُس نے ثابت کر دیا کہ معترض نے یہ فقرہ لکھ کر نظیر کے قطعے کو بد سے بدتر بنا دیا ہے۔ بہرحال یہ طفلانہ تاویل کسی بالغ و عاقل کو پسند نہیں آسکتی۔ شاید معترض کو اسوقت بچوں کا پہیلیاں بجھانا یاد آ گیا۔ ایک لڑکی نے پہیلی بجھائی "یاقوت کی ڈبیا زمرد کا ڈھکنا، عقل سے بوجھنا بیہودہ نہ بکنا" جب کوئی نہ بوجھ سکا تو اُس نے پتے دینا شروع کیا۔ "کھانے میں ہے"۔۔۔ "میٹھی میٹھی"۔۔۔ "زرد زرد"۔۔۔ "چھوٹی چھوٹی"۔۔۔ "گول گول"۔۔۔ اب بھی کوئی نہ بوجھ سکا تو آخر گھبرا کر اُس نے خود ہی بتا دیا "گوندنی"۔۔۔ یہی حال اس ہڈی کا بھی ہے کہ پہلے اُس نے اپنی آواز سنائی، پھر اپنے کو جاندار بتایا، پھر ایک ایک عضو کا نام لیا، پھر پلنگ، تخت، ایوان کا ذکر کیا۔ جب پتے دیتے دیتے تھک گئی اور مخاطب کسی طرح نہ سمجھا تو آخر اُس کو اپنی بوجھ خود ہی بتانا پڑی کہ" ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے"۔

جب لفظ 'انسان' سے اُس کا پورا مدلول بلا کسی دقت کے مخاطب کے ذہن میں آجاتا ہے تو پہیلیاں بجھانے اور اتنے پتے دینے کی کیا ضرورت تھی؟ بہرحال یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہڈی نے اپنی رام کہانی کیونکر سنائی۔ جواب ظاہر ہے کہ زبان حال سے۔ یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ زبان قال اکثر متکلم کے خیالات و جذبات کا اظہار کرتی ہے اور زبان حال اپنے مخاطب کے خیالات و جذبات کی ترجمان ہوتی ہے۔ ایک معمولی ہڈی" جو خدا جانے کس کی اور کہاں کی تھی" نہ کسی کے خیالات کو متحرک کر سکتی ہے نہ جذبات کو مشتعل۔ ایسی ہڈی کی زبان حال میں گویائی کہاں۔ ہڈی کی زبانِ حال سے اگر کچھ سننا ہو تو پہلے ہی سے اُس کو ایک انسان کی ہڈی مان لینا پڑیگا اور جب یہ مان لیا تو ہڈی کا وہ سارا بیان جس میں بقول معترض اُس نے خود کو انسان کی ہڈی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے تحصیل حاصل اور طول فضول کے سوا کیا رہ جاتا ہے۔

اگر بالفرض ہڈی کے لئے خود کو انسان بتانا ضروری تھا تو بھی قطعے کا آخری مصرع " او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے"۔ بالکل کافی تھا۔ دست، پا، زانو، سر، گردن، شکم، پشت، کمر، آنکھ، کان، ابرو، بینی، جبین، خال و خط، لب، دندان، ان سب کے ذکر کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ اخلاط و عناصر، اعضا و جوارح، قوائے جسمانی و دماغی وغیرہ جن کے مجموعے کا نام 'انسان' ہے اُن میں سے صرف چند اعضا کا بے امتیازی اور بے ترتیبی سے نام لے کر شاعر نے سامع کے ذہن کو متوحش اور توجہ کو منتشر کر دینے کے سوا کیا فائدہ اُٹھایا ہے؟ عضا کی اس طولانی فہرست میں لب و دندان کو لعل و گوہر سے بہتر ضرور کہا گیا ہے۔ مگر جب تمام اعضا حسن سے معرا

ہوں تو صرف ہونٹوں کی لالی اور دانتوں کی آبداری سے ایک حسین و جمیل انسان کا تصور کیونکر ہو سکتا ہے اس توضیح سے نظیر کے قطعے کا تیسرا اور چوتھا شعر بیکار ثابت ہو گیا۔

ممکن ہے کہ اس مقام پر کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ جب ہڈی کو انسان مان لیا تو قطعے کا آخری مصرع "او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے" بھی بیکار ہو گیا۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ہڈی کے اس بیان کا مقصد مخاطب کو کوئی اطلاع دینا نہیں ہے۔ بلکہ اُس کے جذبۂ ہمدردی کو متحرک کرنا ہے۔ 'تیری طرح' کا فقرہ اس مقصد میں خاص طور پر معین ہے۔ شاعر اس تدبیر سے سامعین کو ایک موثر درس عبرت دینا چاہتا ہے۔

اب ذرا قطعے کے پانچویں اور چھٹے شعر پر نظر کیجئے۔ موت انسان کو جن محبوب ہستیوں اور مرغوب چیزوں سے جدا کر دیتی ہے اُن میں پلنگ اور تخت کی کیا اہمیت ہے۔ اور عیش و عشرت کے سامانوں میں ان چیزوں کا کیا درجہ ہے کہ اُن کا ذکر ضروری ٹھہرے یا اُن کے ذکر سے کلام کے اثر میں اضافے کی توقع کی جا سکے۔ پھر موت کا قاطع آمال اور ہادم لذات ہونا ایسی واضح اور مسلم حقیقت ہے کہ اگر اس کے بیان کے لئے کوئی خاص پر اثر اسلوب نہ ملے تو اُس کا اضمار اُس کے اظہار سے بہتر ہے۔ موت کے تصور کے ساتھ ذہن بہت سی چیزوں کی طرف خود بخود منتقل ہو جاتا ہے۔ اور جو چیزیں انتقالِ ذہنی کی بدولت خود سے سمجھ میں آجاتی ہیں اُن کے بیان میں اجمال تفصیل سے زیادہ با اثر، اور اختصار توضیح سے زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ اس تشریح سے نظیر کے قطعے کا پانچواں اور چھٹا شعر بھی بیکار ثابت ہو گیا۔ اب یہ بات آئینہ ہو گئی کہ نظیر کے قطعے میں معترض جس اطناب کا قایل ہے وہ تطویل لاطایل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اس کے برخلاف میر کے قطعے میں ایک لفظ بھی زاید نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ نظیر کے قطعے کے جو چار شعر بیکار ثابت ہو گئے ہیں اُن کے حذف کر دینے سے کوئی نقصان نہیں ہو سکتا۔ اُن کا باقی رکھنا البتہ مضر ہے۔ طولِ فضول سامع کی طبیعت کو ملول کر دیتا ہے۔ اور بیکار کی تشریح و تفصیل تحصیل حاصل اور اثر انگیزی میں مخل ہوتی ہے۔ اس قطعے میں جو طول کلام ہے وہ بیانِ واقعہ اور تحریکِ جذبات کے درمیان میں حائل ہو جاتا ہے۔ اور سامع کی توجہ کو منتشر اور دماغ کو پریشان کر کے کلام کے اثر کو بہت گھٹا دیتا ہے۔ اس سلسلے میں ہماری شاعری کے چند اقتباس نقل کئے جاتے ہیں، جو زیر بحث مسئلے پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں :-

"کسی منظر یا حالت یا واقعے کے بیان سے شاعر کا مقصد کوئی خاص اثر پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے موضوعِ بیان کے صرف وہ رُخ نمایاں کرتا ہے جن سے اُس کو وہ مخصوص اور مقصود اثر

پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے ۔ اور اُن پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتا ہے جو اثر انگیزی میں مخل ہوتے ہیں"
(ہماری شاعری ۔ تیسرا اڈیشن ۔ صـ۳۹)

"کلام میں اختصار پیدا کرنے کا سب سے بڑا گُر یہ ہے کہ مقام کی مناسبت کے لحاظ سے ایسے لفظ استعمال کئے جائیں، جو ذہن کو اپنے معنی کے علاوہ اور اور متعلق خیالوں کی طرف بھی منتقل کر سکتے ہوں ۔ ایسے لفظ اثر کے طلسمات ہوتے ہیں، اور وہ شاعری ہی کیا ہے جسے اُن کے استعمال پر قدرت نہ ہو"
(ہماری شاعری ۔ تیسرا اڈیشن صـ۹۷)

"اختصار کی ایک خاص تدبیر یہ بھی ہے کہ مناظر کی تصویر، واقعات کے بیان، اور جذبات کے اظہار میں صرف ضروری اور شاعرانہ عناصر منتخب کر لئے جاویں اور غیر ضروری اور غیر شاعرانہ عناصر حذف کر دئے جائیں ۔ ہر منظر اور ہر واقعے کے جزئیات میں بعض ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ بیان نہ کئے جائیں تو وہ منظر یا واقعہ تصور میں نہیں آ سکتا ۔ اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کے ترک کر دینے سے کوئی نقص واقع نہیں ہوتا، یا وہ دوسرے جزئیات کے ساتھ اس طرح وابستہ ہوتے ہیں کہ اُن کے بیان سے خود بخود ذہن میں آ جاتے ہیں ۔ پہلے جزئیات کو ضروری اور دوسرے کو غیر ضروری سمجھنا چاہئے ۔ اسی طرح بعض تفصیلات کوئی خاص اثر پیدا کرنے میں معین ہوتے ہیں اور بعض مخل یا کم سے کم بیکار ۔ پہلے تفصیلات کو شاعرانہ اور دوسرے کو غیر شاعرانہ کہنا چاہئے ۔

جذبات کے اظہار میں بھی یہ بات قابل لحاظ ہے کہ کسی قلبی کیفیت کا تجزیہ کر کے اُس کے ایک ایک جزو کو بیان کرنا سامع کے دل کو اُتنا متاثر نہیں کر سکتا جتنا اُس مجموعی کیفیت کو چند لفظوں میں پیش کر دینا ۔

غیر ضروری جزئیات اور غیر شاعرانہ تفصیلات کا بیان شاعر کی قوت متخیلہ کے ضعف کی دلیل ہے ۔ اور قلبی کیفیات کا تجزیہ اُس کے جذبات کی کمزوری کا ثبوت" (ہماری شاعری ۔ تیسرا اڈیشن صـ۱۰۹)

غرضکہ دوسرا مقدمہ جو معترض کے نزدیک مسلّم تھا اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ میر کا قطعہ نظیر کے قطعے سے کہیں بہتر ہے اور موثر تر ہے ۔

مقدمۂ سوم پر بحث

معترض نے ان دونوں قطعوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس کے لفظ لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان قطعوں میں اُن کے مصنفوں نے ایک ایک ایسا واقعہ بیان کر دیا ہے جو فی الحقیقت

آنکھ پیش آیا تھا یعنی معترض کے خیال میں فی الحقیقت میر کا پیر ایک کاسۂ سر پر اور نظیر کا پیر ایک ہڈی پر پڑ گیا تھا۔ اور حقیقتہً اُس کاسۂ سر نے عتاب آمیز اور ہڈی نے ترحم انگیز گفتگو کی تھی چنانچہ ان دونوں نے اپنا اپنا چشم دید واقعہ ایک ایک قطعے میں بیان کر دیا۔ معترض کی توضیح و تشریح کے مطابق زیرِ نظر قطعوں میں میر اور نظیر کی حیثیت ایک شاعر کی نہیں بلکہ ایک شاہد اور راوی کی ہے۔ مگر مذاقِ سلیم ان قطعوں کو راویانہ بیان نہیں بلکہ شاعرانہ تخئیل سمجھتا ہے۔ سخن فہمی کا فیصلہ ہے کہ نہ میر کا پاؤں پڑا کاسۂ سر پر، نہ نظیر کا پاؤں پڑا کسی ہڈی پر۔ نہ کاسۂ سر نے میر کو ڈانٹ بتائی، نہ ہڈی نے نظیر کو اپنی کتھا سنائی۔ نہ کاسۂ سر نے اپنی اہانت پر غصہ کیا نہ ہڈی نے "بیدردی کا شکوہ"۔ پھر یہ قطعے وجود میں کیونکر آئے؟ اس سوال کا اجمالی جواب یہ ہے کہ افادی اور جذباتی محرکات کی تحریک سے۔ ذیل میں اس اجمال کی کسی قدر تفصیل کی جاتی ہے۔

افادی محرکات دولت و حکومت، اعزاز و امتیاز، اعتبار و اقتدار، جمال و کمال، یہ چیزیں اکثر انسان کو غرور، خود بینی، بیدردی اور دیگر اخلاقی معائب میں مبتلا اور انسانی محاسن سے محروم کر دیتی ہیں۔ انھیں چیزوں سے انسان فرائضِ انسانیت میں تغافل اور وظائفِ عبودیت میں تساہل برتنے لگتا ہے۔ اور یہ سب صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ انسان موت کو بھول جاتا ہے۔ اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ وہ چند روز کے بعد خاک میں مل کر خاک ہو جائے گا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ یہ بھولی ہوئی حقیقت یاد دلا کر انسان کو معائب سے پاک، محاسن سے آراستہ، بدی سے نفور اور نیکی پر مائل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اسی غرض سے ہمارے شعرا زندگی کی بے اعتباری اور جاہ و ثروت وغیرہ کی ناپائداری کا بیان موثر پیرایوں میں کر کے ہم کو خوابِ غفلت سے بیدار اور نشۂ نخوت سے ہوشیار کرتے رہتے ہیں۔

جذباتی محرکات دنیا میں کیسے کیسے دولت و اختیار والے، نخوت و پندار والے، ناز و نعمت کی گود میں پلے ہوئے، عیش و عشرت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، کیسی کیسی بیکسی اور مجبوری کی موت مرتے ہیں۔ سکندر نے دنیا کو زیر و زبر کر دیا۔ اپنے فتوحات کی وسعت سے بادشاہِ ہفت اقلیم کہلایا مگر سنِ شباب اور عالمِ غربت میں داعیِ اجل کو لبیک کہنا پڑا۔ نپولین نے اپنی بہادری کی دھاک بٹھا دی۔ رعب و ہیبت کے معنی سمجھا دئے۔ مگر آخر کار ایک ویران جزیرے میں ایک بیکس اور مجبور قیدی کی حیثیت سے جان دینا پڑی۔ یہ حادثے ایسے کہ اُن کا مشاہدہ یا تصور شعرا کی تخئیل میں تحریک اور جذبات میں اشتعال پیدا کر دیتا ہے۔ اور اُن کے قلبی تاثرات لفظوں کے لباس میں شعر بن کر ظاہر ہو جاتے ہیں۔

یہی طاقتور افادی اور جذباتی محرکات ہیں جو شعرا کو آمادہ کرتے رہتے ہیں کہ وہ زندگی کی ناپائداری انسان کی بے بسی، موت کی چیرہ دستی، سامانِ عشرت کی بے وقعتی اور اسبابِ نخوت کی بے حقیقتی نئے

پُر زور اور پُر اثر انداز میں بیان کریں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

زمیں کے تلے جن کو جانا ہے اِک دن — وہ کیوں سر کو تا آسماں کھینچتے ہیں
انیس

قبر کے گوشے میں ہیں درماندہ کیا کیا مہ جبیں — خاک کے پردے میں ہیں پوشیدہ کیا کیا آفتاب
کامل

لحد میں سوئے ہیں چھوڑا ہے شہ نشینوں کو — کہاں مکاں سے اجل لے گئی مکینوں کو
انیس

پوچھوں جو سر کشوں سے کسی کی لحد ملے — اے مشت خاک کیوں تجھے اتنا غرور تھا
ثاقب

سوائے نام کے باقی اثر نشاں سے نہ تھے — زمیں سے دب گئے جھکتے جو آسماں سے نہ تھے
آتش

کاش یہ جمشید کو معلوم ہوتا جام میں — کاسۂ سر کاسۂ دست گدا ہو جائے گا
تعشق

تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر — ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر
شوق

دیکھنا کل ٹھوکریں کھاتے پھریں گے اُنکے سر — آج نخوت سے زمیں پر جو قدم رکھتے نہیں
انیس

یکے بگور عزیزان شہر سیرے کن — ببیں کہ نقش املہا چہ باطل افتاد است
نظیری

پردہ داری می کند بر طاق کسریٰ عنکبوت — بوم نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

ان تمام مثالوں میں ایک ہی درس عبرت ہے جو نئے نئے اسلوبوں سے دلنشیں کیا گیا ہے۔ ایک ہی حقیقت ہے جو نئے نئے لباسوں میں جلوہ دکھا رہی ہے۔ یہ موضوع فارسی اور اُردو شعرا میں بہت مقبول رہا ہے اور یہی مقبول عام موضوع اُنھیں افادی اور جذباتی تحریکات کے اشارے سے زیر بحث قطعوں کو وجود میں لانے کا ذمہ دار ہے۔ یہ دونوں شاعر بھی وہی درس عبرت دینا اور وہی حقیقت ذہن نشین کرنا چاہتے

ہیں۔ دونوں کی قوت متخیلہ نے ایک ہی طرح کا منظر عبرت پیش نظر کر دیا ہے۔ اور دونوں نے اُس خیالی منظر کی لفظی تصویر کھینچ دی ہے۔ لیکن جب دو مصوروں کے دل و دماغ، درجۂ کمال آلاتِ مصوری، رنگ و روغن وغیرہ میں زمین و آسمان کا فرق ہو تو اُن کی بنائی ہوئی تصویروں میں بھی وہ فرق ضرور ظاہر ہوگا۔

معترض کے اِس خیال کی تردید ہو چکی کہ زیر نظر قطعوں میں میر اور نظیر نے اپنی اپنی زندگی کا ایک ایک سچا واقعہ بیان کر دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ صاحب استخواں اور صاحب سر کی سیرت، گفتگو اور لہجے کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اُس سے ان قطعوں کے متعلق کیا نتیجہ نکلتا ہے

ہڈی اپنی داستان سنانے کے بعد یہ درخواست کرتی ہے کہ

ایسی بیرحمی سے ہم پر پاؤں مت رکھ سلے نظیر
او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے

اور کاسۂ سر بغیر اپنا تعارف کرائے ہوئے کہتا ہے:۔

..... کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا

ہڈی کے طولانی بیان میں جو کچھ کہا گیا ہے اُس سے بھی اور اُس کے علاوہ بیان کے طول لہجے کی اُفتادگی، اور درخواست کی فدویت سے بھی ایک معمولی حیثیت کے آدمی کا تصور ہوتا ہے، جس کو کبر و نخوت کے اسباب میسر ہی نہ تھے۔ کاسۂ سر نے دو مختصر جملے کہے ہیں۔ ان جملوں کا اختصار صاحب سر کی بیدماغی اور رعونت آبی کا پتا دیتا ہے۔ اُس کے حکمانہ بلکہ قہرمانی لہجے سے جاہ و جلال ٹپکتا ہے۔ اور سر پُر غرور، کا فقرہ تو معنی کی ایک دنیا ہے۔ جتنی چیزوں سے انسان میں عُجب و تکبر پیدا ہوتا ہے سب کی طرف ذہن منتقل ہو سکتا ہے۔ اب انصاف سے سوال ہے کہ ایک معمولی حیثیت کے آدمی، ایک عاجزی و مسکینی کے پتلے کی ہڈی کا خاک میں رُلنا زیادہ موثر اور عبرت آموز ہے یا ایک صاحب جاہ و جلال، مجسمۂ کبر و نخوت کے سر کا پامال ہوتے ہوتے چور چور ہو جانا۔

ہڈی کی طولانی اور بے لطف داستان ایسی ہے کہ اونگھنے والوں کو سُلا دے۔ اور کاسۂ سر کا مختصر اور پُر زور حکم ایسا ہے کہ سونے والوں کو جگا دے۔ پھر اس حکم میں بیخبر، کا ٹھوکا تو اتنا سخت ہے کہ مُردوں سے شرط باندھنے والے بھی گہری نیند سے چونک پڑیں۔

میر کا قطعہ مثال ہے ایسے اختصار کی جس میں تفصیل سے زیادہ وضاحت ہوتی ہے۔ اس قطعے کے متعلق تھوڑی سی توضیح ہماری شاعری میں بھی کر دی گئی ہے۔ کتاب کا تیسرا اڈیشن ۵۵ ملاحظہ ہو

جو مقدمات خود معترض کے نزدیک مسلّم ہیں اُنھیں سے مصنف کا یہ قول ثابت ہو گیا کہ

"دونوں شاعروں نے ایک ہی طرح کا واقعہ بیان کیا ہے اور ایک ہی اثر لیا ہے۔ مگر جو زور اور جتنا اثر میر نے دو شعروں میں بھر دیا ہے اُس کا عشر عشیر بھی نظیر کے سات شعروں میں نہ سما سکا۔ اس کے اور اسباب بھی ہوں گے۔ لیکن خاص سبب یہی ہے کہ میر نے اختصار سے کام لیا اور نظیر نے بیکار طول دیا۔"

آخر میں ناظرین کی اطلاع کے لئے لکھا جاتا ہے کہ یہ قطعہ ایک درسی کتاب سفینۂ اردو مولفہ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی سے نقل کیا گیا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مولف نے اپنی تالیف کے مقصد اور ضرورت کے لحاظ سے اسکے بعض لفظ بدل دئے ہیں اور بعض شعر حذف کر دئے ہیں۔ کچھ زمانہ ہوا کہ راقم حروف کو ایک پرانی بیاض دستیاب ہوئی جس میں یہ قطعہ حسب ذیل شکل میں درج ہے:۔

ایک دن اک استخواں اوپر پڑا میرا جو پانوں
پانوں پڑتے ہی غرض اُس استخواں نے آہ کی!

دست و پا، بازو، سر و گردن، شکم، پشت و کمر
ابرو و بینی، جبیں، نقش و نگارِ خال و خط

رات کے سونے کو کیا کیا نرم نازک تھے پلنگ
لگ رہے تھے دل کہیں چنچل پری زادوں کے ساتھ

ہو رہے تھے قہقہے اور مچ رہے تھے چہچہے
ایک ہی چکر اجل نے آن کر ایسا دیا

کیا کہوں غفلت میں کیا کیا مجھکو اُس دم دھیان تھے
اور کہا غافل! کبھی ہم بھی تو صاحب جان تھے

دیکھنے کو آنکھیں اور سننے کی خاطر کان تھے
لعل و مروارید سے بہتر لب و دندان تھے

بیٹھنے کو دن کے کیا کیا طاق اور ایوان تھے
کچھ کسی سے عہد تھے اور کچھ کہیں پیمان تھے

ساقی و ساغر، صراحی، عطر دان و پان تھے
پھر نہ ہم تھے اور نہ یہ سب عیش کے سامان تھے

ایسی بے دردی سے ہم پر پانوں مت رکھ لے نظیر
او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے

ہماری شاعری کے تیسرے اڈیشن میں نظیر کا یہ قطعہ اسی شکل میں نقل کیا گیا ہے۔

ہماری شاعری میں اختصارِ کلام کی تین مثالیں دی گئی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو معترض اپنی غلط فہمی سے بے محل سمجھا۔ اب ہم دو مثالیں اور پیش کرتے ہیں۔ امید ہے کہ ان مثالوں کو صحیح اور برمحل سمجھنے میں معترض کو کوئی دقت نہ ہوگی۔

پہلی مثال "جس کلام کی ابتدا اس دریدہ دہنی سے کیجائے وہ درشت مزاج آدمی کو آمادۂ جنگ کردیگی۔ اور نازک مزاج آدمی کو ہمیشہ کے لئے متکلم کی صورت کیسی نام سے بیزار کر دے گی۔" (جوہر آئینہ ص)

اس عبارت میں تکرار الفاظ کا عیب ہے - مذکر فاعل کے لئے مونث فعل لایا گیا ہے "ہمیشہ کے لئے" اور "صورت کیسی" کے تاکیدی فقرے بے ضرورت استعمال کئے گئے ہیں - اگر اس عبارت کو یوں بنالیں -

"جس کلام کی ابتدا اس دریدہ دہنی سے کی جائے وہ درشت مزاجوں کو آمادۂ پیکار اور نازک دماغوں کو متکلم کے نام سے بیزار کردے گا"

تو سارے عیب بھی نکل جائیں، عبارت میں اختصار بھی آجائے، اور وہ خوبیاں بھی پیدا ہو جائیں جن کو چستی روانی، توازن اور زور کہتے ہیں -

دوسری مثال ارادے کی پرستش کرتے ہیں وہ لوگ جو بار بار اپنی کوششوں میں ناکام رہتے ہیں مگر اس کام کو یہ کہ کر نہیں چھوڑ بیٹھتے کہ بھاری پتھر دیکھا چوم کر چھوڑ دیا - اور چھوڑتے کیوں نہیں اسلئے کہ بات کے دھنی اور دھن کے پکے ہوتے ہیں - (جوہر آئینہ صلالہ)

اس عبارت میں کئی عیب ہیں - سب سے بڑا عیب اس کی طوالت ہے اگر اس عبارت کو یوں بنالیں :-

ارادے کی پرستش کرتے ہیں وہ بات کے دھنی اور دھن کے پکے جو بار بار اپنی کوششوں میں ناکام ہوتے ہیں، مگر یہ نہیں کرتے کہ بھاری پتھر دیکھا چوم کر چھوڑ دیا -

تو سب عیب بھی دور ہو جائیں اور عبارت میں اختصار کے ساتھ چستی اور وضاحت بھی پیدا ہو جائے -

(پروفیسر) سید مسعود حسن ادیب رضوی (ام - اے)

بہار

شعلۂ طور

نگار کے ستمبر کے پرچے میں سید اختر علی صاحب تلہری کا ایک تنقیدی مقالہ جگر مراد آبادی کی شاعری کے متعلق شائع ہوا ہے۔ اور حضرت نیاز نے بھی فٹ نوٹ میں قابل مضمون نگار کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے مضمون کے "تشنہ و نامکمل" ہونے کی شکایت کی ہے۔ گویا جتنے اعتراضات جگر کی شاعری پر کئے گئے ہیں وہ ناکافی ہیں۔ بلکہ "نگاہ غلط بیں" ابھی لائق مضمون نگار یا محترم اڈیٹر نگار کی جنبش قلم کی منتظر ہے۔

قبل اس کے کہ اس تنقید کی نسبت کچھ کہا جائے یا کلام جگر کی تحسین پیش کیجائے یہ بتلا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُصول تنقید کیا ہے۔

کسی شاعر کے کلام کو جانچتے وقت ان باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:۔

۱۔ شاعر کا ماحول کیا ہے۔

۲۔ اس کا بلند کلام کس درجہ بلند اور پست کس درجہ پست ہے

۳۔ کلام میں کون عنصر غالب ہے۔ پستی یا بلندی۔

۴۔ شاعر نے جو زبان استعمال کی ہے وہ صنفِ متعلقہ کی مناسبت سے ہے یا نہیں

۵۔ شاعر نے ہمارے سامنے کوئی نئی چیز پیش کی ہے یا وہی کورانہ تقلید کے ماتحت پُرانی لکیر کو پیٹا ہے۔

یہ کامل یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے لائق مضمون نگار نے جگر کے کلام پر تنقید کرتے وقت ان اُصول میں سے ایک کو بھی سامنے نہیں رکھا۔ بلکہ کسی خاص "خلش" کے ماتحت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

جگر کی نثر نویسی

سب سے پہلا اعتراض جگر کی نثر نویسی پر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

"فقرے اُلجھے ہوئے، جملے بے ربط، مطلب غیر واضح" ہے۔

زمانہ جانتا ہے کہ جگر شاعر ہے، ادیب، نثار، اور انشا پرداز نہیں۔ ایسی حالت میں جگر کو بحیثیت نثار کے دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے کسی نثر نگار کو اس کے چند اشعار کی بنا پر شاعر کی حیثیت سے دیکھنا۔

جگر کے اعظم گڈھی عقیدتمند

دوسرا اعتراض جگر کے اعظم گڈھی عقیدتمندوں پر ہے۔ گویا لائق نقاد کی نگاہ میں جگر کی یہ عالمگیر شہرت ان اعظم گڈھی عقیدتمندوں کی شرمندۂ احسان ہے

یہ ایک خیالِ خام ہے - اگر یہ اعتراض مرادآبادیوں پر کیا گیا ہوتا تو شاید ایک حد تک قابلِ سماعت ہوتا کہ ممکن ہے کوئی مرادآبادی عقیدتمند "وطن پرستی" کے جوش میں ایسا کر بیٹھا ہو - میں نہیں سمجھ سکتا کہ جگر اور اعظم گڑھ کے ایک غیر مخصوص سے تعلق پر اعظم گڑھیوں کو کیونکر جگر سے اس قدر ہمدردی ہوسکتی ہے - یقیناً اس تمام عقیدتمندی کی بنیاد کسی خاص جانبداری پر نہیں بلکہ حقیقت پر ہے چونکہ اعظم گڑھ اہلِ قلم اور ارباب ذوق کا مرکز ہے اس لئے وہاں سے اُردو ادب کے کسی خدمت گزار کو داد ملجانا کوئی جائے حیرت و تعجب نہیں - ع

قبولِ خاطر و لطفِ سخن خداداد ست

جگر ایک رند مشرب انسان ہے - دین و دنیا سے بے خبر، وہ شاعر ہے اور اصلی معنوں میں شاعر ہے، وہ اپنے جذبات اور وارداتِ قلبی کو بلا تصنع و بلا تکلف نظم کر دیتا ہے - قافیہ پیمائی اور عالمانہ طرز بیان سے اُسے تعلق نہیں اسکی شاعری اُس کے ماحول کی جیتی جاگتی تصویر ہے -

جگر کی شاعری میں خالص تغزل ہی تغزل ہے - یہ ضرور ہے کہ جگر کی غزل میں تصوف کی بھی جھلک موجود ہے گر خال خال، اور حقیقتاً یہ بھی ماحول کا اثر ہے - جگر کو اصغر گونڈوی سے جو حقیقتاً ایک صوفی مشرب انسان ہیں، بہت زیادہ عقیدت و ارادت ہے - اس لئے جگر کی شاعری میں رنگِ تصوف کا پایا جانا کوئی تعجب کی بات نہیں، "جمال ہمنشیں" اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا -

تصوف کے مضامین ضرور خشک اور کھرے ہوتے ہیں - ان میں تغزل کی چاشنی مفقود ہوتی ہے - اصغر کی شاعری کو اسی چیز نے تباہ کیا - لیکن جگر کے یہاں یہ چیز اصغر کے رنگ میں نہیں بلکہ خود جگر کے مخصوص رنگ میں پائی جاتی ہے - وہ اول تو تصوف کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش ہی نہیں کرتا اور اگر کبھی "جمال ہمنشیں" کے اثر سے مجبور ہو کر وہ اس طرف آتا بھی ہے تو بھی اپنے خاص اندازِ بیان کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا - وہ مسائل تصوف کو بھی تغزل کی زبان میں ادا کرتا ہے اور دورِ حاضر کے غزلگو شعراء میں یہ اُسی کا حصہ ہے - یہی وجہ ہے کہ اس کے وہ اشعار جن میں تصوف کی جھلک ہے، پھیکے اور بے مزہ نہیں ہوتے - ذیل کے اشعار ہمارے دعوے کی دلیل ہیں - ملاحظہ ہوں :-

۱- کہاں کی دید اور کہاں کا عرفاں، حواس گم ہیں نظر پریشاں　　جو ایک پردہ اُٹھا رہے ہیں تو لاکھ پردے گرا رہے ہیں

۲- کبھی میں رہے مجھ سے مستور ہو کر　　بہت پاس نکلے بہت دور ہو کر

۳- ہر ذرہ ہے اک پیکرِ صد حُسنِ حقیقت　　ہستی کو جگر ہستی باطل نہ سمجھنا

۴- جلوۂ آفتاب کیا کہئے　　سایۂ آفتاب نے مارا

۵- کرشمہ سازیِ حسنِ ازل ارے توبہ　　مرا ہی آئینہ مجھ کو دکھا کے لوٹ لیا

۶- بہار و لالہ و گل، شوخی و برق و شرر ہو کر وہ آئے سامنے لیکن حجابِ نظر ہو کر

مضامینِ تصوف میں یہ "یک رنگی" کی بھی ایک ہی رہی۔ جب خواجہ درد جیسا صوفی شاعر اپنے تصوفانہ خیالات میں یکرنگی کو قایم نہ رکھ سکا تو جگر کے یہاں تو یہ سوال ہی بے معنی ہے۔ اور حقیقتاً یک رنگی قایم رہ بھی نہیں سکتی کیونکہ شاعر مختلف اوقات میں مختلف واقعات سے متاثر ہو کر شعر کہتا ہے، عام اس سے کہ وہ تصوف لکھے یا تغزل، تصوف لکھنے والا شاعر تصوف پر کوئی عالمانہ مقالہ تو لکھتا نہیں جو اُسے خیالات میں یگانگی و یکرنگی کا خیال رکھنا ضروری ہو۔

کلامِ جگر میں سوقیانہ اور مبتذل اشعار جگر کے جو اشعار سوقیانہ اور مبتذل قرار دیکر پیش کئے گئے ہیں اُنسے سید اختر صاحب کے "مذاقِ سلیم" کی بلندی اسی طرح ظاہر ہوتی ہے، جس طرح اثر لکھنوی نے سیماب کے ذیل کے شعر پر اعتراض کر کے اپنی بد مزاقی کا ثبوت دیا ہے ملاحظہ ہو ؎

آیا مری محفل میں غارتگرِ ہوش آیا
صد جام بکف آیا، صد شیشہ بدوش آیا

اثر صاحب فرماتے ہیں "میں نے جسوقت یہ شعر پڑھا تو ربر کی لوکیاں، اور پھکنے اور غبارے بیچنے والے کی ہیئت کذائی آنکھوں میں پھر گئی"

بس یہی حال ہمارے لایق نقاد کے مذاقِ شعری کا بھی ہے، جو اشعار تغزل کی جان ہیں انھیں سوقیانہ اور مبتذل ٹھہرایا ہے۔ اگر مبتذل اور سوقیانہ اشعار دیکھنے کا شوق ہو تو یہ دیکھئے ؎

۱- دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیشدستی ایک دن
۲- غیروں کو پان دیکے نہ پھینکو اِدھر اگال کیا فایدہ جو خون سرِ انجمن ہوا
۳- مرغِ دل کو توڑے گی بلی ترے دروازے کی رخت تن کو کترے گا چوہا تمھاری ناک کا
۴- سوتے سے اُٹھ کے رقیبوں کو بلانا کیسا منھ تو دھو رکھو بڑے سامنے ہونے والے
۵- پنیس پہ جو کوچے سے گزرتے ہیں وہ میرے کاندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

میں یہ نہیں کہتا کہ جگر کے یہاں مبتذل اشعار ہی نہیں۔ نہیں! ہیں اور ضرور ہیں، مگر خال، خال لیکن اُن اشعار پر جو لایق نقاد نے نمونۃً پیش کئے ہیں، ہرگز ابتذال کا اطلاق نہیں ہوتا۔ جب اُردو زبان کے بڑے بڑے شعراء کا کلام اس چیز سے خالی نہیں، تو بیچارے جگر ہی کی شاعری کیوں تنہا بدنام ہو۔

الفاظ و محاورات کی غلطیاں

یہ حقیقت ہے کہ جگر کی علمی استعداد کچھ زیادہ نہیں۔ اگر اُس سے زبان کی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں تو اس میں حیرت کی کونسی بات ہے۔ بڑے بڑے اساتذہ کا کلام اس قسم کی اغلاط سے خالی نہیں، ملاحظہ ہو:۔

اشارہ پاتے ہی زاہد نے توڑدی پرہیز ضمیر لالۂ لعل سے ہوا لبریز — اقبال

پرہیز مذکر ہے مونث نہیں۔ اس قسم کی اور بیشتر اغلاط اقبال کے کلام میں موجود ہیں

ایک روز کا رونا ہو تو رو کر صبر آوے
ہر روز کے رونے کو کہاں سے جگر آوے — غالب

"صبر" بروزنِ "ضبط" ہے نہ کہ بروزنِ "جگر"۔ یعنے "ر" ساکن ہے، متحرک نہیں

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

محاورے کے لحاظ سے دوسرا مصرع یوں ہونا چاہئے:۔

جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

لیکن ردیف نے غالب جیسے باکمال کا قافیہ تنگ کر دیا۔ جب ایسے بڑے بڑے اُستادِ زبان الفاظ اور محاورات کی غلطیوں کو دور نہ کر سکے۔ کہیں بندش، اور کہیں ردیف و قافیہ کی مجبوریوں سے غلط محاورات صرف کر دئے تو جیسے جگر نے اگر ردیف کی مجبوری سے تنگ آکر "ہوئے" کے بجائے "ہوئی" استعمال کیا تو کوئی حیرت و استعجاب کا مقام نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس قسم کی غلطیاں اور لغزشیں عام ہیں یا یونہی گاہے گاہے پائی جاتی ہیں کسی شاعر کے کلام میں اگر کہیں کہیں مجبوراً ایسی لغزشیں واقع ہو گئی ہوں تو اس سے ان کی تمام شاعری پر دھبہ نہیں آسکتا۔

محاسن

چونکہ نقادی میں جانب داری کو دخل نہیں ہے اور ایک نقاد کے فرائض میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ معائب کے ساتھ محاسن کو بھی منظرِ عام پر لائے اس لئے اختر صاحب نے اپنی تنقید کو جانب داری کے الزام سے بچانے کے لئے کلام جگر کے کچھ محاسن بھی دکھلائے ہیں لیکن اس انداز سے کہ جہاں سو برائیاں کی ہیں وہیں چلو دو چار خوبیاں بھی دکھلا دیں۔ جگر کے کلام کے محاسن کا اعتراف کچھ ایسی دبی زبان سے فرمایا ہے کہ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے گویا جگر کی شاعری پر بڑا بھاری احسان کر رہے ہیں۔ جو اشعار محاسن کے عنوان سے پیش کئے گئے ہیں وہ بھی کچھ ایسے اعلیٰ درجہ کے اشعار نہیں ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ نہ جاننے والے کو معلوم ہو کہ جگر کی کُل کائنات یہی ہے۔ جگر کے یہاں اُن اشعار کی کمی نہیں بلکہ بہتات ہے جو بس آپ ہی اپنی نظیر ہیں۔ اُردو غزل میں ان کا جواب ملنا مشکل ہے۔ ملاحظہ ہوں:۔

۱- چھپتے ہیں اور چھپا نہیں جاتا — اس ادائے حجاب نے مارا

۲- کوئی یہ لوٹ تو دیکھے کہ اُس نے جب چاہا — تمام ہستیِ دل کو جگا کے لوٹ لیا

۳- کرشمہ سازیِ حُسنِ ازل ارے توبہ — مرا ہی آئینہ مجھ کو دکھا کے لوٹ لیا

۴- اُن کے جاتے ہی یہ حیرت چھا گئی — جس طرف دیکھا کیا، دیکھا کیا

۵- خونِ دل، خونِ تمنا، خونِ شوق — آپ نے جو کچھ کیا اچھا کیا

۶- ہائے وہ حُسنِ تصور کا فریبِ رنگ و بو — میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا،

۷- اے کہ تری ہر اک ادا جانِ بہارِ حسن ہے — سامنے میرے آئے جا مست مجھے بنائے جا

۸- کٹے گی شبِ غم بڑی راحتوں سے — تری یاد ہوگی، ترا دھیان ہوگا

۹- اب تو یہ بھی نہیں رہا احساس — درد ہوتا ہے یا نہیں ہوتا

۱۰- وہ بھی ہوتا ہے ایک وقت کہ جب — کوئی تیرے سوا نہیں ہوتا

۱۱- شراب ریز نگہ ہائے ناز ارے توبہ — پیالہ گیر کفِ رعشہ دار کیا کہنا

۱۲- نگاہِ ناز کو تکلیفِ جنبش تا کجا آخر — مجھی پر منحصر کر دو مرا مجبور ہو جانا

۱۳- اُن آنکھوں سے نہ پوچھو ضبط جن آنکھوں نے دیکھا ہے — سحر ہونے سے پہلے شمع کا بے نور ہو جانا

۱۴- کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ — میں اپنا جام اُٹھاتا ہوں تو کتاب اُٹھا

۱۵- میرا جو حال ہو سو ہو، برقِ نظر گرائے جا — میں یونہی نالہ کش رہوں تو یونہی مسکرائے جا

یہ اشعار بیک نظر صرف "الف" کی ردیف سے چن لئے گئے ہیں۔ ورنہ تمام دیوان بے نظیر اشعار سے پُر ہے۔ سچ ہے جگر کی شاعری ہر ایک شخص کو پسند نہیں آسکتی۔ جگر کے اشعار پر صرف وہی شخص جھوم سکتا ہے جس کا دل چوٹ کھایا ہوا ہو، جس نے حُسن و عشق کی دنیا میں اپنے آپ کو کھو دیا ہو، اور جو مئے محبت سے سرشار ہو ؎

آنکھ والا ترے جوبن کا تماشا دیکھے
دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

اب ذرا دوسری طرف بھی نگاہ کیجئے۔ جناب اڈیٹر صاحب نے فٹ نوٹ میں جگر کی شاعری کو "لحن موسیقی" کا شرمندۂ احسان ٹھہرایا ہے۔ تعجب ہے کہ نیاز صاحب ایسے اُستادِ علم و فن کے قلم سے ایسا جملہ نکل گیا ہمارے خیال میں سخن شناس اور اربابِ ذوق کی اس زمانہ میں کمی نہیں ان کی نظر اشعار کا صرف سطحی مطالعہ

نہیں کرتی بلکہ کلام کے عمق تک پہونچ جاتی ہے۔ لحن و موسیقی کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ بلکہ جلد مٹ جانے والا ہوتا ہے۔ جگر کا کلام اگر محض لحن و موسیقی تک محدود ہوتا تو اس کو یہ عالمگیر شہرت کبھی نصیب نہ ہوتی۔ حسرت موہانی اور اصغر کو دیکھئے کہ قبول سخن مشاعرے میں پڑھنا بھی نہیں جانتے لیکن اس کمی سے اُن کے کلام پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔ ان کا شمار اساتذہ میں ہے اور اسی طرح رہیگا۔ برخلاف اس کے ساغر نظامی اور حفیظ جالندھری لیجئے کہ گانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ قریب قریب ہر بڑے مشاعرے میں طرح پر غزلیں لکھکر نہایت ترنم اور خوش الحانی سے پڑھتے ہیں۔ لیکن بحیثیت غزل گو کے ان کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ ہمارے خیال میں لحن و موسیقی کو "قبولِ خاطر" اور "لطفِ سخن" سے کوئی تعلق نہیں۔

نیاز صاحب نے دوسری چوٹ سید سلیمان ندوی پر حریفانہ انداز میں کی ہے۔ آپ لکھتے ہیں:-

"سید صاحب نے "شعلۂ طور" کے متعلق جو اظہارِ خیال کیا ہے اُس سے مقصود یہ نہ تھا کہ جگر کے حسن کلام پر مہر توثیق ثبت کی جائے۔ بلکہ مدعا یہ تھا کہ جگر ایسے مشہور شاعر کے کلام کی تعریف کرکے اپنے آپ کو "سخن سنج" ظاہر کیا جائے.........."

اس کے جواب میں ہم صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ آفتاب کو دُنیا آفتاب کی حیثیت سے جانتی ہے نہ اس حیثیت سے کہ وہ چاند کو بھی روشنی پہونچاتا ہے۔

ایم۔اے۔ وصفی۔ بی۔اے (مرادآبادی)

(نگار) جگر کی شاعری پر سید علی اختر صاحب تلہری کا ایک ناکمل مضمون شائع کرنے کی جو غلطی مجھ سے ہوئی تھی اس کی پاداش مجھے ملنی چاہئے تھی، چنانچہ ملی اور اس سے زیادہ ملی جس کا میں مستوجب تھا۔ یعنی ایک ناقص مقالہ کے جواب میں ناقص تر مقالہ مجھے شائع کرنا پڑا جو "الانف بالانف والسن بالسن" کی شرعی حدود سے بھی کچھ بڑھی ہوئی تعزیر ہے۔ جناب وصفی کے اس مقالہ کے وصف میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔

وہ شخص جو رنگ تغزل کی تمیز میں اصغر اور حسرت کا نام ساتھ ساتھ لے، جو ایک ہی چیز (یعنی تصوف) کو اصغر کے لئے تباہ کن اور جگر کے لئے "جانِ ہمنشیں" قرار دے، جو حفیظ کے متعلق یہ لکھے کہ بحیثیت غزلگو شاعر کے انھیں کوئی نہیں جانتا اور جو غضب خدا کا استحضار کلام اساتذہ کے ثبوت میں

ہر رونے کے رونے کو کہاں سے جگر آوے

غالب سے منسوب کرے۔ ظاہر ہے کہ اپنے ماہر نقاد اور ایسے بلند پایہ سخن سنج کی حضور میں سوائے اسکے

اور کیا کہا جا سکتا ہے

تو ہر گناہ کہ خواہی بکن کہ معذوری

سید سلیمان ندوی کے تعارف کے متعلق میں نے لکھا تھا کہ "سید صاحب نے شعلۂ طور پر جو کچھ لکھا ہے اس سے مقصود زیادہ تر یہ تھا کہ اپنے سخن سنج ہونے کا ثبوت دیا جائے نہ یہ کہ جگر کے حسن کلام پر مہر توثیق ثبت کی جائے" اس کا جواب صفی صاحب نے یہ دیا ہے کہ "آفتاب کو دنیا آفتاب کی حیثیت سے جانتی ہے نہ اس حیثیت سے کہ ... پہنچا ... ہے۔"

یہ نہ صرف میرے بلکہ غالبًا خود سید سلیمان صاحب کے لئے بھی بالکل جدید انکشاف ہوگا کہ وہ دنیائے شعر و سخن میں بھی آفتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر یہاں تک تو خیر کوئی حرج نہیں لیکن اگر کل کسی موسیقی کی کتاب پر سید صاحب کا تعارف دیکھ کر صفی صاحب نے اسی حسن استدلال کی بنا پر انھیں آفتاب موسیقی کا خطاب دیدیا تو البتہ مشکل پیش آئے گی کیونکہ جگر تو خیر یہ گوارا کر لیں گے کہ آپ انھیں بزم سخن کا چاند بنا دیں اور سید صاحب کو "آفتاب سخن" لیکن "فیاض خاں" گویا شاید اسے برداشت نہ کر سکیگا اور وہ تنبورہ لیکر ضرور اعظم گڈھ پہونچ جائے گا، پھر اسوقت جو مولانا کے دل پر گزرے گی اُسے نہ صفی صاحب سمجھ سکتے ہیں نہ کوئی اور۔ واقعی کسی نے خوب کہا ہے کہ "اے خدا مجھے میرے دوستوں سے بچا"

جگر کے شاعر اور اچھے شاعر ہونے میں شک نہیں لیکن ان کے کلام پر اظہار رائے کے لئے سید سلیمان ایسے مولانا کی ضرورت ہے جو غریب کوچۂ عشق کی راہوں سے ناواقف ہونے کی بنا پر جگر کو "عشق حقیقی کا جویا" سمجھ بیٹھے اور نہ کسی ایسے سخت گیر نقاد کی جو "شعلۂ طور" کو "وادی ایمن" کی چیز سمجھ کر اسے ہر نقص سے پاک دیکھنا چاہے

بہرحال اب اس سلسلہ میں کوئی ناقص و نامکمل مضمون شائع نہ کروں گا اور اگر کوئی صاحب لکھنا چاہتے ہیں تو واقعی صحیح معنی میں حق انتقاد ادا کریں ورنہ اسوقت کا انتظار کریں جب میں خود اس موضوع پر قلم اُٹھاؤں۔

سوئٹزرلینڈ کا وفاقی نظام حکومت

آئین وفاق کے اہم عناصر

۴- شعبۂ انصاف وعدالت اس سے پیشتر ہم نے آئین وفاق کے دوسرے عنصر فیڈرل کونسل پر روشنی ڈالی تھی۔ اب ہم فیڈرل ٹریبونل (بندیز گریش) کو لیتے ہیں جو سوئٹزرلینڈ کی وفاقی حکومت کا تیسرا ستون ہے اور جسے فیڈرل جوڈیشری (Federal Judiciary) بھی کہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سوئٹزرلینڈ کا صیغۂ انصاف دیگر جمہوری ممالک (مثلاً امریکہ اور آسٹریلیا) کی بہ نسبت نظام وفاق کی مشینری میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ باعتبار ترتیب اس کی ساخت بہت ہی سادہ ہے گو نظام عمل کے اعتبار سے ہم اسے پیچیدہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ صیغہ صرف ایک ٹریبونل پر مشتمل ہے جس میں چودہ جج ہوتے ہیں۔ چودہ ججوں کی ایک عدالت جتنی سے جسے فیڈرل کورٹ کہنا مناسب ہوگا۔ سوئٹزرلینڈ کی آئینی اصطلاح میں اس کا نام بندیز گریش ہے اس کورٹ کے ججوں کا انتخاب اسمبلی کے دونوں ایوانوں کے مشترک اجلاس کی رائے سے عمل میں آتا ہے۔ آج کل ججوں کی تعداد چودہ سے بڑھاکر بیس کر دی گئی ہے کیونکہ بندیز گریش کا کام اب نسبتاً بہت زیادہ ہوگیا ہے۔

ججوں کی مدت ملازمت چھ برس ہوتی ہے مگر ان میں جو افراد قابلیت کے ساتھ اپنے فرایض سے عہدہ برآ ہوتے ہیں انہیں دوبارہ سہ بارہ منتخب کیا جا سکتا ہے۔ بعض جج جو اپنے فہم و فراست کا لوہا منوا دیتے ہیں بار بار منتخب ہوکر ساری عمر عہدۂ ججی پر فائز رہتے ہیں۔ قانوناً ہر وہ شخص جج بن سکتا ہے جو اسمبلی کی رکنیت کا اہل ہو۔ مگر بالعموم وہی لوگ انتخاب میں آتے ہیں جن کے متعلق جمہور کا یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ مسلمہ قانونی قابلیت اور تجربہ رکھتے ہیں۔

ججوں کے انتخاب میں اسمبلی اس بات کا بھی لحاظ رکھتی ہے کہ تینوں سرکاری زبانوں یعنے جرمن، فرانسیسی اور اطالوی کی نمایندگی ہو۔ فیڈرل کورٹ کے صدر اور نائب صدر کو اسمبلی دو برس کے لئے نامزد کرتی ہے۔ مگر ملکی دستور کی رو سے کورٹ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اپنا سکریٹریٹ خود ترتیب دے اور خود ہی اپنے افسران بھی مقرر کرے۔

فیڈرل کورٹ کے جج فیڈرل اسمبلی کے کسی ایوان میں شرکت کرنے کے مجاز نہیں ہیں اور نہ وہ کوئی اور عہدہ قبول کرسکتے ہیں اور نہ کسی ایسے معاملے یا پیشے میں پڑ سکتے ہیں جو ان کے فرائض کی بجا آوری میں حائل ہو۔ ججوں کی سالانہ تنخواہ پندرہ ہزار فرانک ہے۔ چونکہ اسمبلی کی نشستگاہ جرمن زبان بولنے والے علاقہ (برن) میں ہے، اسلئے فرانسیسی بولنے والوں کی تالیف قلوب کے خیال سے ٹربیونل کی عدالت لوزآنے میں ہے۔

فیڈرل کورٹ یا عدالتِ وفاق، معمولی دیوانی اور فوجداری مقدمات کے علاوہ ان مقدمات کا بھی فیصلہ کرتی ہے جو فیڈریشن اور کینٹونوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ دیوانی مقدمات کی صورت میں معاملے کی رقم تین ہزار فرانک سے زیادہ ہو۔ ان مقدمات کو جو فیڈریشن اور میونسپلٹیوں یا افراد کے درمیان ہوں، فیڈرل کورٹ اسوقت ہاتھ میں لیتی ہے جب طرفین میں سے کوئی ایک اس امر کی درخواست کرے۔

ملکی دستور نے فیڈریشن کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ ضرورتاً فیڈرل کورٹ کی طاقت میں اضافہ کرسکتی ہے۔ اور جہاں تک دیوانی معاملات کا تعلق ہے وقتاً فوقتاً ایسا کیا بھی گیا ہے۔ بالخصوص حبس دوام، ادائگی قرضہ جات اور دیوالے کے مقدمات میں فیڈرل کورٹ اپنے مجوزہ اختیارات کی حدود سے باہر آکر کام کرتی رہی ہے۔ ایسی صورتوں میں تین ججوں کی ایک کمیٹی مقدمات کا تصفیہ کرتی ہے۔

فوجداری معاملات میں فیڈرل کورٹ کے اختیارات اتنے وسیع نہیں ہیں۔ اس میدان میں اُس کے فیصلے اخلاقی و سیاسی جرائم، اور فیڈرل افسران کے احکامات کی خلاف ورزی وغیرہ کے مقدمات تک محدود ہیں ایسے مقدموں میں عدالت بارہ افراد کی ایک جیوری مقرر کرتی ہے جو حالات اور واقعات پر ایک غائر نظر ڈالنے کے بعد اپنا فیصلہ دیتی ہے۔ فیڈرل اسمبلی کی اجازت سے کینٹونوں کی حکومتیں اور قسم کے مقدمے بھی فیڈرل کورٹ کے سپرد کرسکتی ہیں۔ فوجداری کے زیادہ دقیق معاملات کا تصفیہ کرنے کے لئے ہر سال فیڈرل کورٹ چار ایوانوں میں منقسم ہوجاتی ہے۔ ہر ایوان میں پانچ یا اس سے زیادہ جج ہوتے ہیں۔

سوئٹزرلینڈ کا شعبۂ انصاف و عدالت دو اہم باتوں میں امریکہ کے شعبۂ انصاف سے مختلف ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ مقدمات جن میں بہ سلسلۂ امور انتظامی قانون کے استعمال یا عدم استعمال کا سوال درمیان میں آجاتا ہے، یا جن میں اہلکارانِ حکومت ماخوذ ہوتے ہیں ایسے مقدمات سوئٹزرلینڈ میں فیڈرل کونسل یا فیڈرل اسمبلی کیلئے مخصوص ہیں، جبکہ امریکہ اور انگلستان میں ان کا تصفیہ معمولی عدالتوں میں ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سوئٹزرلینڈ کی وفاقی عدالت وفاقی قانون یا اس قانون کے کسی حصے کو اس بنا پر غلط قرار نہیں دے سکتی کہ اس سے وفاقی دستور اساسی کی کسی دفعہ پر زد پڑتی ہے۔ فیڈرل کورٹ کو یہ حق بلاشبہ پہونچتا ہے کہ وہ کینٹون کے کسی قانون کو اس لئے رد کردے کہ اس سے فیڈریشن یا کینٹون کے دستور اساسی کی مخالفت ہوئی مگر دستور اساسی کی رو سے

اصلاً یہ حق فیڈرل اسمبلی ہی کو تفویض ہوا ہے کہ وہ دستور اساسی اور اس کے ماتحت بنائے ہوئے قوانین کی تفسیر کر سکے۔ گویا فیڈرل اسمبلی اپنے ہر قانون کے حسب دلخواہ معانی، عدالت وفاق کی کسی ایسی مداخلت کے بغیر ہی بیان کر سکتی ہے، جو اصلاح کی مدعی ہو۔

امریکن قانون ساز اس اُصول کو نہیں مانتے کیونکہ ان کے نزدیک اسمبلی کے اختیارات انہی حدود کے اندر رہنے چاہئیں جو عوام نے اکثریت رائے سے اس کے لئے متعین کر دی ہیں۔ اگر اسمبلی کو یہ اختیار دیدیا گیا کہ وہ جمہور کے سپرد کردہ اختیارات کو حسب دلخواہ معنی پہنائے، تو جمہور کی رائے کی کوئی وقعت نہیں رہے گی اور اسمبلی کے اس دستوری ادعا کا اعتبار باطل ہو جائے گا کہ وہ اُسی دستور اساسی کو عملی صورت دینے کے لئے قوانین بناتی ہے جو جمہور کی طرف سے ترتیب پانے کے بعد اُسے سپرد کیا گیا ہے۔

سوئٹزرلینڈ میں ادنیٰ درجے کی عدالتوں کا کوئی وجود نہیں ہے کیونکہ عدالت و انصاف کا بہت سا کام کینٹونوں کے جج ہی انجام دے لیتے ہیں۔ کینٹونوں میں کورٹ آف اپیل (Court of Appeal) کورٹ آف فرسٹ انسٹنس (Court of first Instance) اور جسٹس آف دی پیس (Justice of the Peace) وغیرہ عدالتیں ہوتی ہیں۔ ان کا انتخاب جمہور یا کینٹونوں کی کونسل کی رائے سے عمل میں آتا ہے۔ تنخواہیں معمولی ہوتی ہیں۔ اور مدت ملازمت تین یا چار برس ہے گو دوبارہ بھی انتخاب ہو سکتا ہے۔ وہاں عموماً ایسے لوگ عہدہ دار بنائے جاتے ہیں جو قانونی قابلیت کے علاوہ مضبوط کیرکٹر بھی رکھتے ہوں یہ عدالتیں عموماً طرفین میں تصفیہ کرا دیتی ہیں اور انھیں طویل مقدمے بازی میں نہیں پھنسنے دیتیں۔ دیوانی مقدمات میں جیوری کا تقرر نہیں کیا جاتا البتہ فوجداری میں یا ان مقدمات میں جو پریس سے متعلق ہوں، غیر سرکاری ججوں کا تقرر ہوتا ہے یا ججوں کے ساتھ اسیسر بھی کام کرتے ہیں۔ بعض کینٹونوں میں غربا کو قانونی مشورہ اور امداد بھی مفت دی جاتی ہے۔

سول سروس اور فوج

نظام وفاق کے افسروں کو رکھنا یا کسی کوتاہی کی بنا پر برخاست کر دینا فیڈرل کونسل کے اختیار میں ہے اعلیٰ افسران کی مدت ملازمت تین سال ہے۔ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایکبار مدت ملازمت کے اختتام پر دوبارہ پھر تقرر ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سول سروس عملاً مستقل ملازمت ہے۔

افسران کو سیاسی وجوہ کی بنا پر بہت کم برخاست کیا جاتا ہے، ورنہ سیاسی وجوہ ان کے تقرر کا باعث ہوتی ہیں گو بالعموم ان لوگوں کو ترجیح دیجاتی ہے جو صاحب اقتدار پارٹی سے تعلق رکھتے ہوں۔

نظام وفاق کے افسران فیڈرل اسمبلی میں نہیں بیٹھ سکتے اور نہ کینٹونوں کے افسران کینٹونوں کی اسمبلی میں

نشست حاصل کر سکتے ہیں گو دستوراً اس کی اجازت ہے کہ افسران بالادست کی اجازت سے ایک نظام کے افسر اور اہلکار دوسرے نظام کی اسمبلی میں چلے جائیں۔ بالفاظ دیگر حاکمان بالا کی اجازت حاصل کرنے کے بعد فیڈریشن کے افسران کینٹونوں کی اسمبلی میں اور کینٹونوں کے افسران فیڈرل اسمبلی میں آسکتے ہیں۔

عام طور پر کینٹونوں سے افسران فیڈرل اسمبلی میں آتے ہیں مگر نظام وفاق کے بہت کم کینٹونوں کی اسمبلیوں میں بیٹھتے ہیں۔

افسروں اور اہلکاروں کو سیاسی انتخابات میں حصہ لینے کا حق حاصل ہے۔ البتہ ان سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ اس پارٹی کے لئے کام کریں گے جس کی مدد سے انھیں عہدہ حاصل ہوا ہے۔ کیونکہ مدت ملازمت کے بعد دوبارہ تقرر کسی پارٹی کے اقتدار کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ اس لئے عمل میں آتا ہے کہ نظام حکومت کے کسی ضروری اور کارآمد پرزے کو اس کی جگہ سے الگ کرنا غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ سرکاری عہدوں کی تنخواہیں بھی سوئٹزرلینڈ میں بہت کم ہیں اس لئے ان کے حصول کے لئے معرکہ آرا کشمکشوں میں مبتلا ہونا ویسے بھی سعی لاحاصل کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ بالعموم کینٹونوں میں ایگزکٹو کونسل اور شہروں میں میونسپل کونسل عہدوں کیلئے تقرری کا فیصلہ کر دیتی ہے بعض کینٹونوں میں عہدوں کیلئے خاص خاص قابلیتوں کی شرطیں ہیں مگران شرائط کی تکمیل پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا۔ فوج سوئٹزرلینڈ کے وفاقی نظام کا ایک اہم عنصر ہے۔ ہر شہری کیلئے بیس سے لیکر بتیس برس تک ریگولر فورس میں فوجی خدمت انجام دینا ضروری ہے بتیس برس کے بعد چوالیس سال کی عمر تک وہ ریزرو فوج میں شمار ہوتا ہے۔ یہ قانون جس کی رو سے ہر شہری پر لازمی فوجی خدمت عاید کی گئی ہے ۱۹۰۷ء میں پاس ہوا تھا اور عوام کی رائے کے لئے نشر ہونے کے بعد قانون بنا تھا۔

(آئندہ ہم ریفرینڈم (Referendum) اور انی شیٹو (Initiative) یعنی "نشر قانون برائے حصول رائے عامہ" پر روشنی ڈالیں گے۔ اور "حکومت وفاق بلاواسطۂ عوام" کا بیان کریں گے)

ان۔ اے جعفری

ضرورت ہے

مکتوبات نیاز

مکرمی -

آپ نے جس مسئلہ میں میری رائے دریافت فرمائی ہے، وہ شاید اتنا پیچیدہ نہیں کہ مجھے آپ کے یقین و اعتقاد کے خلاف کہتے ہوئے ڈر معلوم ہو۔ اس میں شک نہیں کہ اُردو شاعری کے دامن میں بقول جناب بیشما "جواہر رنگا رنگ" نظر آتے ہیں، لیکن یہ خیال تو کبھی میرے خواب میں بھی نہیں آیا کہ وہ فارسی شاعری کی ہم پلہ قرار دیجا سکتی ہے۔

معاف فرمائیے جس چیز کو آپ "جواہر رنگا رنگ" فرماتے ہیں وہ سب صدقہ ہے فارسی شاعری کا ورنہ اس سے قبل تو حقیقت یہ ہے کہ وہ

اک چیز تھی سی بزبانِ دکنی تھی

یہ درست ہے کہ نزاکت خیال و معنی آفرینی کی اچھی اچھی مثالیں اُردو شاعری میں ملتی ہیں لیکن یہ سب وہی ہیں جن میں فارسی کا عنصر غالب ہے اور اس باب میں اُردو کی مجبوری ظاہر ہے کیونکہ اس کے حروف صلہ و روابط نے اس کی وسعت کو بہت کم کر دیا ہے اور وہی ایک خیال جسے ہم فارسی کے دو لفظوں میں ادا کر سکتے ہیں، اُردو کے چار لفظوں سے بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ ایک بار میں اس خیال کو ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ "مجھ مجبور کے ہجوم آرزو کا حال تم کیا پوچھتے ہو، کیونکہ تمھاری ہر وہ نگاہ جو مجھ تک نہیں پہونچ سکی اسی کو میں نے اپنا مدعا قرار دے لیا" چونکہ اسوقت فارسی کی غزل پر فکر کر رہا تھا اس لئے شعر یوں ہو گیا:۔

چہ پرسی از ہجوم آرزو ہائے منِ بیکس
سوئے من ہر نگاہت را کہ نا مد مدعا کردم

اُردو میں اس خیال کو اسقدر اختصار کے ساتھ ظاہر کرنا دشوار ہے۔ اور اس کا بڑا سبب وہی ہے جو ابھی عرض کیا کہ اس میں "سے۔ کا۔ کی" وغیرہ بہت جگہ لے لیتے ہیں اور فارسی میں صرف زیر و زبر سے یہ کام نکل جاتا ہے۔ غالب کا شعر ہے

شبم تاریک و منزل دور و نقشِ جادہ ناپیدا
ہلاکم جلوۂ برقِ شراب گاہ گاہی را

دوسرے مصرعہ کے چند الفاظ جتنے وسیع مفہوم پر حاوی ہیں، وہ اُردو کے پورے شعر سے بھی ظاہر نہیں ہو سکتا۔
دوسری چیز جو فارسی شاعری کو اُردو سے ممیز کرتی ہے اس کے انداز بیان کا تیکھاپن ہے جو ایرانی کلچر کی رنگینیوں اور اس کے بڑھے ہوئے تکلفات سے پیدا ہوا ہے۔
عرفی کا ایک شعر ہے:-

خوش آنکہ پیش تو پرسند حال عرفی داد
شکایتے بہ کنایت ز روزگار کند

کسی قوم کی زبان میں طنزیہ لٹریچر اسی وقت بڑھتا ہے جب وہ تمدن کی انتہائی منزلیں طے کر چکی ہو اور معیشت و معاشرت کی لطافت و نزاکت نے اس کی ہر ہر چیز کو مخصوص اصول و عوائد کا پابند بنا کر خاص قسم کی پُر تکلف شائستگی اس میں پیدا کر دی ہو۔ اب عرفی کے اس شعر کو دیکھئے اور غور کیجئے کہ اس سے کتنا لطیف کلچر ظاہر ہوتا ہے اور شکوہ و شکایت کرنے کے لئے جو اہتمام عرفی کے پیش نظر ہے وہ "تہذیب عجم" کے کتنے گہرے نقوش اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ ایرانی شاعر کسی حال میں ہو لیکن "بزم آرائی" اور "باغ و راغ" کے خیال سے وہ کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔ تشبیہ و استعارہ تو خیر بالکل آرٹ کی چیزیں ہیں لیکن وہ اپنے غم آلود جذبات کے اظہار میں بھی "گل و گلستاں" اور "شمع و شبستاں" کے دائرہ سے باہر جانا پسند نہیں کرتا۔ وہ اپنی پریشاں حالی کا اظہار کرتا ہے تو بھی اس کا معیار یہ قرار دیتا ہے کہ

آشفتگی کجا و ہوائے چمن کجا

اور اپنی دل کی آگ کا ذکر کرتا ہے تو بھی انداز بیان یہ ہوتا ہے

آتش زدی چمن چمن افروختی مرا

دشت نوردی و آبلہ پائی کا منظر ایسا نہیں کہ اس میں کوئی رنگین بیانی کام دے سکے لیکن وہ یہاں بھی اپنی اسی وضع پر قائم رہتا ہے اور اس فرصت سے فایدہ اُٹھانے کی صورت یہ پیدا کرتا ہے۔

میزنم بر سر گلے تا خارے از پا می کشم

جلال اسیر نے ایک جگہ شمع و پروانہ اور گل و بلبل کا اجتماع جس خوبی و اہتمام سے کیا ہے اسے ملاحظہ فرمائیے۔

شمع را ہمدرد و بلبل کرد عشق
برگ گل چیدد و پر پروانہ ساخت

گویا پھولوں کی سیج ہے۔

الغرض ایرانی عاشق اگر محبت بھی کرتا ہے تو اس فلسفہ کے ساتھ کہ

در کار عشق نالہ و آہے ضرور نیست

اور صحرا نوردی پر مجبور ہوتا ہے تو اس شان کے ساتھ کہ

ہر سایۂ خارے شکنِ طرفِ کلاہے ست

میں سلسلۂ گفتگو میں معلوم نہیں کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ ہاں تو مقصود یہ کہنا تھا کہ فارسی کے اندازِ بیان میں جو طرحداری پائی جاتی ہے وہ اُردو کو نصیب نہیں۔ البتہ مومن و غالب کے یہاں اس بانکپن کی مثالیں ملتی ہیں لیکن ان میں بھی کوئی بات ایسی نہیں جو فارسی سے ممیز کر سکے۔ پھر اس کا سبب وہی ہے جو میں بیان کر چکا کہ فارسی زبان میں جو وسعت ہے وہ اُردو کو میسر نہیں۔ اور اسی لئے غالب کا ذوق شعری فارسی میں جاکر پورا ہوا اور اپنے اُردو کلام کو "مجموعۂ بے رنگ" کہکر اُسے معذرت کرنا ہی پڑی۔

میں فارسی اندازِ بیان کی چند مثالیں یہاں پیش کرتا ہوں۔ اگر ان سے ہٹکر کوئی اور راہ اُردو نے شوخ نگاری کی پیدا کی ہو تو میں بھی سننا چاہتا ہوں

قمریاں پاسِ غلط کردہ خودمی دارند
ورنہ یک سرو دریں باغ بہ اندام تو نیست

شوخ نگاری سے میری مراد بیان کا وہ مخصوص انداز ہے جو معمولی سی بات میں ندرت پیدا کر دے۔ شاعر کہنا صرف یہ چاہتا ہے کہ میرا محبوب خوش قامتی میں سرو سے بہتر ہے لیکن شاعر کی تلاش اور طرزِ ادا کو دیکھئے کہ معلوم ہوتا ہے نہ ذکر سرو کا ہے نہ قامتِ یار کا بلکہ صرف قمریوں کا۔ لیکن اصل مدعا جس لطافت کے ساتھ ظاہر ہو گیا، وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں۔

اسی انداز بیان کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:۔

ساقی تو نئی و سادہ دلی بیں کہ شیخ شہر
باور نمی کند کہ ملک میگسار شد

ہندوستان کے فارسی شعرا میں غالب اس رنگ کا تنہا مالک تھا، چند شعر اس کے بھی سن لیجئے:۔

خجلت نگر کہ در حسنا تم نیا فتند
جز یک روزہ درست زصہبا کشودہ

لفظ خجلت اور درست نے اس شعر کے انداز بیان کو اعجاز کی حد تک پہونچا دیا ہے جس کی مثال اُردو شاعری پیش نہیں کر سکتی۔

من آں نیم کہ دگر می تواں فریفت مرا
فریبش کہ مگر می تواں فریفت مرا

یہ تو چند مثالیں صرف انداز بیان کی ندرت کی ہیں۔ معنی آفرینی اور حُسن تعبیر کا ذکر کروں تو مہینوں گزر جائیں تو بھی اس داستان کو ختم نہیں کر سکتا۔ غالب ہی کا ایک شعر پیش کرتا ہوں ملاحظہ ہو۔ آشیاں کے جلنے کے ہزاروں شعر آپ نے دیکھے ہوں گے، لیکن ذرا اس کو بھی دیکھئے۔ لکھتا ہے :-

مرادمیدنِ گل در گماں فگند امروز
کہ بار بر سرِ شاخِ گل آشیانم سوخت

معاف فرمایئے میں نے آپ کا بہت وقت ضایع کیا، لیکن کیا کروں اسوقت کہ فارسی کا ذوق بالکل مفقود ہوتا جا رہا ہے، کسی طرف سے کوئی آواز ایسی آجاتی ہے تو دل بے چین ہو جاتا ہے اور بہت سی وہ باتیں جو زبان تک اس لئے نہیں آتیں کہ ان کا سننے والا اب کون ہے بے اختیارانہ منھ سے نکل ہی جاتی ہیں، خوش رہئے کہ آپ نے یہ ذکر چھیڑ کر دل کا بوجھ تھوڑا سا ہلکا کر دیا۔ لیکن اسی کے ساتھ آخر میں دبی زبان سے مجھے یہ بھی کہنے دیجئے کہ فارسی شاعری کا دلدادہ میں اسکی شوخ نگاری یا معنی آفرینی کے لحاظ سے نہیں ہوں بلکہ صرف اس لئے کہ وہی جلال آسیر جو یاروں کی صحبت میں اپنے محبوب کا ذکر اس رنگیں بیانی سے کرتا ہے کہ

در گلستاں دیدمش نشناختم
بر تنش پیراہن گل تنگ بود

جب دوست کے حضور میں سراپا رہنِ عشق و محبت ہو کر پہونچتا ہے تو سوائے اس کے اس کی زبان سے کچھ نہیں نکلتا

کس چہ می داند کہ در بزم تو غمناکم چرا

عمر بھر سر دھنتے رہنے کے لئے یہی ایک مصرعہ کافی ہے۔ اور کیا کیجئے گا۔

صدیق مکرم

آپ کا معذرت نامہ پہونچا۔ جس میں زیادہ کوشش اس بات کی کی گئی ہے کہ آپ کے اس "عذرِ گناہ" کو "بدتر از گناہ" نہ سمجھا جائے۔

میرے عزیز دوست، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ "عذرِ گناہ" کو گناہ سمجھنے کی غلطی مجھ سے کبھی سرزد نہیں ہوئی مگر ہاں اسوقت کہ اس سے مقصود، واقعی "اجتناب و احتراز" ہی ہو۔ پھر یہ آپ نے کیسے جانا کہ

میں آپ کو خدانخواستہ "نصوح" سمجھ کر آپ کی اس معذرت پر ایمان بھی لے آؤں گا۔
آپ بھی عجیب چیز ہیں۔ کیسی معصیت اور کہاں کی توبہ، گناہ کیجئے، اس نیت سے کہ معذرت کی فرصت ہر وقت نصیب ہے اور معذرت کیجئے اس عزم کے ساتھ کہ آئندہ پھر وہی گناہ کرنا ہے خصوصیت کے ساتھ میرے معاملات میں جو آپ کو بیگناہ سمجھنے کے گناہ میں ایکبار بھی کبھی مبتلا نہیں ہوا۔
ہوش میں آئیے اور جو جی چاہے کیجئے۔

تو ہر گناہ کہ خواہی بکن کہ معذوری

محب گرامی۔
کرمت نامہ کل شام کو پہونچا اور ساری رات میں یہی سوچتا رہا کہ تعمیل ارشاد کروں تو کیونکر کروں اور کروں تو پھر وہ کیا صورت ہے کہ آپ برا نہ مانیں۔
باور کیجئے، یہ داستان اتنی طویل ہے کہ مجھے خود نہیں معلوم اس کا سر رشتہ کہاں ہے، انجام کا ذکر کہ اس کی تاریکیوں نے تو میری قوت فکر و احساس بھی مجھ سے چھین لی ہے۔ مگر ہاں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ ہوا سب جائز و درست تھا۔
زمانہ کی شکایت کیا کروں کہ اب اس میں کوئی شاعرانہ لذت بھی باقی نہیں رہی (حقیقت تو خیر کبھی تھی ہی نہ) اپنی کمزوریوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ مبادا آپ اسے بجائے حقیقت کے "میرے ضعف قوا" پر محمول کریں، حالانکہ یہی وہ ایک چیز ہے جسے نہ میں سننا چاہتا ہوں نہ سمجھنا۔
میری خوبیوں کا علم تو آپ کو ہو گا لیکن اپنی برائیوں سے میں خود ہی خوب واقف ہوں۔ ان سب کا تو وقت طلب ہے لیکن مثالاً صرف ایک سن لیجئے۔ وہ یہ کہ میں اُن سے بھی لطف کی تمنا رکھتا ہوں جو نیکی اس دنیا میں کرتے ہیں اور انعام دوسری دنیا میں چاہتے ہیں گویا اپنی "خستگی کی داد" ان لوگوں سے چاہتا ہوں جو مجھ سے زیادہ "خستۂ تیغ ستم" ہیں۔ اب بتائیے یہ میری فطری کمزوری ہے یا نہیں اس میں عناصر اور ان کے "عدم اعتدال" کا کیا دخل۔
دوسری بُرائی اسی سلسلہ کی اور سُن لیجئے:۔
چونکہ موت کو میں پایانِ حیات سمجھتا ہوں اس لئے جی نہیں چاہتا کہ زندگی کا کوئی ایک لمحہ بھی اُلجھن میں بسر ہو، اور دشمن کی دشمنی کی بھی کوئی نہ کوئی ایسی تاویل کر لیتا ہوں کہ اس کی طرف سے خلش باقی نہ رہے چہ جائیکہ دوست!

پھر آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ ایسے احمق کو دنیا میں جینے اور خوش رہنے کا کیا حق حاصل ہے اور وہ کس منھ سے اُن صدموں کا حال بیان کرے جو (دشمنوں سے نہیں) دوستوں سے اُسے پہونچنا چاہئے۔
بہرحال حقیقت یہ تھی جو عرض کر دی گئی اور اگر اب بھی آپ ماننے کے لئے طیار نہیں تو غالب کے اس شعر کو اپنی شفاعت میں پیش کرتا ہوں۔

کشتۂ دلِ خویشیم کز ستمگراں یکسر
دید دلفریبیہا، گفت مہربانیہاست!

دیکھئے، آپ نے پھر ستانا شروع کیا۔ جس طرح آپ میرے صبر و تحمل کو بے نیازی پر محمول کرتے ہیں، اسی طرح میں آپ کی "دل پرسی" کو "دل آزاری" سمجھتا ہوں۔
میں آپ سے دادِ وفا نہیں چاہتا تو آپ کیوں اس کا تقاضہ کریں — میں نے خود اپنے آپ سے خفا ہونا سیکھ لیا ہے، مجھے کیا ضرورت ہے کہ کسی اور سے برہم ہو کر خواہ مخواہ اسکی ہمدردیوں کا احسان لوں۔

پروانۂ چراغ مزار خودیم ما

باب المراسلۃ والمناظرہ

اسلاف کی عمر و توانائی

نوحؑ اور عوج بن عنق

جناب انجم رضوانی - رزمک)

اگست کے نگار میں آپ نے عہد قدیم کے انسان کے صحیح و توانا ہونے کی تردید کی ہے - نیز عمر کی تعیین تیس سال فرمائی ہے جو میرے خیال میں درست نہیں -

مورخین و مفسرین نے انبیا علیہم السلام کی عمریں بڑی بڑی لمبی بتائی ہیں - خود قرآن کریم نے حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے نو سو سال بتائی ہے - قد بڑے بڑے طویل لکھے ہیں - چنانچہ عوج بن عنق کے متعلق کہیں میں نے پڑھا ہے کہ اُس کا قد اتنا دراز تھا کہ سورج کی تپش سے مچھلی بھون لیا کرتا تھا - اور حضرت موسیٰؑ کا قد بعض نے دس گز اور بعض نے تیس گز تحریر کیا - اور اسی قدر ان کا عصا لمبا بتایا پھر اتنا ہی وہ اُچھلے تو عصا کی ضرب عوج کی پنڈلی پر لگی وغیرہ - دور کیوں جایئے ایک صدی پیچھے کا عرصہ لیجئے - لوگوں کی زبانی ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ فلاں کے دادا کی عمر سو برس تھی پردادا کی ڈیڑھ سو برس ہوئی - حضرت عمرؓ کے متعلق لکھا ہے کہ اُن کا انگوٹھا ہماری ہتھیلی کے برابر تھا اور اسی لحاظ سے قد اور جسم بھی - نیز ہم خود دیکھتے ہیں کہ اب بھی جو کوئی پرانے بزرگ موجود ہیں ہماری نسبت زیادہ صحیح و توانا ہیں - حالانکہ ہمیں ہر طرح کی آسائشیں میسر ہیں اور ان کی زندگیاں نہایت سادہ اور بے سروسامان --- پھر کیونکر باور کیا جائے کہ آپ درست فرما رہے ہیں - کیا آپ اس پر مزید روشنی ڈالیں گے

(نگار) میرے سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آپ لوگ ہر بات میں کلام مجید اور مذہبی لٹریچر کو کیوں لے بیٹھتے ہیں - قرآن پاک ہم کو درسِ اخلاق دیتا ہے، ہمیں شائستگی و تہذیب سکھاتا ہے، دنیا کے امن و سکون کی طرف لوگوں کو

دعوت دیتا ہے اور اس سے بھی زیادہ وہ سب کچھ کرتا ہے جسے آپ حضرات تصفیۂ باطن و تزکیۂ روح سے تعبیر کرتے ہیں لیکن یہ آپ نے کیونکر باور کرلیا کہ وہ تاریخی حقایق بھی اپنے اندر رکھتا ہے، علم الارض و فلکیات کے مسائل بھی حل کرتا ہے، اثریات و کیمیا کے نکات بھی اس میں موجود ہیں اور "شرح اسباب" اور بوعلی سینا کے "قانون" سے بھی بے نیاز کرسکتا ہے۔

میں نے جو کچھ اگست کے نگار میں قدیم انسان کی صحت و توانائی کے متعلق لکھا ہے وہ نتیجہ ہے جدید ترین تحقیقات علمی کا جس پر علمار اثریات، ماہرین علم الارض اور محققین علم طب سب کا اتفاق ہے اور چونکہ اسوقت ان تمام علوم کے نظریئے حقایق ثابتہ میں شمار ہوتے ہیں اس لئے ان کی مخالفت میں آپ کا قرآن پاک یا مذہبی لٹریچر کو پیش کرنا صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ ساری دنیا کو قرآن پاک اور اپنی مذہبی روایتوں پر ہنسنے کا موقعہ دیتے ہیں۔

آپ یہ استدلال ان مسلمانوں کے سامنے ضرور پیش کرسکتے ہیں جو کلام مجید کو آپ ہی کی طرح بازیگر کا "کشکول" سمجھ کر دنیا کی تمام چیزیں اس کے اندر سے نکالنے کا دعوے کرتے ہیں، لیکن غیر مسلم جماعت یا ان مسلمانوں کے سامنے جو کلام پاک کو صرف درس انسانیت دینے والی کتاب سمجھتے ہیں، اس طرح کی باتیں کرنا، معاف فرمایئے قرآن مجید اور اسلام دونوں کی توہین ہے۔

یہاں تک تو اجمالی جواب ہوا آپ کے شبہات کا۔ اب میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ نوحؑ اور عوج بن عنق کے متعلق گفتگو کروں گا، جن میں سے ایک کی عمر آپ ۹۵۰ سال بتاتے ہیں اور دوسرے کے قد کو اتنا طویل کہ وہ ہات بڑھا کر سورج کی تپش سے مچھلی بھون لیا کرتا تھا۔

آپ نے عمر نوحؑ کی درازی کے ثبوت میں قرآن کریم کا بھی ذکر کیا ہے۔ غالباً آپ کا اشارہ سورۂ عنکبوت کی اس آیت کی طرف ہے:—

"ولقد ارسلنا نوحًا الی قومہ فلبث فیہم الف سنۃ الا خمسین عامًا"

(یعنی ہم نے نوح کو اس قوم کی طرف مبعوث کیا اسو وہ رہا اُن میں پچاس کم ایک ہزار سال تک)

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ تمام مفسرین اس امر پر متفق نہیں ہیں کہ قرآن پاک میں ان الفاظ سے نوحؑ کی عمر بتائی گئی ہے۔ بلکہ اس سے مراد اُس مدت کو ظاہر کرنا ہے جس مدت تک نوحؑ کی شریعت دنیا میں قایم رہی۔ قرآن پاک میں اس آیت کے بعد ہی حضرت ابراہیم کا ذکر ہے جو نوحؑ کے تقریباً ۹۵۰ سال بعد پیدا ہوئے تھے اور اس لئے زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ کلام مجید میں جو تعیین زمانہ کی گئی ہے اس کا تعلق نوح کی عمر سے نہیں بلکہ ان کی شریعت سے ہے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ کلام مجید میں روایات عتیقہ کا جتنا حصہ پایا جاتا ہے وہ سب بہ ادنیٰ تغیر وہی تو

ریت و انجیل میں نظر آتا ہے - چنانچہ عمر نوح کی یہ ۹۵۰ سالہ تعین بھی بائبل ہی میں مذکور ہے - اور بعثت
کے وقت ہر شخص کی زبان پر یہ روایت موجود تھی - اس لئے اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ بھی تسلیم کرلیں کہ
مجید میں بھی "الف سنتہ الا خمسین عاما" کہکر نوح کی عمر ہی کو ظاہر کیا گیا ہے تو اس کے معنے یہ نہ ہونگے
ا بھی اس کی تصدیق کرتا ہے، بلکہ یہ انداز بیان بالکل اس طرح کا ہوگا جیسا کہ ہم مخاطب کی کسی غلط بات کو
، بیج مانتے ہوئے معارضہ یا نصیحت کریں -

قرآن پاک میں روایات عہد عتیق کا ذکر صرف بصورت "نقل و حکایت" پایا جاتا ہے اور کسی جگہ واقعہ
فی کی حیثیت ان کو نہیں دی گئی - اس لئے ان روایات کی واقعیت یا تاریخی صحت کے ثبوت میں کلام مجید کو
ں کرنا درست نہیں ہو سکتا -

جسوقت رسول اللہ مبعوث ہوئے ہیں اسوقت نہ صرف یہود و نصاریٰ بلکہ صنم پرست عربوں میں بھی توریت
یل کی روایتیں زبانزد تھیں اور سب لوگ انھیں بالکل صحیح تصور کرتے تھے -

پھر چونکہ رسول اللہ کا مقصود صرف اخلاق کی درستی تھی اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ اصل مدعا کو چھوڑ کر
ان روایات کی تاریخی چھان بین میں لگ جاتے اور پاکیزگی نفس کا درس دینے کی جگہ لوگوں سے یہ کہتے پھرتے
ریت و انجیل کی یہ روایات صحیح نہیں ہیں - اسی کے ساتھ چونکہ ان روایات کا مقصود بھی فی الجملہ لوگوں میں
یات اعتبار و بصیرت پیدا کرنا تھا جو تعلیم اخلاق کے لئے ضروری ہیں، اس لئے یوں بھی کوئی وجہ نہ تھی کہ انکی
لفت کی جاتی -

ایک مصلح قوم کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ ہمیشہ وقت و ماحول کے اقتضاء کو پیش نظر رکھے، کیونکہ اس سے
ف کر وہ کبھی اپنے مدعا میں کامیاب نہیں ہو سکتا - چونکہ عہد عتیق کی روایات لوگوں کے دماغ میں مرتسم ہو چکی
ہیں، اس لئے انھیں کی وساطت سے درس اخلاق دینا مناسب سمجھا گیا تاکہ وہ جلد متاثر ہوں، چنانچہ یہی
سبب تھا کہ روایات یہود و نصاریٰ کے رواج کو رسول اللہ نے روکا نہیں اور بعد کو مفسرین نے ان روایات
اعتماد کر کے قرآن پاک کی عجیب و غریب تفسیریں کر ڈالیں، حالانکہ ان کو سمجھنا چاہئے تھا کہ رسول اللہ نے کیوں
ور کن حالات کے ماتحت ان روایات کے نقل و بیان کی اجازت دی تھی اور کلام مجید میں ان کا پایا جانا اس
یثیت سے نہ تھا کہ وہ تاریخی واقعات ہیں -

پھر اگر مفسرین صرف انھیں روایات پر اکتفا کرتے جو کلام مجید میں پائی جاتی ہیں تو بھی غنیمت تھا، لیکن
انھوں نے ستم تو یہ کیا کہ توریت و انجیل کی تمام روایتوں کو بلا لحاظ اس امر کے کہ قرآن میں ان کا ذکر ہے یا نہیں،
جوں کا توں اپنے مذہبی لٹریچر میں شامل کر لیا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج آپ نہ صرف نوح کے ۹۵۰ سال تک

زندہ رہنے پر اصرار کر رہے ہیں بلکہ عوج بن عنق کے متعلق بھی ان تمام لغو و مزخرف روایات کو صحیح باور کر
رہے ہیں جن کا اشارہ تک کلام مجید میں کسی جگہ نہیں پایا جاتا۔

آپ جسے عوج بن عنق کہتے ہیں وہ وہی ہے جس کا ذکر بائبل میں " عوج " کے نام سے کیا گیا ہے
جو بشن کا بادشاہ تھا۔ میں ابھی یہ عرض کر چکا ہوں کہ کلام مجید میں اس کا کسی جگہ ذکر نہیں پایا جاتا لیکن ہمارے
مورخین و مفسرین نے اس کا حال جس جوش و ولولے کیا وہ سننے کے قابل ہے اور ہنسنے کے لائق بھی
صاحب تاریخ طبری، اس کی درازی قد کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ موسیٰ کا قد دس ہاتھ کا تھا
اور ان کا عصا بھی دس ہاتھ کا تھا لیکن اس کے باوجود جب وہ دس ہاتھ اچھلے ہیں تب جا کر کہیں عوج
کے ٹخنے تک پہونچے ہیں۔ اسی سلسلہ میں اسکی درازی قد کا ثبوت یہ پیش کیا ہے کہ اس کے ڈھانچہ کا پل بنا کر
لوگ دریائے نیل کو عبور کرتے تھے۔

ثعلبی کی تفصیل بھی ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں کہ۔ عوج کا قد ۲۳۳۳۳ ہاتھ لمبا تھا، وہ منہ کھول کر بادلوں
پانی پی لیتا تھا، سمندر میں گھس کر جو ہر جگہ اس کے لئے پایاب تھا، مچھلی پکڑ لیتا اور ہاتھ اونچا کر کے سورج
سے اسے بھون لیتا تھا۔ طوفان نوح جب آیا ہے تو پانی اس کے گھٹنوں تک تھا۔

جب موسیٰ کے بارہ جاسوس اس کے پاس پہونچے تو اس نے ان سب کو لکڑی کے ایک گٹھے میں
باندھ کر سر پر رکھ لیا تاکہ زمین پر پٹک کر سرمہ سرمہ کر دے لیکن اس کی بیوی نے (جس کے قد و قامت کا حال
ثعلبی کو معلوم نہیں ہو سکا) کہا کہ ایسا نہ کرو بلکہ انھیں چھوڑ دو تاکہ وہ موسیٰ کے کیمپ میں جا کر تمھاری قوت
عظمت کا ذکر کریں۔

جب عوج نے اسرائیلی لشکر دیکھا تو اس نے پہاڑ سے ایک بڑی چٹان اکھاڑ لی تاکہ لشکر پر پھینک کر
کچل ڈالے، لیکن خدا نے ہدہد اور دوسری چڑیوں کو مامور کیا کہ وہ اس چٹان میں سوراخ کر دیں، چنانچہ
چٹان خود عوج ہی کی گردن کا حلقہ بن گئی۔

ثعلبی نے اس کی عمر تین ہزار سال بتائی ہے۔ الکسائی نے جو گل افشانیاں کی ہیں ان سے بھی
لطف اٹھا لیجئے۔ لکھتے ہیں کہ :-

عوج، بیٹا تھا قابیل کا اور قابیل کی بہن عناق کے بطن سے ہوا تھا (کہا جاتا ہے کہ آدم کے زمانہ میں
بہن بھائی میں شادی ہوا کرتی تھی)۔ ایک مرتبہ ابلیس نے عناق کو پتھر کی چٹان پھینک کر ہلاک کرنا چاہا تو
عوج نے اس چٹان کو روک لیا۔ عناق نے خوش ہو کر دعا دی تو وہ اتنا طویل القامت ہو گیا کہ سمندر اس کے
گھٹنے تک آتا تھا اور اتنی قوت اس میں پیدا ہو گئی کہ جب وہ چلتا تھا تو زمین ہلنے لگتی تھی۔ وہ اگر کبھی روتا

تو اس کی آنکھوں سے دریا جاری ہو جاتے تھے - وہ ایک وقت میں دو ہاتھی کھا جاتا تھا - اور سال میں صرف دو مرتبہ سوتا تھا -

نمرود کے زمانہ میں اس نے دعویٰ کیا کہ آسمانوں کا سنبھالنے والا وہی ہے - اس نے نوح کی کشتی بنانے میں بھی حصہ لیا تھا -

وہ فرعون کے مشیروں میں سے تھا اور فرعون کی بیٹی سے شادی کرنے کے لئے وہ اسرائیلی لشکر کو تباہ کرنا چاہتا تھا کہ موسیٰ نے اسے ہلاک کر دیا -

یہ ہیں ہمارے مورخین و مفسرین کی وہ عجیب و غریب تحقیق جس میں ریاضی، ہیئت، جویات، جر ثقیل اور تاریخ سبھی کا گلا گھوٹنے کی کوشش کی گئی ہے - ان غریبوں کو کیا خبر تھی کہ انسان فضا میں جسقدر زیادہ بلندی پر پہونچتا ہے اتنی ہی زیادہ سردی محسوس ہوتی ہے، ورنہ شاید وہ بجائے "مچھلی بھونے جانے" کے اس کا منجمد ہونا ظاہر کرتے -

حسب بیان طبری معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے ٹخنے تک کی پیمائش تیس ہاتھ کی تھی اس لئے اگر ایڑی سے ٹخنے تک کا حصہ پورے جسم کا بیسواں حصہ قرار دیا جائے (حالانکہ زیادہ سے زیادہ ۱۵ - ۱۶ ہونا چاہئے) تو بھی اس کا قد صرف ۶۰۰ ہاتھ قرار پاتا ہے جو کسی طرح دریائے نیل کا پل نہیں بن سکتا - اور اگر ثعلبی کے بیان کو سچ جانکر اس کا قد ۲۳۳۳۳ ہاتھ باور کیا جائے تو پھر حضرت موسیٰ کا اس کے ٹخنے تک پہونچنا محال تھا کیونکہ اس حساب سے اس کا ٹخنہ کم از کم ایک ہزار ہاتھ زمین سے اونچا رہا ہوگا اور حضرت موسیٰ اپنے دس ہاتھ کے قد اور دس ہاتھ کے عصا کی مدد سے دس ہاتھ اچھلکر زیادہ سے زیادہ تیس ہاتھ تک پہونچے تھے -

الغرض یہ اور اس قسم کا آپ کا مذہبی لٹریچر ہے جس کی بنا پر آپ مجھ سے معارضہ کرتے ہیں اور علوم جدید کے حقایق کو غلط ٹھہرانا چاہتے ہیں -

خدا کے لئے میرے سامنے کسی ایسی بحث کو نہ لایا کیجئے جس میں مجھے مسلمانوں کے روایتی خرافیات ذکر کرنا پڑے، کیونکہ آپ اس کو جتنا چھانیں گے اتنا ہی کرکرا پائیں گے - اور یوں بھی ماشاء اللہ آپ اتنی عقل و فراست رکھتے ہیں کہ از خود بغیر کسی سے پوچھے ہوئے ایسی روایات کو رد کر دیا کریں، کیونکہ طبری و ثعلبی کے بیانات کو غلط کہدینا اس سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ آپ اپنے مذہب و تعلیمات مذہب کو مطعون و رسوا کریں -

عوج بن عنق کے متعلق یہ تمام بیانات بائبل میں صرف اس لئے گڑھے گئے ہیں کہ حضرت موسیٰ کی قوت کو ثابت کیا جائے - قدیم زمانہ میں چونکہ انسان رات دن لوتا بھڑتا رہتا تھا اس لئے اس کی عظمت کا انحصار

بہت کچھ اس کی قوت جسمانی پر ہوا کرتا تھا اور اس کی برتری اسی وقت ظاہر ہوتی تھی جب غیر معمولی جرأت وقوت کے افسانے اس سے منسوب کئے جائیں۔ پھر چونکہ موسیٰ بہت اولوالعزم پیغمبر تھے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس صفت میں بھی ان کو سب پر فائق نہ دکھایا جاتا اور اس کی صورت یہی ہو سکتی تھی کہ پہلے ایک عوج بن عنق پید کیا جائے اور پھر اس کو موسیٰ کے ہاتھ سے مفتوح و مغلوب دکھایا جائے۔

آجکل جو ہم اپنے آباو اجداد کی بڑی عمروں اور غیر معمولی قوتوں کا ذکر کرتے ہیں اس میں بھی ہماری یہی ذہنیت کارفرما ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ اوسط عمر کا قدیم زمانہ میں بہت کم تھا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ عہد قدیم میں کوئی شخص صحیح وتوانا یا طویل العمر پیدا ہی نہیں ہوا، بیشک ہوا ہوگا لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اسوقت سب کے سب ایسے ہی تھے بالکل ایسا ہی ہے جیسے آیندہ زمانہ میں اسوقت کے بعض سو سو سال سے زاید عمر پانے والے آدمیوں کا حال سُنکر یہ حکم لگایا جائے کہ سب اتنی ہی عمر رکھتے تھے۔

اس سلسلہ میں اگر آپ استدلال تمثیلی کو بھی سامنے رکھیں تو میرے بیان کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ آپ کو غالبًا اس کا علم ہوگا کہ یورپ کا اوسط عمر برابر بڑھ رہا ہے اور اس کا سبب صرف اُصولِ حفظانِ صحت کی پابندی ہے۔ پھر اگر آپ یہ مانتے ہیں کہ عہدِ قدیم کا انسان ان اُصول سے بے خبر تھا (اور وحشی و دیہاتی آبادیوں میں قدیم معیشت و معاشرت کے نمونے دیکھ کر آپ کو یہ ماننا پڑے گا) تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ ان کی صحت و توانائی اور غیر معمولی درازی عمر کے قایل ہوں۔

الغرض میں نے اس باب میں جو کچھ لکھا تھا وہ تحقیقات جدیدہ کی بنا پر لکھا تھا جس سے انکار ممکن نہیں اور اس لئے اس کے مقابلہ میں خواہ مخواہ مذہب کو لے آنا جو ان باتوں سے مطلق کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا، "وضع الشئی فی غیر محلہ" کے تحت میں آتا ہے جس سے ہمیں آپ کو سب کو احتراز کرنا چاہئے۔

جگر کی شاعری

(جناب تنویر قادری۔ بدایونی)

ستمبر کے نگار میں جناب اختر کا مضمون "جگر کی شاعری" اور خصوصًا جناب کا نوٹ نظر سے گزرا آپ کو حیرت ہے کہ جگر نے دیوان شایع کرانے کی جرأت کیوں کی؟

میں عرض کروں گا کہ یہ قصور غریب جگر کا نہیں ہے۔ بلکہ اُن پرستاران جگر کا ہے۔ جنھوں نے

غریب جگر کو یقین دلا دیا ہے کہ تو "فخرِ ہندوستان" ہے پیارے ۔ اور اس کی زیادہ تر ذمہ داری مسلم یونیورسٹی کے ارباب ذوق پر عاید ہوتی ہو جگر اور ان کی شاعری کے متعلق بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔
میں نے تو صرف تعمیل حکم کی ہے ۔ یہ ملاحظہ ہو نگار بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۶ء صفحہ ۶۲ - سطور ۱۵ تا ۱۹ -
" فاضل تبصرہ نگار نے زیادہ تر اُن اشعار سے بحث کی ہے - جو " تصوف " سے متعلق ہیں اور انھیں کے اغلاط و اقسام کو پیش کیا ہے حالانکہ اس رنگ کے اشعار اگر اغلاط سے پاک ہوں تو بھی وہ کوئی چیز نہیں ہیں اور خود اُن کا " متوفانہ ادعا " بجائے خود اس بات کا ضامن ہے کہ ان میں جتنا بھی اہمال پایا جائے کم ہے ۔ اس لئے ضرورت تھی کہ خالص تغزل کو پیش نظر رکھکر جگر صاحب کو بتایا جاتا کہ اُن کی لغزشیں کس قسم کی ہیں " ۔ لفافہ میں جو کچھ ملفوف ہے اس کے متعلق صرف اس قدر عرض کروں گا کہ اگر جناب نے اسے نگار کی آیندہ اشاعت میں شائع فرما کر اس سلسلہ میں اپنی رائے بھی ظاہر کر دی تو یہ ایک احسان ہوگا۔
مجھ پر نہیں - جناب جگر پر اب میں اس غلطی کی آپ سے " داد " چاہتا ہوں اور جگر صاحب سے " معافی " ۔

ر) میں آپ کا خط تو شائع کئے دیتا ہوں اور وہ بھی صرف اسلئے کہ جگر کی شاعری کے متعلق مختلف لوگوں کی ،قارئین نگار تک اسی طرح پہونچ سکتی ہیں ، لیکن آپ کا مقالہ شایع کرنے کی عزت حاصل نہیں کر سکتا ۔ کیونکہ نے جگر کی صرف ایک غزل (دل بنا دیا - ساحل بنا دیا) کو لیکر اس پر اظہار خیال کیا ہے اور میں یہ چاہتا ہوں کچھ لکھا جائے وہ پورے دیوان کو دیکھ کر لکھا جائے اور تبصرہ و انتقاد کے تمام پہلوؤں کو لئے ہوئے ہو ۔ ہی کے ساتھ معاف فرمایئے ، آپ کا اندازِ گفتگو بھی مجھے پسند نہیں آیا ۔
جگر کے فطری شاعر ہونے میں کلام نہیں ، اور جو کچھ اسوقت تک انھوں نے لکھا ہے اس میں تلاش سے ں کے نمونے بھی کافی سے زیادہ مل سکتے ہیں ، اس لئے کوئی ایسا مضمون جس میں جگر کے صرف نقایص نقایص دکھائے جائیں اور محاسن کو نظر انداز کر دیا جائے ، مجھے کبھی پسند نہیں آسکتا ۔
اگر آپ واقعی شعلہ طور پر کچھ لکھنا چاہتے ہیں تو تمام شرائط انتقاد کو سامنے رکھ کر لکھئے اور ایسی زبان میں ئے جو خشونت یا طعن و تشنیع سے پاک ہو ۔
آپ نے اپنے مقالہ کا عنوان " خونِ جگر " رکھا ہے جس سے آپ کی غیر معمولی ذہانت تو ضرور ظاہر ہوتی ہو ں اسی کے ساتھ یہ راز بھی فاش ہو جاتا ہے کہ آپ کے انتقاد کا زاویۂ نگاہ کیا ہے ۔

مہربانِ ، جگر کا صرف خون ہی نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی " اصلاح " بھی کیجاتی ہے ، پھر آپ یہ کیوں نہ کریں وہ کیوں کریں ؟

جنگِ مستقبل کی ہولناکیاں

دُنیا میں جتنا احساس امن پسندی کا بڑھتا جاتا ہے، اتنے ہی خطرے اور اس کی راہ میں حایل ہوتے جاتے ہیں۔ آپ کو اخباروں سے معلوم ہوتا ہوگا کہ یوروپ میں روز کسی نہ کسی تجویزِ امن وسکون پر بحث ہوتی رہتی ہے اور امکانِ جنگ کے خطرہ کو دور کرنے کے لئے تمام دول یوروپ اس طرح سر جوڑ کر بیٹھتی ہیں گویا اُنسے زیادہ صلح جو اور آشتی پسند قوم کوئی اور رہی نہیں، لیکن کسقدر عجیب بات ہے کہ ٹھیک اسی وقت جبکہ یہ مسیح کی بھیڑیں مسالمت و رواداری کی نرم و نازک آوازیں اپنے حلق سے نکالتی ہوتی ہیں، ان کی کھالوں کے اندر چھپا ہوا بھیڑیا اپنے دندان آز تیز کرنے میں مصروف نظر آتا ہے اور آخر کار یہ پیامِ امن دینے والی مجلسیں درہم برہم ہوکر رہجاتی ہیں

صورت یہ ہے کہ یوروپ کی وہ قومیں جو زیادہ قوی ہیں وہ اپنی قوت میں تو کمی پیدا کرتی نہیں اور چاہتی یہ ہیں کہ کمزور قومیں بدستور کمزور بنی رہیں۔ پھر چونکہ ایک قوم کے قوی ہونے کے صرف یہ معنے ہیں کہ اسکے پاس ذخیرۂ حرب بکثرت موجود ہے اور وہ جدید ترین آلاتِ جنگ کے ذریعہ سے بہت زیادہ ہلاکت پھیلانے کی اہل ہے اس لئے ظاہر ہے کہ ایک کمزور قوم کے سامنے بھی قوت کا یہی مفہوم قرار پاتا ہے اور وہ بھی یہی کوشش کرتی ہے کہ ہلاکت کا جواب ہلاکت سے دینے کی بہترین صلاحیت پیدا کرسکے۔ پھر اگر ایک قوم کو دوسری قوم کے ساتھ واقعی ہمدردی ہوتی اور باہمدگر اعتماد پایا جاتا تو اس کا بھی امکان تھا کہ کمزور حکومتیں ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو غیر مسلح کر دیتیں، لیکن چونکہ وہ نیتوں سے آگاہ ہیں اس لئے جانتی ہیں کہ عسکری قوت کے کم کر دینے کے کیا معنی ہیں اور یہ صدائے امن وسکون تمدنِ جدید کا کتنا بڑا مکر و فریب ہے۔

الغرض اس وقت یوروپ جس اضطراب میں مبتلا ہے اس کا دور ہونا کسی طرح ممکن نہیں اور تاوقتیکہ تمام ممالک فنا ہوکر از سرِ نو کسی ایک قوم کی حکومت دنیا میں قایم نہ ہو، یہ خلفشار کسی طرح دور ہو ہی نہیں سکتا۔

اسی وقت حالت یہ ہے کہ ایک تاجر کی تجارت، ایک صناع کی صنعت، ایک سائنس داں کی اختراع، الغرض ہر ہر متنفس کی ذاتی کوشش صرف اس تمنا کے حصول کے لئے ہے کہ صرف وہ زندہ رہے اور باقی سب ہلاک ہو جائیں۔ چنانچہ اس وقت یوروپ کی حالت ایسی ہے جیسے کسی جگہ بہت سے درندے جمع ہوں اور ہر وقت

ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے کی گھات میں لگے ہوں۔

گزشتہ جنگ عظیم سے دنیا کو اور جو نقصانات بھی پہونچے ہوں لیکن سب سے زیادہ نقصان اس کو یہ پہونچا کہ اُسے نہ صرف اپنے درندہ ہونے کا علم ہوگیا بلکہ یہ بھی کہ وہ جہاں تک چاہے اپنی درندگی کو وسیع کر سکتا ہے چنانچہ مستقبل کی جنگ کے لئے جو طیاریاں ہو رہی ہیں وہ اس کا بین ثبوت ہیں۔

چونکہ یہ متحقق ہوچکا ہے کہ اب جو لڑائی ہوگی وہ صرف سائنس کی لڑائی ہوگی اور بجائے زمین کے فضا میں اس کا محاذ قایم ہوگا اس لئے سب سے زیادہ توجہ ہوائی قوت اور زہریلی گیسوں کی طرف صرف کیجا رہی ہے۔ ہوائی قوت سے صرف طیاروں کی تعداد مراد نہیں بلکہ یہ بھی کہ اپنی تکمیل کے لحاظ سے وہ کم سے کم وقت میں کتنے بم گرا سکتے ہیں، کتنے ٹن زہریلی گیس پھیلانے کی اہلیت ان میں موجود ہے، اور کتنے جراثیم مہلک بیماریوں کے وہ انسانی خون میں پہونچا سکتے ہیں چنانچہ یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس باب میں مغرب کے انسان نے کتنی ترقی حاصل کر لی ہے۔

اسوقت تک وہاں متعدد قسم کی زہریلی گیسیں طیار ہو چکی ہیں لیکن سب سے زیادہ ناز جس گیس پر کیا جاتا ہے وہ ایک ایسی بے رنگ و بو ہوائی گیس ہے جس کی قوت نفوذ کا یہ عالم ہے کہ بند تہ خانوں اور مقفل صندوقوں کے اندر بھی پہونچ سکتی ہے اور سمیت کی یہ کیفیت ہے کہ ایک سکنڈ کے اندر شہر کے شہر کو ہلاک کر سکتی ہے۔ اسی کے ساتھ ایک اور عجیب و غریب خصوصیت اس کی یہ بھی ہے کہ زمین کے اندر جذب ہو جاتی ہے اور طلوع آفتاب کے ساتھ پھر زمین کے اندر سے نکل کر ہلاکت پھیلاتی ہے، یعنی اگر شام کے وقت کسی شہر میں یہ گیس پھیلائی گئی ہے تو صبح کو پھر اس میں تبخیر پیدا ہوگی اور رہے سہے انسانوں کو ہلاک کر دے گی۔

دوسری عجیب و غریب چیز پردار تارپیڈو ہے جس کی متعدد قسمیں ہیں۔ لیکن اس کی مہلک ترین قسم وہ ہے جو امریکہ کے ایک سائنسداں جان والٹر کرسٹی نے اختراع کی ہے۔ اس کی شکل ایک بڑے ہوائی جہاز کی سی ہے جسکے چار بازو ہیں اور ایک دُم، یہ ایک مخروطی شکل کی چیز ہے جس کے اندر پانچ ہزار پونڈ زہریلی گیس یا آتشگیر مادہ آسکتا ہے۔ اس پردار تارپیڈو کو ایک بڑا ہوائی جہاز لیکر اُڑتا ہے جو اسی غرض کے لئے طیار کیا گیا ہے اور اپنے ہدف سے دس میل کے فاصلہ پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد یہ پردار تارپیڈو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑکر ہدف پر پہونچتا ہے اور پھٹ کر گیس یا آتشگیر مادہ پھیلا دیتا ہے۔ اگر یہ مادہ آتشگیر ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ کئی ایکڑ زمین میں اس نے آگ لگا دی اور اگر گیس ہے تو یوں سمجھئے کہ بڑے سے بڑے شہر کی آبادی آن کی آن میں ختم ہوگئی۔ آپ خیال کرتے ہوں گے کہ اس سے زیادہ موثر طریقہ ہلاکت پھیلانے کا اور کیا ہو سکتا ہے، لیکن نہیں اس سے زیادہ عجیب ایک چیز اور ہے جسے اڑنے والا ٹینک کہتے ہیں۔

آپ نے گزشتہ جنگ کے ذکر میں ٹینک کا حال پڑھا ہوگا کہ وہ ایک قسم کا آہن پوش موٹر ہے جس کے لئے بلندی و پستی یکساں ہے اور وہ ہر جگہ آسانی سے روندتا کچلتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے گویا وہ ایک روئین تن عفریت ہے جس کا مقابلہ کوئی قوت نہیں کر سکتی۔ اب انھوں نے پردار ٹینک طیار کئے ہیں جو زمین پر بھی چلیں گے اور ہوا میں بھی اڑیں گے۔ یہ ٹینک چاروں طرف سے بند ہوگا اور اس پر سوائے کوہ شکن توپوں کے اور کسی توپ کا کوئی گولہ کارگر نہ ہوگا۔ اسکے اندر پانچ خزانے ہوں گے جن میں پانچ ٹن زہریلی گیس یا آتشگیر مادہ بھرا جا سکتا ہے، اس کے سامنے ایک مشین گن ہوگی جو سامنے سے آنے والے تارپیڈو اور جہاز کو پاش پاش کر دیگی اس کے چار بازو ہوں گے اور ہر بازو پر ایک بڑا ہوائی جہاز ہوگا اور نیچے متعدد ہوائی تارپیڈو لٹکے ہوں گے جن میں سے ہر ایک آدمی کے قد کے برابر ہوگا۔ اس کی رفتار سو میل فی گھنٹہ ہوگی۔

اب خیال کیجئے کہ جسوقت یہ پردار ٹینک فضا میں بلند ہو کر اپنی زہریلی گیس کے خزانے کھولدے گا اور اس کے چاروں ہوائی جہاز بلند ہو کر ایک طرف سے بم برسائیں گے اور دوسری طرف سے ہوائی تارپیڈو سر ہوں گے تو کیا عالم ہوگا، خیال کیا جاتا ہے کہ ایک پردار ٹینک، لندن ایسے بڑے شہر کی آبادی کو چند سکنڈ میں ہلاک کر دینے کے لئے کافی ہے۔

اس آگ اور زہر برسانے والے عفریت آہن پوش کا مقابلہ اگر توپوں سے کیا بھی جائے تو کوئی فایدہ نہیں کیونکہ اگر کسی گولے نے اسے پاش پاش کر دیا تو بھی اس کے اندر بھری ہوئی گیس ضرور پھیلے گی اور اس کو جو نقصان پہونچانا ہے پہونچا کر رہے گی۔

اس میں شک نہیں کہ زہریلی گیس سے بچنے کے لئے نقاب طیار کئے گئے ہیں، لیکن اول تو یہ ممکن نہیں کہ جنگ کے وقت دنیا کا ہر فرد ہر وقت منہ پر توبڑا چڑھائے رہے اور اگر اس کا امکان ہو تو بھی ہلاکت سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے کیونکہ زہریلی گیس کے ساتھ جو بم وغیرہ گرائے جائیں گے وہ تمام عمارتوں کو منہدم کر دیں گے، پٹرول کے خزانوں کو مشتعل کر دیں گے، میگزینوں میں آگ لگا کر شہر کا تختہ کا تختہ اُلٹ دیں گے۔

الغرض مستقبل کی جنگ عجیب و غریب چیز ہوگی اور اگر آبادی کا کوئی حصہ ہلاکت سے بچ رہا تو اس کو پھر از سر نو وہی عہد وحشت کی زندگی بسر کرنا پڑے گی جب انسان ننگا پھرتا تھا اور غاروں میں رہتا تھا۔

انسان کا سب سے زیادہ مہلک دشمن

۳۹۸۵۹۶۹۳۸۷۷۵۵۱۰۰

کیا آپ آسانی سے بتا سکتے ہیں کہ عنوان میں جو اعداد درج ہیں وہ ریاضی میں کتنی بڑی تعداد کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور کیا یہ امر حیرتناک نہیں کہ اعداد و شمار کے لحاظ سے ہم کسی چیز کی مقدار یا تعداد کو ان ہندسوں سے ظاہر کریں۔ ممکن ہے آپ کو اعتبار نہ آئے، لیکن ہم آپ کو از روے حساب باور کرانا چاہتے ہیں کہ صرف ایک مکھی گرمی کے پانچ مہینوں میں (مئی سے ستمبر تک) اپنی ذریات کو بڑھا کر اس تعداد تک پہونچا دیتی ہے۔

اب ساتھ ہی ساتھ اس پر بھی غور کیجئے کہ ہر مکھی اپنے پروں اور ٹانگوں میں کم از کم ۶۰ لاکھ جراثیم مہلک بیماری کے لیکر اڑتی ہے اور پھر عنوان کے اعداد کو ۶۰ لاکھ سے ضرب دیکر اُن ہلاکتوں کا اندازہ کیجئے جو صرف ایک مکھی کے ذریعہ سے دنیا میں پھیل سکتی ہیں، چہ جائیکہ دنیا کی بے شمار مکھیاں کہ اگر آپ ان کے پھیلائے ہوئے جراثیم کا انداز کرنا چاہیں تو ریاضی کیا انسان کا خیال بھی وہاں تک نہیں پہونچ سکتا۔

ماہرین حفظان صحت نے اندازہ لگایا ہے کہ ایک ہفتہ کے اندر جتنے انسان مکھی کے پھیلائے ہوئے مہلک جراثیم سے فنا ہوتے ہیں ان کی تعداد ان سے زیادہ ہے جو چار سال کی مدت میں بہ سلسلۂ جنگ عظیم ہلاک ہوئے اور گرم ممالک کی جہاں اور بہت سی بدنصیبیاں ہیں ایک یہ بھی ہے کہ انسان کا یہ پروار دشمن زیادہ تر یہیں پایا جاتا ہے۔ اس کے دو سبب ہیں۔ ایک یہ کہ مکھی کے نشو و نما کیلئے گرمی ہی زیادہ موزوں ہے اور دوسرے یہ کہ یہاں کے عوام حفظان صحت کے اُصول سے ناواقف ہیں صفائی کا خیال نہیں رکھتے اور یہ بلا گندگی ہی سے نشو و نما پاتی ہے۔ یہاں کے لوگوں میں مکھیوں کی طرف سے جو بے پروائی پائی جاتی ہے اس میں بھی ایک حد تک مذہبی جنون شامل ہے، کیونکہ ان کا اعتقاد ہے کہ خدا نے کوئی چیز بیکار پیدا نہیں کی ہے اور جو پیدا ہوئی ہے اس کا رزق بھی مقرر ہے، چنانچہ ایکبار میں نے ایک گوشت بیچنے والے سے کہا کہ "گوشت پر مکھیاں نہ بیٹھنے دو اس سے بیماریاں پھیلتی ہیں" وہ یہ سنکر ہنسا اور بولا کہ "مکھیاں کھیتی تو کرتی نہیں کہ غلہ جمع کر کے اطمینان

سے کھائیں، خدا نے جو اس کی غذا بنائی ہے وہ اُسے ملنی چاہئے، ہم آپ کیوں اس میں دخل دیں" یہ ہے
ہ تاریک ذہنیت جو مذہب کی پیدا کی ہوئی ہے اور جس نے جہلا کے ذہن میں عام طور پر یہ خیال مرتسم کر دیا ہے
جو ہونا ہے وہ ضرور ہوگا۔ جس کو جس وقت مرنا ہے ضرور مریگا اس لئے احتیاط و علاج وغیرہ سب بیکار ہیں۔

گزشتہ سفر کے دوران میں جب میرا قیام کوہاٹ میں تھا ایک شام پیر کمال شاہ صاحب جیلانی کے
کان پر خاصے پڑھے لکھے آدمیوں کی صحبت برپا تھی اور موت و زندگی پر گفتگو ہو رہی تھی۔ میری حیرت کی انتہا نہ
ہی جب ایک نہایت ذہیوش، قابل و تجربہ کار بزرگ نے فرمایا کہ " انسان مقررہ عمر لیکر آیا ہے اور اس میں کمی
بیشی کسی تدبیر سے ممکن نہیں " (میں اس سے قبل یہ تقریر کر چکا تھا کہ عمر انسانی کی تعیین اور موت کے مقررہ وقت
کے متعلق یہ اعتقاد کہ وہ پہلے سے لوحِ محفوظ میں مرتسم ہے اور لمحہ و ثانیہ کے حساب سے اس کا فیصلہ ہو چکا ہے
رست نہیں۔ دنیا میں ہر واقعہ کسی نہ کسی سبب سے متعلق ہوتا ہے اور جب وہ سبب پیدا ہوتا ہے تو نتیجہ ظاہر
ہو جاتا ہے اس لئے جو اسباب ہلاکتِ انسانی کے ہیں اگر ان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا جائے تو یقیناً عمر پر اس کا
اثر پڑے گا) ۔ میں نے ان بزرگ کے جواب میں عرض کیا کہ " ممکن ہے ایسا ہی ہو، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ
دا لعبض ممالک میں عمروں کے حساب بھی بدلتا رہتا ہے، یعنی ایک وقت خاص تک تو اس نے عمروں کی تعیین کچھ
) اور اس کے بعد کچھ اور ۔ انھوں نے کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں نے عرض کیا کہ " آپ کو معلوم ہونا چاہئے
اب سے ۵۰ سال قبل مغربی ممالک میں انسانی عمر کا اوسط تقریباً وہی تھا جو ہندوستان میں پایا جاتا ہے،
نی ۳۵-۴۰ سے متجاوز نہ تھا، لیکن اب وہاں یہ اوسط ۶۰ سال تک پہونچ گیا ہے اور بچوں میں جتنی موتیں پہلے
دتی تھیں اب اس کی چوتھائی رہگئی ہیں"۔

ظاہر ہے کہ وہ اس کا کوئی معقول جواب تو دے نہ سکتے تھے لیکن میں جانتا ہوں کہ ان کا اعتقاد بدستور اپنی
یہ قایم رہا اور اس میں کسی قسم کا ضعف پیدا نہ ہو سکا۔

مقصود اس واقعہ سے یہ ظاہر کرنا تھا کہ جب ہمارے ملک کے پڑھے لکھے ذہیوش انسانوں کی ذہنیت
ہب کی غلط تعلیم کی وجہ سے اتنی خراب ہو چکی ہے تو عوام و جہلا کا کیا ذکر ہے وہ جتنی ہلاکت و گمراہی میں مبتلا
ں کم ہے۔

بہر حال وہ حضرات جو اس اعتقاد کو ذہنی تاریکی سمجھتے ہیں انھیں اپنی زیست و حیات کا مسئلہ صرف
رائیل کی مرضی پر نہ چھوڑ دینا چاہئے اور حفظانِ صحت کا خاص خیال رکھنا چاہئے جس میں مکھی اور مکھی کے
پھیلائے ہوئے جراثیم خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہیں۔

مکھی جتنی ہلاکت دنیا میں پھیلاتی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک بار کسی کھانے پینے کی چیز

پر بیٹھ کر لاکھوں مہلک جراثیم اپنے بعد چھوڑ جاتی ہے جن میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو انسانی خون کے ذرات ہلاک نہیں کر سکتے اور آخر کار موت کا باعث ہو جاتے ہیں۔

مکھی کی پرواز ایک گھنٹے میں پانچ میل ہے اور یہ اس پانچ میل کی پرواز میں سیکڑوں گھروں اور ہزاروں نابدانوں کا جائزہ لے لیتی ہے۔ یعنی جو مکھی ہماری چائے کی پیالی میں پڑ گئی ہے، وہ یقیناً ہزاروں ناپاک اور گندی جگہوں سے آئی ہے اور سب جگہ کے جراثیم چائے کے اندر چھوڑ کر فنا ہوئی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکھی بالکل بے ضرر چیز ہے، بلکہ بعض کا تو یہ خیال ہے کہ وہ گھروں کی گندگی دور کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے لیکن یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے۔ کیونکہ جو اعداد و شمار فراہم کئے گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ لاکھوں انسان صرف مکھی کے پھیلائے ہوئے زہر سے ہلاک ہوتے ہیں چنانچہ امریکہ میں جو ہندوستان سے بہت زیادہ سرد اور صاف ستھرا ملک ہے، پچاس ہزار بچے ہر سال مکھیوں کی وجہ سے ہلاک ہوتے ہیں۔

توراۃ میں بھی ایک جگہ ذکر ہے کہ جب خدا نے فرعون و اہل مصر پر عذاب نازل کرنا چاہا تو مکھیوں کی بلا ان پر مسلط کر دی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مکھیوں کو ذریعہ ہلاکت قرار دینا بہت قدیم بات ہے اور عہد عتیق میں بھی لوگوں نے اس کو محسوس کر لیا تھا۔

اطباء کا خیال ہے کہ مکھیوں کی غیر معمولی پیداوار کے لحاظ سے ان کے اسباب ہلاکت چونکہ بہت کم ہیں اس لئے بظاہر کوئی امید نہیں کہ یہ عذاب دنیا سے دور ہو سکے۔ ایسے جانور جن کی غذا مکھی ہے بہت کم ہیں۔ سوائے مینڈک، گرگٹ، بھڑ، مکڑی اور چھپکلی کے کوئی اور جانور ان کا شکار نہیں کرتا لیکن مکھیوں کا نشو و نما اتنا زبردست ہے کہ یہ ذرائع ان کے ہلاک کرنے کے لئے بالکل ناکافی ہیں۔ اس لئے اس سے بچنے کی تدبیر صرف یہی ہے کہ گھر میں کسی جگہ گندگی نہ پھیلنے پائے اور گرمیوں کے زمانہ میں کم از کم دو تین بار روزانہ جھاڑو سے صاف کر دیا جائے۔ باورچی خانہ یا کھانے پینے کی جگہ خاص طور پر صاف رہنا چاہیے، اور اسی طرح نالیاں بھی، سو اس کے لئے نہ روپیہ کی ضرورت ہے نہ کسی خاص سلیقہ کی بلکہ ایک جھاڑو اور دو جھاڑن درکار ہیں۔

جاڑوں میں مکھیاں غائب ہو جاتی ہیں لیکن وہ فنا نہیں ہوتیں بلکہ گرم ممالک میں چلی جاتی ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ صفائی وغیرہ کا خیال اخیر جاڑوں ہی سے رکھا جائے تاکہ گرمی کی ابتدا میں کوئی گندگی انکو گھروں کے اندر ایسی نہ ملے جس پر وہ آ کر بیٹھ سکیں۔ یہ احتیاط بھی ضروری ہے کہ بازار سے جو چیز آئے اسے اچھی طرح دھو کر استعمال کیا جائے اور کھانا ایسی جگہ بیٹھ کر کھایا جائے جہاں مکھیاں نہ آ سکیں۔ لیکن اگر وہ چیز پر بیٹھ جائیں تو مناسب یہی ہے کہ اس کو استعمال نہ کیا جائے۔

دو دو باتیں

اس ماہ سے یہ باب صرف ان حضرات کے جواب کے لئے اضافہ کیا جاتا ہے جو بعض غیر اہم استفسار کر بیٹھتے ہیں اور نیز اُن مقالہ نگاروں کے لئے جو جواب یا واپسی مضمون کے لئے ٹکٹ روانہ نہیں کرتے اور جنکے مقالے ضائع کر دئے جاتے ہیں۔

(جناب طارق - رام پور)

مسلسل وہ نیاز حُسن ساغر محبت کو پسینہ آ رہا ہے

یہ شعر آپ کو پسند ہے لیکن "محبت کو پسینہ آنے" کی اصطلاح آپ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ سوال یہ ہے کہ آپ نے اس کو محاورہ یا اصطلاح کیوں قرار دیا۔ محبت کا لفظ "محبت کرنے والے" کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ الغرض جو شبہ آپ کو پیدا ہوا ہے وہ تو درست نہیں، لیکن اس شعر میں اور نقائص ضرور موجود ہیں۔ آپ نے ان کا ذکر نہیں کیا تو میں کیوں کروں۔

(جناب لال حسین صاحب - بھنگر پل راولپنڈی)

علامہ مشرقی کی کتاب "تذکرہ" اس عہد کی بہترین تصانیف میں سے ہے، لیکن بیلچہ تحریک کا میں نے کافی مطالعہ نہیں کیا اس لئے کوئی رائے نہیں دے سکتا، البتہ اجمالاً اسقدر ضرور عرض کروں گا کہ اسوقت قوم کو بیدار کرنے کے لئے جن ذرائع کی ضرورت ہے، ان میں ہم اس تحریک کو شامل نہیں کر سکتے۔

(جناب وقار عظیم صاحب - الہ آباد)

آپ کا فسانہ "آخری تصور" برا نہیں ہے لیکن اتنا اچھا بھی نہیں ہے کہ اس کے شایع کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔

(جناب راشید اگورکھپوری)

غزلوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان کے شایع نہ ہو سکنے پر اظہار تاسف۔

(جناب لائبریرین صاحب صولت پبلک لائبریری رامپور)

سلیم صاحب کا مضمون اصولاً الناظر ہی میں شایع ہونا چاہیئے، کیونکہ سید اختر علی صاحب تلہری کا مضمون جس سے اس ایرادی مقالہ کا تعلق ہے، الناظر میں شایع ہوا تھا۔

(جناب علی اختر صاحب - سورام)

مولوی سید محمود علی صاحب کا مضمون پہونچگیا ہے اور میں اسے دیکھ بھی چکا ہوں لیکن اسکے جلد شایع ہونیکی کوئی صورت نہیں، کیونکہ جنوری تک کے پرچے مرتب ہو چکے ہیں۔ اور اس کے بعد بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ کب اسکی اشاعت ہو۔

(جناب .... برہام پور بنگال)

آپ کا مقالہ یودھن ملگیا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کی اشاعت نگار میں نہیں ہو سکتی۔

(جناب قاضی عبدالرؤف صاحب - حیدرآباد دکن)

آپ نے (بقول خود) جس "علم و فن سے بیگانہ" شخص کا حال مجھ سے دریافت کیا ہے اس سے میں صرف اسقدر واقف ہوں کہ ان کا اصلی وطن لکھنؤ نہیں ہے بلکہ عظیم آباد ہے۔ سنتا ہوں کہ وہاں کے شرفاء میں ان کا شمار ہوتا ہے لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ کسی شخص کے علمی و ادبی قابلیت پر گفتگو کرنے کے لئے اس کے حسب و نسب پر غور کرنے کی ضرورت آپ کو کیوں پیش آئی۔

(جناب عیشی برنی - بلندشہر)

آپ کی غزل - معمور ہے ــــ رنجور ہے ــــ نگار میں شایع نہیں ہو سکتی۔

(جناب خواجہ محمد اسحاق صاحب بی اے - تانگر جو سنگھ)

آپ کا ادبی مقالہ "گل" جذبات کے لحاظ سے برا نہیں اور اس میں یقیناً کافی "ادبیت" پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ ملگور والا انداز تحریر اب مقبول نہیں رہا اس لئے اشاعت سے معذور رہوں۔

(جناب عبدالقدیر صاحب - میرٹھ)

آپ کی مرسلہ نظم "شبنم" سید یحییٰ حسن صاحب کی یہ نظم ہے ان سے کہدیجئے کہ نظم اچھی ہے لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ہر اچھی چیز میرے ہی لئے مخصوص ہو۔ ہندوستان میں اور بہت سے رسالے ہیں جو نگار سے زیادہ اچھے کلام کے مستحق ہیں۔

بعض دلچسپ اعداد و شمار

فطرت نے تخلیق کائنات کے وقت ریاضی کے اصول کو پیش نظر رکھا ہو یا نہ رکھا ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ تمام عالم کون بالکل اصول ریاضی کا پابند ہے۔ اور اس دورِ علوم و فنون میں کوئی شعبۂ علم و تحقیق ایسا نہیں ہے جو ریاضی اور اس کے اعداد و شمار سے باہر ہو۔ مغرب کی زندگی نہ صرف اس لحاظ سے بالکل نپی تلی ہے کہ وہاں ہر شخص کسی نہ کسی مقررہ پروگرام پر عمل کرتا ہے، بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ وہاں کی حکومتوں کا نظام ہی اعداد و شمار پر منحصر ہے۔ یہ ذوق اہلِ مغرب میں انفرادی حیثیت سے بھی بہت کافی ترقی کر گیا ہے اور وہاں کا ہر شخص کسی نہ کسی ایسے خبط میں ضرور مبتلا ہے جس کا تعلق اعداد و شمار سے ہو۔

سلیشیا کا ایک باشندہ تھا جو ۸۰ سال کی عمر پاکر حال ہی میں مرا ہے۔ اس نے اپنے مرنے کے بعد نہ "تصویر بتاں" چھوڑی ہیں نہ "حسینوں کے خطوط"، بلکہ صرف ایک کاغذ جس میں سوائے اعداد و شمار کے کچھ نہیں ہے۔ اس امر کا اندازہ کہ اس نے اس تحریر کی ترتیب میں کس قدر حزم و احتیاط سے کام لیا خود اس کی تحریر سے ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "میں دنیا میں ۲۹۲۲۰ دن زندہ رہا۔ ۲۶ سال اور ۲۱۳ دن سونے میں گزارے ۲۱ سال اور ۹۵ دن کام میں بسر کئے۔ ۶ سال کھانا کھانے میں صرف ہوئے۔ ۲۸۸ دن داڑھی مونڈنے میں۔ ۱۶ دن تھیٹر میں اور بارہ دن سگریٹ روشن کرنے میں۔

جزئیات کی اور زیادہ تفصیل ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتا ہے کہ "چھ دن اور ۱۲ گھنٹے کالر کے بٹن چھانٹنے میں صرف کئے۔ ایک دن ۲۲ گھنٹے ہنسی میں گزارے چار دن دو گھنٹے جماہی لینے میں۔ اور ۲۰۳ دن ملاقاتیوں کے انتظار میں"

اس نے یہ کہیں ظاہر نہیں کیا کہ ان اعداد و شمار کے حاصل کرنے میں اسنے کتنا وقت صرف کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو دن اس نے انتظار میں گزارے ہیں انھیں میں بیٹھے بیٹھے یہ حساب لگاتا ہوگا۔

اسی سلسلہ میں غالباً یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یورپ کے اعداد و شمار نکالنے والوں نے ایک ستر سال تک زندہ رہنے والے انسان کی زندگی کو کس طرح تقسیم کیا ہے۔ اُن کے تخمینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ستر سال کی عمر پانے والا انسان ۲۳ سال سونے میں گزار دیتا ہے، ۱۳ سال باتیں کرنے میں، ۶ سال

کھانا کھانے میں، تین سال مطالعہ میں، ½ سال نہانے میں، ۲۰ سال آرام میں اور ۳½ سال دیگر مختلف مشاغل میں لگے ہاتھوں جانوروں کے اعداد و شمار بھی سن لیجئے :-

دنیا میں ۲ لاکھ ۸۰ ہزار قسمیں حشرات الارض میں، جن میں ایک لاکھ بیس ہزار قسمیں کیڑے مکوڑے کی ہیں ۵۰ ہزار تیتریوں کی اور ۴۰ ہزار مکھیوں کی۔

مچھلیاں ۱۲ ہزار قسموں کی پائی جاتی ہیں اور چڑیاں بھی اتنی ہی قسموں کی۔ دس ہزار قسمیں غیر استخوانی حیوانات (مثلاً گھونگھا و سیپ وغیرہ) کی ہیں، آٹھ ہزار چھلکے دار جانوروں کی (جیسے کیکڑا وغیرہ) اور ۲۵۰۰ رینگنے والے حیوانات کی۔

چوہے چونکہ بہت زیادہ تکلیف رساں ہیں اس لئے ان کی پوری تعداد معلوم کرنے کی کوشش کی گئی اور کہا جاتا ہے کہ دنیا میں ان کا شمار دس ارب سے کم نہیں ہے۔

مکھیوں کی پیداوار کا حال آپ سنیں گے تو غالباً آپ کا سر چکرانے لگے گا۔ ایک سبز مکھی اگر اسے کافی غذا میسر آئے، ایک فصل میں اتنی مکھیاں پیدا کر سکتی ہے کہ اگر ان کا وزن کیا جائے تو ۸۲۲۰۰۰۰۰۰ ٹن نکلے۔ انسان کی ۲ کرور آبادی میں سے اگر اوسط نکالا جائے تو فی کس زیادہ سے زیادہ ۱۲ اسٹون وزن ہوتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ دنیا کے تمام انسانوں کا وزن پندرہ کرور ٹن ہوتا ہے۔ اب اس کے مقابلہ میں صرف ایک مکھی سے پیدا کی ہوئی نسل کو دیکھئے کہ وہ تمام دنیا کی انسانی آبادی سے وزن میں پانچ گنا زیادہ ہوتی ہے اگر دنیا میں صرف مقدار ہی کوئی چیز ہوا کرتی تو مکھیاں انسان کو کیوں زندہ رہنے دیتیں۔

اب نباتاتی دنیا کو لیجئے برازیل میں بڑی بڑی گوبھیاں پیدا ہوتی ہیں۔ حال ہی میں ایک گوبھی تیرہ اسٹون وزن کی پیدا ہوئی جس کا خریدنے والا اسے پالکی میں اپنے گھر لے گیا اور بیس آدمیوں نے اسے ایک مہینے میں ختم کیا۔

اخباری دنیا کے بعض دلچسپ اعداد ملاحظہ ہوں :-

جاپان میں ۱۱۷۹ اخبار جاری ہیں۔ جن میں سے ۲۰۸ ٹوکیو سے نکلتے ہیں اور ۱۶۰ اوساکا سے۔ ایک روزانہ اخبار کی اشاعت دس لاکھ ہے، دوسرے کی گیارہ لاکھ، تیسرے کی بارہ لاکھ اور چوتھے کی پندرہ لاکھ۔

ایک اخبار کا نام اساہی شمبون ہے اسکے پاس علاوہ اور مشینوں کے ۱۹ ہوائی جہاز ہیں اور ۵۰۰ پیغامبر کبوتر۔ دو ٹیلی وژن سٹ بھی ہیں اور ایک پرائیویٹ لاسلکی ٹیلی فون جو دور دراز ممالک تک کام دیتا ہے۔

انجمن اُردو پنجاب

"منظر"　　　　　　　　　　　　　　مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۳۶ء

۲۳- لارنس روڈ- لاہور

مکرمی!

تسلیم۔ غالباً آپ کو اخبارات کے ذریعے سے معلوم ہو چکا ہوگا کہ کچھ عرصہ ہوا چند اصحاب نے جن میں علاوہ روزانہ اخبارات اور علمی و ادبی رسائل کے اڈیٹروں کے، کالجوں کے پروفیسر اور ملک کے بعض سربرآوردہ رہنما بھی شامل تھے انجمنِ اُردو پنجاب کی بنیاد رکھی۔

اِس انجمن کا مقصد موجودہ ہنگامہ خیزی کے دور میں ہر جائز ذریعے سے اُردو کا تحفظ و استحکام اور ترقی و ترویج ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہندی والے ہندی کے لئے کیا کچھ کر رہے ہیں؟ وہ ایک مقامی زبان کو جو مدت سے ملک کے ایک مخصوص حصے تک محدود رہی ہے ہر ممکن طریقے سے سارے ملک کی زبان بنانے پر مُصر ہیں بلکہ اُن کی ایک روز افزوں جماعت اُردو سے ہر جگہ اُس کی جائز و مسلم حیثیت چھیننے پر تلی ہوئی ہے۔

شاید آپ نے اخبارات و رسائل میں مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقیِ اُردو کا وہ نہایت اہم بیان پڑھا ہو جس میں انھوں نے ہندی کی آل انڈیا انجمنوں "ہندی ساہتیہ سمیلن" اور "بھارتیہ ساہتیہ پرشد" کے اپریل ۱۹۳۶ء کے سالانہ جلسوں کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ کیونکر مہاتما گاندھی جیسے انصاف پسند رہنما بھی "ہندی یا ہندوستانی" کے فارمولے کے ذریعہ سے ہندی کو بڑھانا اور اُردو کو گرانا چاہتے ہیں اور یہ کہہ کر کہ "اُردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں" اُردو کو گویا ملک بدر کر رہے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ خود مسلمانوں نے اُردو پر اپنی مُہر لگا کر اُسے محض اپنے لئے مخصوص نہیں کر لیا بلکہ ہندوؤں کا ایک ذمہ دار گروہ اُردو کو ٹھکرا کر مسلمانوں کو یہ سمجھنے پر مجبور کر رہا ہے کہ اگر وہ اُردو کی حمایت نہ کریں گے تو اُردو ملیامیٹ ہو جائیگی۔

اس کے اصلی معنی یہ ہیں کہ مذہبی سیاست کے اس زمانے میں یہ آواز بلند کی جا رہی ہے کہ ہندوؤں کے قدیمی تمدن کا تحفظ محض ہندی زبان کے ذریعہ سے ممکن ہے اس لئے اُس کا احیا، و استحکام ہندوؤں کا مذہبی

وملکی فرض ہے، اُس کا رسمِ خط خالص ہندوستان کی پیداوار ہے۔ اس کے مقابلے میں اُردو فقط مسلمانوں کی زبان اور فقط اُنھیں کی غیر ملکی تہذیب کی علم بردار ہے اور اُس کا رسم خط علاوہ ناقص ہونے کے اجنبی اور ناقابل قبول ہے۔

ان محبانِ وطن کو کون سمجھائے کہ اپنے عزیز وطن کو دو ہزار سال پیچھے کی طرف ڈھکیلنا اور گھسیٹ لیجانا نہ عقلمندی ہے نہ خدمتِ وطن اور نہ یہ ممکن العمل ہی ہے۔ مسلمان بھی اگر آج فارسی عربی کو اُردو پر ترجیح دینے لگیں تو یہ اُن کی کوتاہ اندیشی ہوگی۔ اُردو ہندو مسلمانوں کی مشترک میراث تھی اور مدت سے اُن دونوں کی مشترک زبان رہی ہے اس بدبخت جُداگانہ زندگی جداگانہ نیابت اور جداگانہ طرزِ عمل کے زمانہ میں لے دیکر اک زبان مشترک رہگئی تھی سو وطن کے فداکار اُس کے سر پر بھی اپنی تلوار کھینچے آمادۂ پیکار نظر آتے ہیں۔ حیف ہے ایسی نام نہاد "وطن پرستی" پر!

اِس حال میں ہم سب کے لئے، ہم میں سے ایک ایک فرد کے لئے لازم ہے کہ ہم اپنی محبوب ترقی یافتہ زبان کو جو قوم و ملک کی زبان ہے جس کا رسمِ خط جس کی شاعری، جس کا علمِ ادب ہمارے تمدّن اور ہماری روایات کا حامل ہے، جسے ہمارے بزرگوں نے اپنے روز و شب کی مساعی میں پسینہ بہا بہا کر فروغ دیا ہے محفوظ رکھیں، اُسے دشمنوں کے وار سے بچائیں، اُسے ترقی دے کر اقوامِ عالم کے ایوان میں وہ جگہ دیں جسکی وہ ہر طرح سے مستحق ہے اور ہو سکتی ہے۔

اور محض تحفظ کافی نہیں ترقی لازم ہے۔ اِس دور میں جو چیز آگے کو نہ بڑھے گی وہ رُک جائے گی، مرجائیگی گرا دیجائے گی! اس خوفناک مقابلہ و مجادلہ میں، اس سیاسی کشاکش میں کیا آپ اپنی زبان کی [illegible] نہ کریں گے؟ کیا آپ اُسے اُس تباہی سے نہ بچالیں گے جو ہمارے مخالفین کا مطمحِ نظر ہے؟

ہندی والوں کو دیکھئے وہ کس طرح اپنی زبان کو ترقی دے رہے ہیں! وہ اُس کی نشر و اشاعت کے لئے لاکھوں روپے جمع کر رہے ہیں، ہزاروں ہندو خواتین ہندی کے رسالوں کی خریدار بن کر عملی طور پر اُنکی سرپرستی کر رہی ہیں، لاہور میں "تیس دن میں ہندی" کا نعرہ بار بار بلند کیا جا رہا ہے، ہندی حروف تہجی کے نقائص دور کئے جا رہے ہیں، ہندی ادب میں روز بروز نئے نئے اضافے ہو رہے ہیں۔

اُردو کا درجہ ہندی سے کسی طرح کم نہیں، صرف اُسے اہلِ اُردو کی منظم حمایت اور متفقہ کوشش کی ضرورت ہے

اگر آپ کو اپنی اسلامی و ہندوستانی تہذیب سے لگاؤ ہے تو آپ اپنے گھر میں، اپنے گلی کوچے [illegible]، اپنے شہر و صوبہ میں ہر جگہ اُردو کا چرچا کیجئے۔ اپنے بچوں کو اپنے نوکروں کو اُردو پڑھوائیے۔ اپنے [illegible] اپنے گاؤں میں اُردو کی ایک انجمن قائم کیجئے، اگر قائم ہے تو اُسے زندہ و مضبوط بنائیے، اگر زندہ ہے تو اُس میں حصہ لیجئے اور اُسے زندہ تر بنائیے۔ اور یاد رکھئے کہ اسی زبان کے [illegible] سے آپ کو دورِ حاضر کی

تازہ ترین تحریکات اور علوم و فنون سے بھی آگاہ ہوتا ہے۔ وہ مُردنی جو ہمارے ادب پر چھائی ہوئی ہے اُسے زندہ دلی اور سرگرمی میں تبدیل کرتا ہے۔ یہ ایک بڑا کام ہے جس میں آپ کی علمی دلچسپی کی اشد ضرورت ہے۔

آپ کی زبان کی اہمیت آپ کے لئے کیا ہے؟ کیا یہ ایک معمولی شاعروں اور مصنفوں اور اخبار رسالے والوں کی چیز ہے جو آپ کے پاس بکری کے لئے آتی ہے؟ للٰہ اسے محض اس تجارتی نقطۂ نظر سے نہ دیکھئے نہیں یہ وہ چیز ہے جس کے ذریعہ سے آپ کے دل کی حالت آپ کے عزیزوں دوستوں کو اور دنیا بھر کو معلوم ہو سکتی ہے جس سے آپ کی قدیمی تہذیب اور دُنیا کے جدید ترین تمدن کا عکس آپ کو نظر آسکتا ہے۔

اگر کل آپ کی یہ عزیز زبان برباد ہوجائے تو آپ کا سارا ماحول بدل جائے۔ آپ ایسا محسوس کریں گویا فضا میں ایک آندھی آگئی جس سے آپ کا دم گھٹنے لگا۔ یا آپ اُٹھا کر کہیں سے کہیں پھینک دئے گئے ہیں۔

سو غافل نہ رہیئے اور آنے والے بلکہ موجودہ خطرے کا ابھی سے، جلد سے جلد سدِّ باب کیجئے۔ اپنی زبان کی حفاظت کیجئے، اُسے ترقی دیجئے، اُس کی کمیوں کو پورا کیجئے، اُس کی خوبیوں کو اور چمکائیے۔

یہی وہ زبان ہے جس میں سرسید اور شبلی اور حالی اور آزاد اور سرشار اور غالب اور اقبال نے اپنے خیالات کے موتی بکھیرے، یہی وہ زبان ہے جس میں آپ کے سیکڑوں نوجوانوں کی زندگیاں اپنے اظہار کا ذریعہ ڈھونڈ رہی ہیں!

آج اس عظیم الشان زبان کے تحفظ و استحکام اور ترقی و ترویج کی اشد ضرورت ہے، اس کے لئے ملک کے گوشے گوشے میں منظم جماعتوں کا قیام ہونا چاہئے۔ ان جماعتوں کا کام بیسیوں تنخواہ دار اور سینکڑوں رضا کار کارکنوں کے ذریعے سے ہوگا اور اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے:۔

ایک روپے کی جتنا بھی جمع ہو سکے!

اور دوسرے محنت و توجہ کی جتنی بھی کی جا سکے!

اور یاد رکھئے کہ اُردو کی تعلیم سے صرف اُردو کی ترقی نہ ہوگی بلکہ اس سے آپ کی قوم کے پیر و جوان اور مرد و عورت سب ترقی کی راہ پر لگ جائیں گے اور وہ دماغی و روحانی کمال حاصل کر سکیں گے جس سے زندگی سچی اور تندرست زندگی بنتی ہے۔

ان اغراض کے پورا کرنے کے لئے لاہور میں انجمن اُردو پنجاب قائم کی گئی ہے۔ اس کی مدد یقیناً آپ کا فرض ہے۔

آپ کیسے اس کی مدد کر سکتے ہیں؟:۔

ا۔ اُردو کی نشر و اشاعت میں عملی طور پر حصہ لیجئے یعنی اپنے شہر میں، اپنے حلقے میں، اپنے گھر میں،

اُردو کو فروغ دیجئے۔

۲۔ اس انجمن کے رُکن پہلے خود بنیئے پھر اور بیسیوں سیکڑوں کو رُکن بنائیے۔ انجمن کا سالانہ چندہ صرف ایک روپیہ ہے۔ آپ یقیناً یہ قلیل رقم دے سکتے ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ اس سے بہت زیادہ رقم دے سکتے ہیں، پانچ، دس، بیس، سو دو سو روپے جو کچھ جتنا بھی ہو سکے دیجئے، اپنے دوستوں عزیزوں کو، اپنے بچوں بچیوں کو اس انجمن کا رُکن بنائیے اور اپنی قومی ہمدردی و خودداری کا عملی ثبوت دیجئے ——— کب؟ آج ہی!

نیازمند

بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لار مدیر "ہمایوں"

سکریٹری انجمن اُردو پنجاب — ۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

(نگار) یہ گشتی مراسلہ ہے میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے آکسن کا جو انجمن اُردو پنجاب کے سکرٹری ہونے کی حیثیت سے، انھوں نے تمام جراید و رسایل میں اشاعت کے لئے روانہ کیا ہے۔

ممکن ہے دوسرے صوبوں کے رہنے والے صرف اس خیال سے کہ اس انجمن کا تعلق پنجاب سے ہے اسے قابل توجہ نہ سمجھیں، لیکن اگر انھوں نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا (جس کا مجھے اندیشہ ہے) تو میں کیا کوئی بھی اسے قرینِ عقل و انصاف نہ سمجھے گا۔ اُردو زبان کا مسئلہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ ہے، اُن کی اجتماعی تہذیب و ثقافت کا مسئلہ ہے، اس لئے اس میں نہ صوبوں کی تفریق کو حایل ہونا چاہئے، نہ وضع و لباس کے اختلاف کو۔ اسوقت اُردو زبان جس نازک دور سے گزر رہی ہے، اس کے نتیجے دو ہی ہو سکتے ہیں، یعنی یا تو مسلمانوں کی سیاسی اہمیت کے ساتھ ہمیشہ کے لئے وہ بھی ختم ہو جائے گی یا پھر اس کا ایک جدید دورِ ارتقاء شروع ہوگا جو اسے دُنیا کی بہترین زبانوں کے دوش بدوش لیجا کر قایم کر دیگا۔ جس حد تک ہماری تمناؤں کا تعلق ہے یقیناً ہم اسی آخر الذکر نتیجہ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن عمل ہمارا کیا ہے۔

ایں سخن را چہ جواب ست تو ہم میدانی

زبانِ اُردو کے خلاف ملک میں جو پروپاگنڈا اس وقت ہو رہا ہے اس کی وسعت و شدت کا اندازہ اس گشتی مراسلہ سے بخوبی ہو سکتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اگر مسلمانوں نے کوئی منظم کوشش اس کی مقاومت کے لئے نہیں کی تو اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ لیکن اسکی کوشش کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ اسکی وضاحت بھی میاں صاحب نے اپنے مراسلہ میں فرما دی ہے اور اب آپ کو اختیار ہے خواہ اس پر عمل کیجئے یا نہ کیجئے۔